جنوری 2018
دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
آزادی
ایک جنگی قیدی کی داستان
مشہور دفاعی تجزیہ نگار اکرام سہگل کی آپ بیتی
A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

آزادی
اکرام سہگل کا دشمن کی قید میں آزادی کا کٹھن اور تکلیف دہ سفر پر مبنی وطن پاکستان کی اس مشکل راہ ہے۔ ایک جنگی قیدی کی داستان۔
8 اکرام سہگل

گورگریباں
صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی پر اقوال و اعمال میں کچھ راز پنہاں ہوتے ہیں ایک شخص کی نادانی جو اس حماقت میں ملوث تھا۔
29 ڈاکٹر افشاں ملک

ایک جنگ اور
آج کل بد عنوانی اور بے ایمانی پر معاشرے کا ناسور ہے کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کرپشن کے خلاف جنگ کر رہے ہیں معاشرے کی بگڑی حالات کی کہانی۔
34 شاہد جمال

اے میری ہمرقص
وہ اب اس کی زندگی میں اپنا مقام رکھتی تھی اور اس کی اندر عجیب سی سنسنی پھیلتی جا رہی تھی۔ اور خوفناک پر ایک انوکھی کہانی۔
47 فارحہ ارشد

داغ دار لڑکیاں
ایک انوکھی ہوئی کرکٹ کے کھلاڑی کے گرد گھومتی ہوئی کہانی جس میں معاشرے کا عکس نظر آتا ہے یہ گھناؤنے واقعات کی کہانی آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرے گی۔
50 ایم۔ اے الیاس

پتی ورتا
کچھ لوگ اس قدر حقیقت پسند ہوتے ہیں کہ وہ محبت جیسے خالص جذبے کو رشتہ کا زیاں سمجھتے ہیں۔ خواہشوں کے سمندر میں ایک لڑکی کی کشتی ڈولنے کا سفر۔
99 شاہین کاظمی

سرد موسم کے گلاب
ہزاروں لاکھوں افراد ایک اچھے اور مستحکم مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجا کر اپنے وطن سے دور دیار غیر میں جاتے ہیں۔ دیار غیر میں ایک شخص کی سنسنی آمیز کہانی
101 فرحین جمال

کچھ قدم دل کے
دو انسانوں کی کہانی ایک جس نے زندگی کو بہت سلجھ کر جیا اور ایک بہت زندگی میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کی کہانی پڑھ کر آپ فیصلہ کیجیے کہ آپ کو کون سا نظریہ پسند
104 سریندر کمار مہرا

جنوری 2018ء ✿ قیمت 40 روپے ✿ جلد 47 ✿ شمارہ 09

میں طاہرہ
اسلام سے قبل لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے لیکن آج غربت بھوک اور افلاس سے مجبور مائیں اپنی بیٹیوں کو بیچنے پر مجبور ہیں۔ خرید اور انسانوں کا بیوپار کرنے والے سوداگروں کا احوال
136 ثمینہ سعید

انوکھی بساط
[illegible]
140 سلمان راحت

درد دل کہاں ٹھہرے
اعتماد کے رشتے جب دھوکے اور فریب سے منسلک ہو جاتے ہیں تو انسان ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اپنی آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ ایک غیرت مند کا قصہ دل گداز
167 شیخ آصف محمود

اصلی مجرم
قتل کی ایک واردات۔ حالات و واقعات ایسی مجرم ظاہر کر رہے ہیں۔ قانونی باریکیوں اور نکتہ شناسی میں یکتا ایک تجربہ کار وکیل کا افسانہ نہایت
176 ایم۔ اے۔ راحت

اب بھلا دو مجھے
انتظار کی لمبائی جدائی میں چلتی چلتی اس کے پاؤں جلنے لگے۔ ایک معصوم دوشیزہ کا انتقام عورت، محبت کا کچھ کالا کالا اس کے اندر لوٹ گئی انتقام کی آگ میں جلتی ایک شخص کی کہانی
190 محمد حفیظ

میرا گھر
عورت تا عمر ایک گھر کی محتاج رہتی ہے۔ کبھی باپ کی تو کبھی بھائی کی۔ عورت کا اپنا گھر کبھی نہیں ہوتا دل دکھانے دینے والی آپ بیتی۔
204 عالیہ سہیل

قاتل کے شادیانے
حسد ایک بری صفت ہے۔ حاسد شخص ہمیشہ دوسروں کی خوشی اور آرام و سکون کو دیکھ کر رنج اور دکھ میں مبتلا رہتا ہے۔ حسد و نفرت کی آگ میں مبتلا ایک لڑکی کا ماجرا
220 جاوید راہی

کرنیں

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت 37۔ اردو بازار کراچی

آزادی

ایک جنگی قیدی کی داستان

ایک جنگی قیدی کی داستان اپریل 1971ء سے اگست 1971ء تک

دفاعی تجزیہ نگار اکرام سہگل کے قلم سے ایک سچی داستان

قارئین کے لیے ایک نیا سلسلہ

اکرام سہگل

اکرام سہگل کے ساتھ 100 سے زیادہ فوجی افسران کو انڈیا کے حوالے کردیا گیا جو 9 ماہ تک 'بنگلہ دیش کے قیام پذیری کے بعد بھی گمنام رہے۔ انڈیا نے ان جنگی قیدیوں کی اپنی تحویل میں ہونے کا کبھی اعلان نہ کیا جس کے نتیجے میں مغربی اور مشرقی پاکستان میں ان کے لواحقین ان کو مردہ تصور کرچکے تھے۔اکرام سہگل کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انڈیا کی قید سے فرار ہونے والے پہلے فوجی افسر ہیں' جنہیں انڈیا کے خلاف مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ میں بھرپور شمولیت کا موقع ملا۔

اکرام سہگل نے ہندوستان کی قید میں جو صعوبتیں برداشت کیں اور جو کچھ دیکھا' وہ ایک طلسم ہوشربا ہی نہیں بلکہ اس میں جھلکتا ہوا کرب ایک جنگی قیدی کی اس بدقسمتی کو بھی ظاہر کرتا ہے جو اسے ورثے میں ملی۔اکرام سہگل نے یہ کتاب کیوں لکھی وہ اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میری یہ داستان ایک ایسی داستان ہے جس میں وہ پورا درد موجود ہے۔جو مجھ جیسے سینکڑوں محب وطن سپاہیوں کی ان مشکلات کا اندازہ کبھی اپنے پیارے والوں کو کراسکے جو اپنے پیاروں سے دور گھروں کو ترستے ہوئے ماں باپ 'بھائی' بہن بیوی بچوں سے دور صرف ان کی آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے کبھی سرحدوں پر کھڑے ہوتے ہیں تو کبھی سیاچن کی برف میں بدترین زندگی گزارتے ہیں اور بدقسمتی سے اگر کبھی جنگی قیدی بن جائیں تو اکیلے تکلیف میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ ان کے عزیز و اقارب پل پل جیتے ہیں پل پل مرتے ہیں یہ سوچ کرکے پتا نہیں اب ان کے پیارے کے ساتھ جسمانی تشدد ہورہا ہوگا اب ان کا کھانا پینا بند ہوگیا ہوگا ان کے آنے کی آس روز بندھتی اور روز ٹوٹتی ہے اور ان تکلیفوں کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک داستان پڑی نہ جائے۔

''اگر وہ باتیں جومیں نے لکھی نہیں مگر پڑھنے والا سمجھ گیا کہ اصل قصہ کیا ہے تو آنکھیں اس اذیت کو دیکھنے کی زحمت سے بچ جاتی ہیں۔'' صرف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اور کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔

آپ بھی میری اس تحریر میں میرے ساتھ جب اس سفر پر روانہ ہوں گے جس میں مجھ جیسے سینکڑوں پاکستانی سپاہی بے یارو مددگار مسافر کی مانند دشمن کی قید میں زندگی اور موت کے درمیان تھے تو مجھے یقین ہے کہ آج کے پاکستان کی صورت حال کی 1971 کے مشرقی پاکستان سے موازنہ کریں گے تو جان جائیں گے کہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ' لسانی تعصب 'صوبائی منافرت ہی وہ عناصر تھے جو ملک کے ایک بڑے حصے کے ٹوٹنے کا سبب بنے۔پروردگار نے سانحہ 71ء کے بعد اگر مجھے زندہ رکھا تو یقیناً وہ مجھ سے اس حادثے کے اسباب کی گواہی قلم اور کاغذ کے ذریعے چاہتا تھا۔

عمران کے قارئین کے لیے بطور خاص ان کے اپنے قلم سے لکھی وہ داستان پیش کی جا رہی ہے جو انہوں نے ہندوستان کی قید میں صعوبتیں برداشت کیں اور جوکچھ دیکھا' اکرام سہگل کا دشمن کی قید سے آزادی کا کٹھن اور تکلیف دہ سفر ہر محب وطن پاکستانی کے لیے مشعل راہ ہے۔

گڈ بائے اپل

ایک انسان کے لیے خواہ وہ عام شہری ہو یا فوجی اس سے بڑی بدنصیبی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے دشمن کے ہاتھوں قیدی بن جائے۔ زخمی اور لہولہان ہونے کے باوجود کوئی یہ بات پسند نہ کرے گا کہ قید کی ذلت برداشت کرے۔ فوجی کے لیے قیدی بن جانا ایسی رسوائی ہے جس کے لیے کوئی جواز تلاش کرنا ممکن نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ میں اپنے لیے بھی کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا۔ مجھے حتی الامکان دشمن کی گرفت سے بچنا چاہیے تھا مگر میں درست اقدام کرنے میں جھجکا اور جال میں پھنس گیا۔

ہندوستان کی BSF (بارڈر سیکورٹی فورس) کے آفیسرز میس سے مجھے ہتھکڑی ڈال کر کوارٹر گارڈ لے جایا گیا اور یہ واقعہ ہے رات 8 بجے کا، تاریخ تھی 7 اپریل 1971 اور جگہ تھی اگرتلہ۔ سب کچھ آناً فاناً اس طرح ہوا کہ میں اپنی حماقت پر پچھتاوے اور افسوس کچھ نہ کرسکا۔ گوکہ جیپ میں ایک خودکار ہتھیار موجود تھا مگر اچانک رونما ہونے والے واقعات نے موقع ہی نہ دیا۔

اب جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اگر میں خودکار ہتھیار اٹھا لینے میں کامیاب ہوجاتا تو حاصل کم ہوتا البتہ یقینی طور پر میرا خاتمہ ہوجاتا اس لیے آج میری سوچ یہ ہے کہ وقتی ناکامی کو مکمل تباہی سمجھنا درست نہیں ہوتا۔ جس کوٹھری میں مجھے قید کیا گیا وہاں میرے پیروں میں بھی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ ساتھ ساتھ مجھے بستر سے ایک رسی کے ذریعہ جکڑ دیا گیا۔ کوئی بھی کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھ پر کمبل ڈال دیے گئے اور ایک سرچ لائٹ مرکوز کردی گئی۔ ایک فوجی لائٹ مشین گن لیے لوہے کی تاروں کی باڑھ کی باہر پہرہ دیتا اور اس کی بندوق کی نالی کا رخ میری جانب رہتا۔ بظاہر اس قسم کی چیزیں کسی فلم کے منظر میں نظر آتی ہیں مگر اب اس کٹہرہ میں ہی مجھے عافیت نظر آرہی تھی۔

جنگی قیدی کی حیثیت نے مجھے ایک حقیقت سے اور آگہی بخشی کہ نفرت اعصاب پر ایک منفی اثر مرتب کرتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وقت ذہن فریق مخالف کو سرزنش کرنے اور لعنت ملامت کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور صلح جوئی کے جذبہ کو ٹھیس لگتی ہے۔ بہرحال ایک مختصر جھٹکے کے بعد میرے اندر خوف واندیشہ کی کیفیت ختم ہوگئی اور میں نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اب کوئی بھی مشکل یا مصیبت میرے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ظاہر ہے جب زندگی ہی داؤ پر لگی ہو تو چھوٹی آفتوں کی انسان کو کوئی پروا نہیں ہوتی اب تو جو ہو سو ہو، دیکھا جائے گا۔ دراصل اندرونی خوف و دہشت پر قابو پانے کے جذبہ نے مجھے بہادر بنا دیا تھا اور ہتھکڑی و زنجیر کا مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ آزادی ایک ایسی نعمت ہے جس کی جستجو ہر ایک کو رہتی ہے ہاں یہ ایک علیحدہ امر ہے کہ یہ آزادی کس قیمت پر حاصل کی جائے؟

اس جرأت مندانہ سوچ نے مجھے استقامت عطا کی اور میں ظاہری بندشوں سے بے نیاز سا ہونے لگا۔ آزادی تو قدرت نے ہر انسان کی فطرت میں رکھ دی ہے اگر کوئی غلامی ہی کو اپنی تقدیر سمجھ لے تو یقیناً اس میں انسانیت مرچکی ہے۔

حالات و واقعات کے دباؤ میں مجبور و محصور انسان اپنے اطراف کا جائزہ لے کر ایسی راہیں تلاش کرتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنے لیے کوئی آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرکے نجات حاصل کرسکے۔ آزادی صرف خواہش وتمنا کی حد تک دل میں رکھنا اور عملی جدوجہد نہ کرنا ایک ایسی آرزو ہے جو کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ آزادی کے حصول کے لیے بہت سے عوامل پر نگاہ رکھنا ہوتی ہے۔ بہت سے تانے بانے ذہن میں بنے جاتے ہیں کبھی ذہن الجھتا بھی ہے۔ ناامیدی و مایوسی کا بھی غلبہ ہوسکتا ہے۔ مگر ان ہی گوناگوں کیفیات کے افق پر آزادی کی شعاعیں بھی نظر آتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ مختلف منصوبے وقتاً فوقتاً دل ودماغ میں جنم لیتے ہیں مگر سب تو قابل عمل

نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح میرا بھی اصل منصوبہ تو کلی طور پر ناکام ہوگیا مگر میں نچلا نہیں بیٹھا

وہ تمام جسمانی اذیتیں اور ذہنی کرب جو میں نے اسیری کے دوران برداشت کیے وہ اب بھی گاہ بگاہ مجھے پردہ تخیلات وتصورات پر نظر آتے ہیں مگر جو کچھ مجھ پر بیتی ہے اس کا بیان کرنے کے لیے اب بھی مناسب الفاظ کی تلاش ہے۔ وقت کے ساتھ زخم مندمل ہوجاتے ہیں۔ مگر قید کے وہ دن جب انسان آزادی کی خواہش اور تمناؤں کے سیل جذبات میں غرق ہوتا ہے، ناقابل فراموش ہوتے ہیں۔

اب بھی بعض اوقات ماضی کی یادیں میرے اندر ایک انجانا خوف و بھیانک وسوسہ پیدا کرتی ہیں۔ میں نے پہلے بھی تحریر کیا کہ میں اب بھی وہ الفاظ تلاش کرتا ہوں جو میرے حقیقی خیالات و جذبات کی ترجمانی کے لیے مناسب و برمحل ہوں اور پھر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ بعض لوگ ان تمام واقعات کو سنسنی خیزی پر محمول کریں گے اور حقیقت یہی ہے کہ جس پر گزرتی ہے وہ صحیح ادراک کرسکتا ہے۔ میں بحر ظلمات ومشکلات میں غوطے لگا کر صحیح سالم نکل آیا۔ مگر مجھے کوئی دعوا نہیں میں تو اللہ کی بے نیاز ذات پر مکمل تکیہ کرتا ہوں اور اسی نے مجھے ہر موڑ پر سہارا دیا ہے۔ اگر تقدیر کوئی شئے ہے تو اس کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کاتب نے جو مقدر میں لکھا ہے وہ بہرحال پورا ہوکر رہتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ فوجی یلغار یا جنگ کے پہلے دن کو ''یوم مرگ'' نہیں سمجھنا چاہیے بحیثیت ایک مسلمان کے ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر میدان جنگ میں جان دے دی تو شہید اور مقام جنت ہے تو پھر کم ازکم کلمہ گو سپاہی کو وہ دن ''یوم بہشت'' کی اصطلاح سے سمجھنا چاہیے۔

اپنے والد کی پچاسویں سالگرہ سے ایک دن قبل اور اپنی بھرپور جوانی کی پرشکوہ 25 ویں سالگرہ سے محض دو دن پہلے میں نے (میجر) اپل کو خیرباد کہنے کے منصوبہ پر مکمل درآمد کا حتمی ارادہ کرلیا تھا۔ یہ Ulysses کی نظم Odyssay کے مہماتی سفر کے آخری لمحات والی بات تو نہ تھی مگر بہرحال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں شدید متحیر وششدر تھا اور مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

جرأت واستقامت کا جذبہ جب بہت سچا ہو تو ڈر اور خوف کے لفظ بے معنی ہوجاتے ہیں۔ دراصل بے خوفی کے جنون میں یہ یاد نہیں رہتا کہ خود جرأت نام ہے خوف اور ڈر پر قابو پالینے کا اور یہ جذبہ اسی وقت ابھرتا ہے جب کسی بات سے ڈرنے اور خوف کھاجانے کا امکان موجود ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خوف کی کوکھ سے جنم لینے والا جذبہ جرأت نہ ہو بلکہ منچلا پن ہو جس میں ناعاقبت اندیشی شامل ہوتی ہے۔ انسان کے اندر بعض اوقات جذبات کا عجیب وغریب ملاپ ہوتا ہے جو لحظہ بہ لحظہ کبھی خوف تو کبھی امید اور پھر منچلا پن یا جرأت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ان ہی ملے جلے جذبات کے دباؤ میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک ہدف کے حصول کے لیے ہمہ تن آمادہ ہوجاتا ہے اب اس سوچ کو کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے دراصل وہ ایک مقصد کے پالینے کا غیر متزلزل ارادہ ہوتا ہے۔

میں جادو ٹونے یا اس قسم کی پراسرار باتوں پر تو بالکل یقین نہیں رکھتا البتہ کسی حد تک ماورائی طاقتوں پر ضرور یقین رکھتا ہوں آپ چاہیں تو اسے ضعیف الاعتقادی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہت پہلے کسی نے پیشن گوئی کی تھی کہ ممکن ہے کہ میں اپنی 25 ویں سالگرہ دیکھنے کے لیے دنیا ہی میں موجود نہ ہوں۔ میرے پاس کوئی دلیل یا منطق تو نہیں مگر مغربی تعلیم اور فرہنگ کے اثرات کے باوجود اب کہیں نہ کہیں تحت الشعور میں روحانی طاقتوں اور ان کے غیر معمولی تصرفات پر یقین رکھتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ کچھ لمحوں کے لیے مجھے اپنے پورے منصوبہ کے درمیان لاتعداد خامیاں اور کمزوریاں نظر آنے لگیں۔ وہ چھوٹی جزئیات جن کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا اب بڑے مہیب پہاڑ بن گئے۔ زندگی سب کو عزیز ہوتی

ہے یہ آفاقی انسانی خواہش ہے۔ زندگی سے بے زاری اور اسے بے معنی سمجھنا محض احمقانہ اور بچگانہ بات ہے۔ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ دیوانے ہوتے ہیں۔ حیات کی بقا کے لیے ہزاروں بکھیڑے پالنا پڑتے ہیں یہ ضرور ہے کہ سب کوشش کرتے ہیں کہ شرائط زندگی اور حالات میں بہتری ہو اور اسی بہتری اور اچھے آنے والے کل کے لیے آج کا کچھ نہ کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے بعض اوقات اس میں شدید خطرات بھی مول لینا پڑتے ہیں۔

اس مرحلے پر یہ کہنا ضروری نہیں کہ مجھے بھی اس دن اپنے چاروں جانب موت کے سائے منڈلاتے نظر آرہے تھے بس یہی ایک موقع تھا جب ہم کوئی اقدام کرسکتے تھے۔ گو کہ مجھے اپنے کچھ ساتھیوں کے چہرے پر پژمردگی نظر آرہی تھی۔ آزادی مل جانے اور تحفظ زندگی حاصل ہونے پر بڑی بڑی باتیں کرنا اور شجاعت اور بہادری کے دعوے کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان لمحات کو یکسر فراموش کردیا جائے۔ جب موت کے بھیانک سائے ہر طرف منڈلا رہے تھے اور ہر چاپ کی صدا ملک الموت کی آمد کی خبر دیتی تھی۔ وہ وقت تھا جب خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ وہ لمحات سچائی اور حقیقت سے بہت قریب کے لمحات ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے وطن سے پیار ہے اور اس میں کوئی مبالغہ یا منافقت نہیں اور یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ حقیقی محب وطن وہی ہے جو اپنے وطن کی جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ نظریاتی اصولوں کا بھی پاسدار اور محافظ ہو۔

جب کسی بھی شخص میں حب الوطنی کا سچا جذبہ پختہ طور پر موجود ہو تو پھر وہ مادر وطن کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔ مگر جان کی قربانی کسی مقصد اور مشن کے تحت ہونا چاہیے۔ اس مرحلے پر میں سوچنے لگا کیا واقعی مجھے جان کی بازی لگا دینا چاہیے کیا اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا؟ میرے حافظے کے کسی گوشے سے صدا آئی ''اگر تم جنگی قیدی ہو جاؤ تو تمہارا فرض ہوتا کہ تم دشمن کے چنگل سے فرار ہو جاؤ''۔ ایسے تصورات سے بھی بدن میں جھرجھری پیدا ہوتی ہے کہ انسان کسمپرسی اور گمنامی کی موت مارا جائے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی رضا اور وطن کی حفاظت کی خاطر جان دینے کا تصور البتہ خوش کن یا اطمینان بخش ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے لیے احساس فخر بھی جذبات کو تازگی بخشنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال تمام ساتھی میرے بارے میں غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھے وہ سب گمان کرتے تھے کہ میں بڑک مار رہا ہوں سوائے صادق نواز کے جو یقین رکھتا تھا کہ میں واقعی اپنے ارادے میں مصمم ہوں۔

اور آخرکار وہ مرحلہ آہی گیا جس کی تیاری مکمل کی جاچکی تھی۔ میرے تمام ساتھی اب میرے قید سے فرار کی کوشش کے بارے میں نتیجہ نکلنے کے منتظر تھے۔ یہ اتفاق تھا کہ پورے ڈرامے کا مرکزی کردار میں ہی تھا۔ رات کی تاریکی چھا جانے تک کسی اقدام کی جلدی بھی نہ تھی۔ میرے دوست تو اس بات کا انتظار کررہے تھے کہ دیکھیں تو سہی کہ میں توقعات کے مطابق اقدام کرتا ہوں یا جھاگ کی مانند بیٹھ کر بزدلی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتا ہوں۔

16 جولائی کی صبح موسم بارش کی وجہ سے خاصا پریشان کن تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا پھر اپنے پورے منصوبہ کا ٹھنڈے دل و دماغ سے تجزیہ کیا مگر صورت حال ایسی تھی کہ ہر لحظہ مجھ پر خوف و ہراس کے جذبات طاری ہوتے اور مجھے کپکپی سی محسوس ہونے لگتی اور میرے تمام خیالات منتشر ہو جاتے۔ میں مسلسل فرار کی ترکیبوں میں ہی کھویا ہوا تھا بلکہ فرار کے راستہ کے بارے میں کہ کہاں سے کیمپ سے باہر نکلا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ صادق سے مشورہ کرلوں مگر سپاہی بڑی چوکسی سے نگرانی کررہے تھے۔ لہٰذا یہی مناسب سمجھا کہ رابطہ نہ کیا جائے۔

ایک Amphibian (خشکی اور تری دونوں جگہ اترنے والا) جہاز خاصے گہرے بادلوں

اور موسلادھار بارش کی وجہ سے نچلی سطح پر پرواز کررہا تھا جو ہمارے کیمپ پر سے دو مرتبہ گزرا اور مجھے عجیب کیفیت سے دوچار کر گیا۔ کیونکہ میں خود بھی پائلٹ ہوں لہٰذا میں نے اسے اپنے لیے نیک فال جانا ویسے بھی میں ہر زاویے سے تمام رونما ہونے والی چیزوں کو اپنے حق میں اچھا شگون ہی سمجھ رہا تھا۔ 2 کا عدد خوشی کا ہے اور مجھے ہر طرف کوئی جوڑوں کی شکل میں بیٹھے نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی روز قبل ایک Aloutte-3 ہیلی کوپٹر ہمارے کیمپ کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا کلکتہ کی طرف جارہا تھا۔ جب Amphibian ہمارے کیمپ پر سے پرواز کررہا تھا تو دوسرے شیڈ سے اسکاٹ نکل کر باہر آیا تاکہ نظارہ کرسکے مگر بارش کی وجہ سے وہ دوبارہ اندر گیا اور برساتی پہن کر نکلا۔ اس نے دوسرے افسروں سے گپ شروع کردی وہ کبھی کبھی میری طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ لیتا۔ اس کا مقصد واضح تھا وہ مجھے میری تنہائی کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا چونکہ میرے اندر بھی اس کے لیے حقارت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

سہ پہر کا وقت تیزی سے گزر گیا اور میں نے ہلکا عصرانہ لیا اور پھر شیڈ کے بند کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران مجھے صادق، امجد اور ایاز سے بات کرنے کا تھوڑا سا موقع مل گیا۔ میں نے جذباتی اور گلوگیر آواز سے صادق کو الوداع کہا اور اس نے بھی سرگوشی کے انداز میں مجھے آخری ہدایات دے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر فرار کی اس کوشش میں مجھے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے تو میرے والدین کو مطلع کردے۔ اسی دوران شاہ کو بھی میرے منصوبہ کا علم ہوگیا اور اس نے بھی مجھے الوداعی انداز میں رخصت کیا۔ میں نے صادق سے اس بات کا اعتراف کیا کہ مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہے ان آخری لمحات میں، میں نے صادق کی آنکھوں میں بار بار دیکھا۔ اس نے کہا وہ میرے لیے تمام رات دعائیں کرتا رہے گا اور بولا ''دوست اللہ تمہارا محافظ و مددگار ہوگا''۔

ایک عقلمند انسان کو زندگی کی مشکلات و مسائل کو حتی الامکان ایسے لمحات میں فراموش کردینا چاہیے، جب کوئی مسرت نصیب ہو۔ رستم کو جو سرزمین فارس میں غلام تھا یقیناً معلوم ہوگا کہ بادشاہ کے سامنے سے سر سلامت لے کر گزرنا آسان کام نہ تھا مگر پھر بھی اس نے اپنی بہادری کے جھنڈے گاڑ ہی دیے۔

وہ لمحات میرے لیے بہت اذیت ناک تھے جب رات کے وقت شیڈ بند کیے گئے اور میں سمجھا کہ سارا منصوبہ خاک میں ملنے والا ہے اور ان ہی اوقات میں مجھے صحیح طور سے اندازہ ہوا کہ جب کسی کی زندگی کو خطرات لاحق ہوں تو وہ خوف اور بزدلی کی کن انتہاؤں تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لمحہ میں نے سوچا کہ کاش اسکاٹ اگر مجھے بتا سکتا کہ میرے شیڈ کے ٹین کے دروازے میں کون سے ایسے جوڑ بانٹ بولٹ ہیں جنہیں ذرا آسانی سے کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی جاسکتی ہے مگر بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ اگر اسے بھنک بھی پڑجاتی تو سارا کھیل بگڑ جاتا اور سزا تو یقینی تھی ہی۔ گو کہ موت کا ایک دن معین ہے مگر وقت گزر ہی گیا۔ اسکاٹ نے ایک موذی کی مانند شیڈ کے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں سے گرفت کمزور تو نہیں اور حکم دیا کہ ایک طرف سے اینٹیں چن دی جائیں۔ وہ بڑا باریک بین آدمی تھا اور ہر چیز کی جزئیات پر بھی اس کی نگاہ ہوتی تھی اس نے تو پنکھا بند کرنے کا بھی آرڈر دے دیا مگر خبیث انسان یہ بھول گیا کہ پنکھے اور بلب کا کرنٹ ایک ہی بجلی کے تار سے ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے مخصوص متکبرانہ اور حقارت آمیز خبیث نفس کی شرارت دکھانے کے لیے مجھے فریب دینا چاہتا ہو کہ وہ فرار کا موقع فراہم کررہا ہے۔ یہ بھی اس کی چال ہو یا شاید یہ میری غلط فہمی ہو اس لیے کہ پھر وہ ایلی اور اس کے اہل خانہ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

بالآخر وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ چلا گیا۔

ہر انسان کے لیے اظہار بےزاری انسانی فطرت

میں شامل ہے مگر کچھ لوگ اتنے گھٹیا اور پست ہوتے ہیں کہ انہیں اس لائق بھی نہیں سمجھا جاتا کہ ان سے نفرت کی جائے اور اسکاٹ بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ افراد کردار سازی بھی سیکھیں۔ اس لیے کہ انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ علم وہ بنیادی لازمہ ہے جس کے بغیر کردار سازی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر محروم طبقہ کے کم تعلیم یافتہ لوگ زیادہ مضبوط کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ دراصل وہ لوگ جو اخلاق کا درس دیتے ہیں خود ہی ان صفات کے حامل نہیں ہوتے تو اثر کیسے ہوگا۔

میں بستر پر دراز ہوگیا کہ تھوڑی دیر آرام کرلوں ویسے بھی بہت ضروری تھا کیونکہ بے آرامی و اضطراب میرے لیے اپنے منصوبہ کی راہ میں مہلک ثابت ہوسکتے تھے۔ آنے والے چند گھنٹے بہت اہم تھے۔ میرے اعصاب پر شدید دباؤ تھا اور بظاہر آرام کرنا بھی ممکن نظر نہ آرہا تھا۔ میں نے ایک شرٹ، جیکٹ، بنیان اور لنگی مع ایک چپل کے ایک تکیہ کے غلاف میں ڈال لی۔ ساتھ ساتھ گھوڑے کی نال بھی جو مجھے اتفاقی طور سے ملی تھی۔ صادق نے کہا تھا اسے قسمت کی یاوری کے شگون کے لیے ہمراہ رکھوں۔ چھت پر ہلکی ہلکی بارش کے گرنے کی آواز مسلسل آرہی تھی اور وہ ٹن کے شیڈ پر زیادہ شور کے ساتھ سنائی دے رہی تھی البتہ ان آوازوں کے علاوہ باقی پورے کیمپ] میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کیمپ کا تمام عملہ کچن یا سپلائی شیڈ میں جمع تھا۔ یہ جمعہ کی رات تھی اور ہفتہ بھر کی شراب کا کوٹہ آج ہی ان لوگوں کو فراہم کیا جاتا تھا یا کم از کم سندر سین کی گفتگو سے یہی معلوم ہوا تھا۔ نائیک کرسٹوفر کی اس وقت گارڈ کمانڈر کی ڈیوٹی تھی وہ ایک خاموش طبع کم سم سا انسان تھا۔ نائیک پکھراج کی ڈیوٹی اس کے بعد تھی۔ دونوں ہی غٹ غٹ کرکے جام اتارنے اور پھر مدہوش ہوجانے والے تھے۔ البتہ سندر سین جو گو کہ اچھے اخلاق والا تھا مگر خطرناک بھی تھا۔ اس لیے کہ وہ رات کے کسی بھی پہر راؤنڈ پر آکر شیڈ کا معائنہ کرتا تھا۔ وہ شراب بھی نہیں پیتا تھا مگر جمعہ کی رات کو اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔

اسی طرح وقت گزرا اور پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا انتظار تھا، گھڑی تو تھی نہیں کہ وقت کا تعین کیا جاسکتا مگر یہ طے تھا کہ جب تک میں مطمئن نہ ہوجاؤں کہ اتنی تاریکی چھا چکی ہے کہ میں خطرات میں کود پڑوں مہم کا آغاز نہ کروں۔ میں نے عمداً نکل بھاگنے کے لیے اول شب کا وقت طے کیا تھا تاکہ اگلی صبح طلوع ہونے سے پہلے کیمپ سے جتنا ممکن ہو اتنا دور نکل جاؤں۔ مجھے مکمل سکوت اور خاموشی کے ساتھ فرار کے منصوبہ پر عملدرآمد کرنا تھا۔

میں نے بستر پر مچھر دانی لگائی اور بستر کو اس انداز سے مرتب کیا کہ اگر کوئی ٹارچ کی روشنی ڈالے تو اسے یہی معلوم ہو کہ بستر پر کوئی آرام کر رہا ہے۔ میں نے وہ تعویز بھی اپنے بازو پر باندھ لیا جو نانی نے مجھے دیا تھا اور جسے میں ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

ہندوستانیوں نے وہ تعویذ اور سر کی اوڑھنی کو تلاشی کے وقت خوب اچھی طرح سے چھان بین کرکے دیکھا تھا کہ کہیں اس میں کوئی جنگی زمانے کا نقشہ تو نہیں' جو پائلٹ اپنے ساتھ رکھتے ہیں انہوں نے وہ مجھ سے چھیننے کی کوشش بھی کی تھی مگر جب میں نے اس پر شدید جذباتی ردعمل ظاہر کیا تو بالآخر وہ تعویز میرے پاس رہنے دیا ایسے خطرناک لمحات میں وہ تعویز میرے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔

میں نے دروازے پر لگی ہوئی ٹین کی چادر پر دائیں کندھے سے زور ڈالا۔ میرے بدن پر اس وقت صرف انڈر ویئر تھا ایک مرتبہ اس ٹین کی چادر سے عجیب سی آواز چاروں طرف پھیل گئی۔ اس سے پہلے میں لوہے کی ایک سلاخ سے ایک طرف سے اسے پہلے ہی ڈھیلا کر چکا تھا۔ بقیہ کام میں نے تکیہ کے دباؤ سے لیا تاکہ اپنے جسم کو باہر نکالنے کے لیے جگہ بنا سکوں۔ مگر تیسری شیٹ تو بہت ہی زیادہ سخت طریقے پر چڑھی تھی اور وہاں سے نکلنا بہت مشکل اور جان جوکھوں کا کام تھا اس لیے میرے شانے اور پشت چھل گئے۔ مجھے کافی حد تک اپنے بدن کو مختلف زاویوں سے آڑا ترچھا کرنا پڑا اور نتیجہ یہ نکلا کہ میں پیٹ کے بل باہر جا پڑا۔ اس پوری کوشش میں ظاہر ہے مختلف قسم کی آوازیں بھی بلند ہوئیں مگر شکر ہے کہ سپاہی وہاں سے خاصے فاصلے پر تھے اور پھر بارش کی ٹپ ٹپ شڑر شڑر نے ان آوازوں کو دبا دیا۔ مگر ایک غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ جس لوہے کی سلاخ اور تکیہ سے میں نے شیٹ کو دھکا دے کر نکلنے کی گنجائش پیدا کی تھی وہ بھی اپنے ساتھ باہر لے آیا۔ البتہ ایک طرف سے میرا پیر عجیب طریقہ سے پھنس گیا۔ خوش قسمتی سے یہ لمحات مختصر ثابت ہوئے اور میرا پاؤں بھی آزاد ہوگیا۔ اب میں نے جلدی سے گھاس پر لوٹ کر اپنے کو کچھ دور پہنچا دیا اور پھر بالکل ساکت پڑا رہا تاکہ اطراف کا جائزہ لے لوں اور پھر اگلا اقدام کروں۔

مجھے فوری طور پر یہ جاننا تھا کہ کہیں ڈیوٹی پر موجود سنتریوں نے اس آواز کو جو پیدا ہوئی تھی سن نہ لیا ہو۔ بظاہر تو مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا مگر ان کی آوازوں سے مجھے ان کے بارے میں کچھ اندازہ تھا۔ ان میں سے کچھ تو شیڈ کے پیچھے موجود تھے جس میں آفیسرز تھے جن کی جھلک اس خودرو گھاس میں سے جو خاصی بڑی ہوگئی تھی اور نو تعمیر لیٹرینز میں سے نظر آرہی تھی۔ سپاہیوں کا دوسرا جتھہ خاصا دور تھا جو سامنے کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مقابل کا کیمپ بالکل خاموش تھا اور وہاں کسی قسم کی غیر معمولی جنبش نہیں تھی۔

میرے شیڈ سے نکلنے سے کچھ لمحے قبل کچھ گاڑیاں کیمپ سے نکلی تھیں جب میں ہر طرف سے مطمئن ہوگیا تو سلاخ اور تکیہ کو اچھی طرح پکڑے تھوڑا سا پیچھے کی جانب پلٹا تاکہ سڑک سے کچھ فاصلے پر ہو جاؤں جہاں مستقل دو سپاہیوں کے پہرے پر چلنے کی بوٹوں کی آواز آرہی تھی جو اندرونی و بیرونی خاردار تاروں کی باڑھ کے درمیان کیمپ کے اطراف پہرے پر معمور تھے۔

گھاس بہت لمبی تھی مگر چلنے پر زمین پر بچھ جاتی تھی۔ میں سیدھے ہاتھ کی جانب لوٹ لگاتا اندرونی باڑھ کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس مرحلے پر میں وہ خیالات بھی صفحہ کاغذ پر رقم کردینا چاہتا ہوں جو اس وقت میرے ذہن میں دوڑ رہے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے تمام روداد تو یاد نہیں ایک مبہم سا نقش ذہن پر ہے۔ جس میں اہم اور نمایاں بات یہ ہے کہ میں شیڈ سے باہر نکل آنے کے کٹھن ترین مرحلے پر آسانی سے حل ہوجانے کی وجہ سے کسی حد تک مطمئن تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ان لمحات میں مجھ پر کسی قسم کا خوف طاری ہوا ہو یا ہیجانی کیفیت جو میرے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے پورے پروگرام کا تجزیہ کر رہا تھا۔ شیڈ کے عقب میں پہرے پر موجود دو سپاہیوں کی قدموں کی چاپ بھی صاف سن رہا تھا۔ مگر دوسرے 2 گارڈ کمانڈر کے نزدیک چوکی پر موجود سپاہیوں کو دیکھنا یا ان کے بارے میں کسی قسم کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا مجھے کبھی کبھی ان کی بھنبھناہٹ ضرور سنائی دیتی تھی۔ بقیہ پہرے دار مجھ سے فاصلے پر تھے لہٰذا ان کے بارے میں کوئی فکر نہ تھی۔ میں نے لوہے کی سلاخ کو باڑھ کی دو تاروں کے درمیان پھنسایا اور پھر دوسری جانب آسانی سے نکل گیا۔ میں آفیسرز اور جونیئر کمیشنڈ آفیسرز کمپاؤنڈ کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ میرا اگلا قدم سڑک کی جانب تھا مگر اسی درمیان مجھے اپنی جانب آتی ہوئی دو سپاہیوں کے جوتوں کی چاپ سنائی دی اور میں پھرتی سے عقبی جانب پلٹ گیا۔ دونوں سپاہی میرے نزدیک سے گزر گئے مگر انہوں نے میری جانب اچٹتی ہوئی نظر بھی نہیں ڈالی۔ جب وہ مجھ سے کچھ دور ہوگئے تو کیمپ کی بجلی چلی گئی اور تاریکی چھا گئی۔

میرا پروگرام تھا کہ میں اسی کمپاؤنڈ کی جانب جا نکلوں جو Other Rank کے لیے تھا۔ اس صورت میں کم از کم میں روشنی کے اس دائرہ سے نکل جاتا جو کیمپ کی نگرانی کے لیے نصب تھا۔ ویسے بھی کیمپ کے بیرونی احاطہ ہی میں رہنا بہتر تھا۔ اس حرکت

کے لیے زیادہ وقت بھی درکار نہ تھا۔

میں نے تاریکی ہوتے ہی پوری تیزی سے دوڑ لگانا چاہی گوکہ میرے سامنے ہی ایک نشیب میں خاصا پانی بھی جمع تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چند ہی لمحوں میں متبادل جنریٹر کام شروع کردے گا مگر اس کے لیے کم از کم 2 سے 3 منٹ کا وقت درکار تھا۔ پھر میں ایک لمحہ کو جھکا اور میری چھٹی حس نے مجھے روکا اور پھر میں دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔ اس دوران گارڈ کمانڈر نے اپنی ٹارچ کی روشنی کئی مرتبہ رود پر ڈالی تاکہ نگاہ رکھے اور مخالفت سمت میں جانے والے سپاہی بھی واپس آنے لگے۔ روشنیاں ایک منٹ سے کم وقت میں دوبارہ آ گئیں۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی بھی حرکت سے روک کر میری جان بچالی تھی اور شاید اس سے پہلے بھی زندگی میں مجھے اپنی انفرادی قوت کا نہ تو ادراک تھا اور نہ ہی میں نے اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر اس کا شکر ادا کیا تھا مگر اس لمحے سے لے کر آج تک اللہ کا شکر گزار ہوں۔

میں نے بہت تیزی سے پیچھے کی جانب رینگنا شروع کیا تاکہ سپاہیوں کے نزدیک آنے تک ان سے فاصلے پر ہو جاؤں' وہ دونوں تقریباً میری مقابل آ کر آپس میں بات چیت کرنے لگے میں JCO کمپاؤنڈ کے تاروں کے بالکل نزدیک تھا اور تکیہ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ وہ جلد مجھ سے فاصلے پر چلے جائیں۔

وہ تقریباً دو منٹ تک وہاں رہے اور پھر میری ہی جانب نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ چند لمحے گھنٹوں میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور ایسا محسوس ہوا کہ میں تاریکی میں اپنے حواس کھو دوں گا۔ وہ چونکہ روشنی میں تھے لہٰذا صاف نظر آ رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ سکتے ہیں۔ برسوں گزرنے کے باوجود اب بھی وہ چند لمحات میری نیند اڑا دیتے ہیں اور میں محو حیرت ہوتا ہوں کہ ان کی نگاہ مجھ پر نہ پڑی۔ میں وہاں ساکت پڑا تھا مگر ذہن میں طوفان برپا تھا ایسے وقت کے لیے مجھے یہی سکھایا گیا تھا۔ یہ واقعی میں میری تمام صلاحیتوں کا کڑا امتحان تھا۔ ایک سچے اور مشاق فوجی کا امتحان درحقیقت میں اس آزمائش میں تھا جو ایک پیادہ فوجی کے لیے ہی ممکن ہوتی ہیں اس لیے کہ اسے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے اور چونکہ میں بھی انفنٹری ہی کا سپاہی تھا لہٰذا آج اپنی صلاحیتوں کے بھرپور مظاہرے کا موقع ملا تھا۔ چند لمحوں کے لیے دماغ میں ایک خیال کوندا کہ کھڑا ہو جاؤں اور اپنے ہاتھ بلند کر کے اپنے آپ کو حوالے کرنے کا اشارہ دے دوں۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں۔ وہ مسلسل میری جانب ہی نظریں گاڑے تھے اور کسی بھی لمحے ان کی بندوق چل سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت اگر سپاہیوں نے مجھے شیڈ سے باہر دیکھ لیا تو ان کا فوری ردعمل میرا نشانہ ہوگا۔ اور وہ بھی جان لینے کی حد تک یعنی یہ میرے زندگی کے آخری لمحات ہو سکتے تھے۔ مگر یہ جان لیوا لمحات بھی گزر گئے۔ میں وہیں ٹھنڈے پانی میں پڑا رہا حتیٰ کہ مجھے جھرجھری یا کپکپی تک بھی نہیں ہوئی۔

آپ ذرا تصور کریں کہ پاتا گڑھ میں گرمی کے موسم میں گیلی گھاس پر میں ساکت پڑا ہوں اور دو سپاہی مسلسل مجھے گھور رہے ہیں یا کم از کم میں تو یہی یقین کیے ہوں۔ بارش کے قطرے مسلسل میرے چہرے پر پڑ رہے تھے اور وقت کی سوئیاں بھی حرکت کرنا چھوڑ چکی ہیں۔ ذہن کی کیفیت ایسی حالت میں کیا ہوگی۔ وحشت' خوف و ہراس' امیدیں شل۔ بس ایک موہوم سی امید جو سہارا دے رہی ہے۔ ایسے وقت میں اپنی سانس کی آواز بھی بری لگ رہی تھی۔ میں صرف کلمہ کا ورد کر رہا تھا۔ ایسے وقت اللہ ہی کی ذات پیش نظر ہوتی ہے۔۔۔ بالآخر سپاہی وہاں سے چلے گئے۔

سپاہیوں کے نگاہوں سے دور ہوتے ہی میں زمین پر لوٹ لگاتے ہوئے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا گزشتہ لمحات میں جو کچھ مجھ پر گزرا تھا اس نے مجھے تھوڑا سا نروس تو ضرور کیا مگر میرے اندر لاپروائی کا عنصر بھی بڑھ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تاروں کے

درمیان سے نکلتے ہوئے اپنے جسم پر زخم لگا بیٹھا۔ خاص طور سے پیروں پر۔ میرا انڈرویئر بھی پھٹ گیا۔ مگر اب مجھے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ یہ بھی ہماری تربیت کا ایک حصہ ہوتا ہے کہ کسی بھی خیال میں زیادہ دیر تک گم نہ ہو جاؤ اور یہ کہ ایک جگہ پر زیادہ وقت رکنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ البتہ اب میرے منصوبے میں کچھ تبدیلی ضرور آ گئی تھی' یہ وہ وقت تھا جب میں JCO کمپاؤنڈ کی اونچی اونچی گھاس کے درمیان تھا اور مقابلتاً اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ نزدیک ہی ریلوے لائن تھی جہاں گاڑیوں کی آمد و رفت کے آثار نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ میں بھی آہستہ آہستہ نزدیک پختہ فرش پر شیڈ کے عقبی حصہ پر پہنچا جہاں سے مجھے نائب صوبیدار اورنگ زیب اور نائب صوبیدار پائندہ خان کی بات چیت کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہاں دو شیڈ تھے اور ان کے درمیان راہداری تھی جس کے آگے پختہ سڑک تھی' وہاں تک تو میں پہنچ گیا۔ مگر سڑک پر روشنی بہت زیادہ تھی لہٰذا ناممکن تھا کہ کوئی چیز وہاں حرکت کرے اور نظر نہ آئے۔ لہٰذا مجبوراً تھوڑا پیچھے پلٹا اور موجودہ مقام کا اچھی طرح جائزہ لینے لگا۔

اس بات کا تو امکان ہی نہ تھا کہ اتنی روشنی میں سڑک کو پار کر لیا جائے اور مجھے کسی اور ہی گوشے کی تلاش تھی جو مناسب تر ہو۔ آفیسرز کمپاؤنڈ کے ایک جانب مجھے دو سپاہی صاف نظر آ رہے تھے جو گپ شپ میں محو تھے۔ مگر ایک عجیب و حیرت ناک بات یہ نظر آئی کہ دو سپاہی جو Other Rank کے کمپاؤنڈ کے عقبی حصے پر پہرا دیتے ہیں وہ اپنی جگہ پر موجود نہ تھے بلکہ وہ سنتری کی چوکی میں دبکے بیٹھے تھے تاکہ بارش سے محفوظ رہیں۔ اس صورت حال میں مجھے ایک بہتر جائے فرار مل گئی اب میں OR کمپاؤنڈ کے اس حصہ میں جا سکتا تھا جہاں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ میں ابھی ذہنی ادھیڑ بن میں تھا کہ پہرے پر مامور دونوں سپاہی گھاس پر عین اس جگہ پہنچ گئے جہاں میں چند لمحے پہلے موجود تھا۔ وہ ویسے ہی میرے اعصاب پر سوار تھے۔ کیا وہ کسی چیز کے بارے میں مشکوک و متلاشی تھے؟ یا وہ اپنے ذہن کے وہم کو دور کرنے کے لیے وہاں آ گئے تھے؟ یا ممکن ہے پہلے انہیں کچھ غیر معمولی چیز کا احساس ہوا ہو اور اب وہ تصدیق یا تردید کے لیے وہاں آئے ہوں۔ ایک سپاہی کو اگر شبہ ہو تو ہمیشہ گہرائی تک جانا چاہیے کسی بھی بات کو محض شک یا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک نہیں دینا چاہیے۔ میرے خیال میں وہ بھی ذاتی طور پر یقین کر لینا چاہتے تھے کہ کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوئی۔ کچھ بھی ہو چند لمحے پہلے ان کا گھاس کی طرف نہ آنا میرے حق میں مفید ثابت ہوا تھا۔

اب میں JCO Compound کے غربی جانب پہنچ چکا تھا یہاں میں نے کچھ اینٹیں ہٹائیں جو JCO اور OR کمپاؤنڈ کے درمیانی خلا کو پر کرنے کے لیے رکھ دی گئی تھیں مگر میں سانپوں سے خوف زدہ تھا۔ یہ کوئی انجانا خوف یا توہم نہ تھا۔ میں ویسے بھی سانپوں سے کبھی بھی مانوس نہیں رہا۔ بلکہ انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا نہ کہ میرا کہیں ان سے واسطہ پڑ جائے۔ پاتا گڑھ تو سانپوں کا علاقہ تھا اور لوگوں پر ان کا خوف و دہشت بھی تھی۔

اب میرے لیے موقع تھا کہ OR کمپاؤنڈ میں چلا جاؤں جہاں قطعی گھاس وغیرہ نہ تھی یا دیوار کے ساتھ چلوں تاکہ کونے پر پہنچ کر روشنی سے محفوظ جگہ سے باہر نکلنے کا اقدام کروں۔ فیلڈ مارشل William Slim نے ایسے مواقع کے لیے کہا تھا "بہت زیادہ محتاط رویہ مناسب نہیں تھوڑی بہت جرأت سے کام لینا چاہیے مزید یہ کہ شک و شبہ کی ایسے موقع پر کوئی گنجائش نہیں جو کرنا ہے سو کر گزرو" مگر مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ میں اس وقت کسی دانشمند کے زریں قول سے بالکل بے نیاز تھا۔

لوہے کا ٹاور سامنے تھا جس کے بالکل نزدیک گھاس کا جھنڈ تھا۔ میں نے سوچا کہ آفیسرز کمپاؤنڈ کی دیوار کے پاس ڈیوٹی پر موجود دونوں سپاہیوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ جگہ انتہائی مناسب ہے جو تقریباً 3 سو گز کے فاصلے پر تھے۔ اللہ ان کا بھلا کرے

کہ وہ اپنی گفتگو میں مگن تھے ان کی آوازیں میرے حق میں روشنی کا کام دے رہی تھیں جن کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں سمتوں کا اندازہ لگانا ممکن ہو رہا تھا۔ گفتگو میں ان کی محویت ایک فطری بات تھی اس لیے کہ وہ ایک اہم مقام پر نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ ہر انسان کسی نہ کسی حد تک ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے اور پھر اس کے اندر ایک طرح کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنا وقت گزارنے کے لیے کسی موضوع پر گپ کرنے لگتا ہے۔

ایسے مواقع پر اچانک فائدہ اٹھانے والا جیت جاتا ہے۔ یہ ہر ایک کی انفرادی غور و فکر ہمت و جرأت پر منحصر ہے کہ بر وقت اقدام کر سکے۔ جرمن فوج کے کرنل Skorzeny نے کہا کہ اگر انسان خود فولادی ہتھیار ہو تو اس کے چونکا دینے والے ارادے خود بندوق کی گولی کا کام کر دیتے ہیں۔

اب جو فاصلہ مجھے دیوار کے ساتھ طے کرنا تھا وہ سب سے مشکل مرحلہ تھا اس لیے کہ میں وہاں براہ راست روشنیوں کی زد میں تھا اور کسی کی اچٹتی سی نگاہ بھی مجھے دیکھ سکتی تھی OR کے لیٹرین اور حمام کسی حد تک بیچ میں ایک پناہ تھے جب میں اپنے آپ کو دوسری جانب لڑھکا رہا تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی چوکی میں بیٹھے دونوں پہرے دار سپاہی اب مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ انہی لمحات میں میں سرچ لائٹ کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ جو بیرونی تاروں پر مرکوز تھی۔ وہاں ایک چوکی بنی تھی جو دیوار سے متصل تاروں کے لیے ستون کا کام دیتی تھی۔ چوکی اور دیوار کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ نکلا جا سکے اور میں بیرونی تار سے باہر نکل چکا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے تاروں کے ایک جال کے پاس رک جانا مناسب جانا۔ اب میں روشنیوں کے دائرے سے باہر تھا جو کیمپ پر نگرانی کے لیے نصب تھی۔ یہ کیمپ کا وہ آخری حصہ تھا جو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ اس طرف آبادی نہیں ہے۔

میں کیمپ کے احاطہ سے کچھ دور پر تھا اب میں نے سوچا کچھ آرام کر لوں اور اگلے اقدام کے بارے میں غور و فکر و منصوبہ بھی مرتب کر دوں۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تاریکی کی طرف آ گیا تھا اور پھر دوبارہ وہاں لیٹ گیا۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد میں نے نزدیکی ریلوے گیٹ کی جانب سے ایک آباد علاقے کی طرف جانے کا ارادہ کیا مگر جب میں نزدیک پہنچا تو مجھے مختلف آوازیں سنائی دیں لہٰذا میں نے اپنا ارادہ ملتوی کیا اور واپس پلٹ آیا۔ دیوار کی بلندی تقریباً دس فٹ تھی جس کو کرنا مشکل تھا۔ گو کہ ہمیں جست لگانے کی تربیت دی جاتی ہے مگر اتنی اونچی دیوار سے یہ ممکن نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اگر میں کچھ قدم دور سے دوڑ لگا سکتا تو شاید اتنی بلندی کو بھی پار کر لیتا مگر بڑی گھاس جو وہاں تھی اس کی وجہ سے یہ امکان بھی نہ رہا۔ میں نے دیکھنا شروع کیا کہ دیوار میں کہیں کوئی نالی یا سوراخ ہو یا پھر آس پاس کوئی درخت ہو جس کی مدد سے دیوار کو پار کیا جا سکے کہ تھوڑی دور مجھے ایک درخت نظر آیا۔ جس کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں اور وہ میرے مقصد کی تکمیل کے لیے مناسب تھا۔ دیوار کے اوپر خار دار تاروں کی تین لائنیں تھیں۔ میں نے تاروں اور دیوار کے اوپری حصہ میں اپنا تکیہ پھنسا دیا اور پھر اطراف کا جائزہ لیا تاکہ درخت تک چھلانگ لگاتے وقت کسی کی نگاہ میں نہ آؤں۔ میں دراصل درخت کے سہارے دیوار پر چڑھنا چاہتا تھا جو کہنے میں آسان مگر عملاً مشکل تھا۔ دو مرتبہ میں اوپر تک پہنچ گیا مگر پھسل کر نیچے جا گرا۔ دوسری مرتبہ تو اچھا خاصا جھٹکا بھی لگا۔ ہوتا یہ تھا کہ شاخیں میرے بوجھ سے جھک جاتی تھیں اور میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں ناکام رہتا اور نیچے آ دھمکتا۔ میں نے چند سیکنڈ غور کیا اور اپنے آپ کو قائل کیا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ درخت دیوار سے ملا ہوا ہے اور مجھے اس کو عبور کرنے میں یقیناً کامیابی ہو گی۔

Robert Bruce کے الفاظ ذہن میں

گونجنے لگے۔ اگر پہلے مرحلے میں کامیابی نہ ہو تو بار بار کوشش کرو ہمت نہ ہارو البتہ پہلی مرتبہ ناکام ہونے کے بعد ایک وقفہ لو اور اپنے منصوبہ کا غور سے جائزہ لو پھر دوسری کوشش کرو۔

اب میں دوبارہ گھاس پر لیٹا ہوا یہی کچھ کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور چہرہ مسلسل بھیگ رہا تھا۔ میں وقتی طور پر سپاہیوں کی گرفت یا سانپوں کے خوف سے آزاد تھا۔

میں اپنی سوچ اور خیالوں کو درخت کی مدد سے دیوار پھلانگنے پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔

پانا گڑھ میں جولائی 71ء کی شام تھی جب میں اپنے فوجی تربیت کرنے والے انسٹرکٹرز کے سائے اپنے گرد دیکھ رہا تھا جن میں کپتان امتیاز اللہ وڑائچ (ترقی پا کر لیفٹیننٹ جنرل ہیں) کپتان اصغر (بعد میں کرنل) جو تیسری ٹرم میں میرے پلاٹون کمانڈر بھی رہے اور ہمارے ٹرم کمانڈر میجر عزیز (بعد میں لیفٹننٹ کرنل) جنہوں نے میری سویلین عادات کو تبدیل کرنے اور ایک فوجی بنانے میں خاص تربیت دینے میں اہم کردار ادا کیا اور میں نے ایک اہم سنگ میل ان کی رہنمائی میں طے کیا تھا۔

تھوڑی دیر ہی بعد میں نے تیسری مرتبہ درخت پر چڑھنا شروع کیا اور آخر دیوار کی بلندی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اپنا مختصر سا اثاثہ تکیہ غلاف میں بند کیا اور اب دیوار کی دوسری جانب کا جائزہ لینے لگا۔ اندھیرا میں مجھے اس طرف بھی اونچی گھاس اور پانی نظر آیا البتہ پانی جوہڑ جیسا محسوس ہوا۔ پھر یہ کہ یہاں سے خاردار تاروں کے درمیان سے نکلنا بھی ممکن نہ تھا۔ واحد راستہ یہ تھا کہ میں دیوار پر چلتے ہوئے آخری کنارے تک تاروں کی باڑھ کا سہارا لیے رہوں تاکہ توازن برقرار رہے۔ میں آخرکار وہاں پہنچ کر لیتا اور تاروں میں لگی ہوئی گرہیں کھولنے لگا۔ کچھ دیر تو لگی مگر کامیابی حاصل ہوئی۔ اب میں نے پہلے اپنا تکیہ نیچے پھینکا اور پھر خود چھلانگ لگا دی۔ سنبھلنے کے فوراً بعد میں نے پاجامہ اتار بنیان اور لنگی پہنی اور پھر پانی ہی میں چلتا ہوا 200 گز دور سڑک کے کنارے پر پہنچ گیا۔

یہاں سے مجھے کیمپ نظر آیا اور میں نے الوداعی نظر ڈالتے ہوئے صادق اور تمام ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ دیا۔ میں ان کی امیدیں اور نیک خواہشات لیے آگے بڑھ رہا تھا حالانکہ وہ میرے احوال سے قطعی طور پر بے خبر تھے۔ میں کامیابی سے جنگی قیدی کیمپ سے فرار ہو چکا تھا اور یہ وقت تھا کہ میں اپنی کامیابی کا جشن مناتا مگر اس عیاشی کی فرصت کہاں تھی۔ مجھے تو ہر قیمت پر وہاں سے دور نکلنا تھا اور زیر لب اپنے معبود کا شکر ادا کرتا ہوا سڑک پر آگے بڑھتا رہا۔

ایک ذات شریف ایسی تھی جسے ضرور جھٹکا لگے گا کہ میں کس طرح بغیر کسی الوداعی پارٹی کے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ تھا پانا گڑھ کے جنگی قیدی کیمپ کا ہندوستانی کمانڈنٹ میجر R.S ایل۔ آفیسر کمانڈنگ 430 فیلڈ کمپنی 203 آرمی انجینئر رجمنٹ جس نے کہا تھا وہ میری ٹانگیں توڑ دے گا اور مجھے گھٹنوں کے بل کیمپ سے رخصت کرے گا اور میں صحیح سالم کیمپ سے نہیں نکلوں گا۔ رب کی مہربانی سے میں اپنے پیروں پر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

ایک اور اچٹتی نگاہ کیمپ پر۔۔۔ گڈ بائے ایل مجھے تم سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں البتہ تمہاری یہ خواہش ٹھیک تھی جیسے میں نے اس طرح پورا کیا کہ میں گھٹنوں کے بل ضرور نکلا مگر اپنی شرائط پر۔

91 بارڈر سیکورٹی فورس (BSF)

اگست 47 میں آزادی ملنے سے قبل برصغیر پاک و ہند تاج برطانیہ کی آن و شان تھا پھر جب یہاں کے باسیوں نے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو فرنگی ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ مسلمانوں کے ہر دلعزیز کرشماتی رہنما محمد علی جناح نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کیا تاکہ ہندو سامراج کے چنگل سے نجات حاصل ہو جائے لہٰذا نتیجہ یہ برآمد ہوا

کہ دو ملک وجود میں آگئے۔ ہندوستان اور پاکستان اپنی طرز کا منفرد تاریخی واقعہ۔ پاکستان دو حصوں میں منقسم' مشرقی اور مغربی اور دونوں کا فاصلہ 1500 میل کے قریب اور درمیان میں ہندوستان جس کا رویہ ہمیشہ نئی مملکت کے ساتھ مخاصمانہ رہا۔ مغربی پاکستان میں سندھ بلوچستان پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختون خواہ) تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی یا ہجرت۔ ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ باشندوں کا اپنی جدی پشتی بستیوں کو ترک کرکے آوارہ وطن ہونا اور مطلوبہ سرزمین پر بس جانا پندرہ لاکھ سے زیادہ انسانی جانیں تلف ہوگئیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے ہندوستان سے ہجرت کی اور مغربی یا مشرقی پاکستان آکر پناہ لی۔ اسی طرح موجودہ پاکستان سے ہندو اور سکھ نقل مکانی کرکے ہندوستان چلے گئے۔ بہر حال تقسیم کے نتیجے میں ہر دو جانب افسوسناک حد تک قتل عام ہوا۔ اس قتل وخونریزی کی وجہ سے ہندو مسلم نفرت میں مزید اضافہ ہوا۔

ہندوستان نے پاکستان کو ملنے والی مشترکہ اسٹرلنگ اکاؤنٹ کی رقوم روک لیں جس کی وجہ سے پاکستان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تلخیاں بھی پیدا ہوئیں۔ علاوہ ازیں جن علاقوں میں ریاستی راج تھا ان کے الحاق کے مسئلے پر بھی خاصا تناؤ پایا جاتا تھا ان میں سے بعض راجاؤں نے اپنی پسند کے ملک کے انتخاب میں تاخیر سے کام لیا خواہ جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے یا اپنے علاقے کے باشندوں کے مذہبی رجحانات کی وجہ سے ایسی ہی ایک عظیم ریاست حیدرآباد تھی جو چاروں طرف سے زمینی طور پر ہندوستان کے اندر گھری ہوئی جنوبی ہند میں واقع تھی۔ حکمران مسلمان یعنی نظام دکن جبکہ آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی۔ نظام دکن ہندوستان سے الحاق کے حق میں نہ تھے۔ مگر ان کی ریاست پر فوج کشی ہوئی اور بے چارے کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بالکل برعکس کشمیر کا علاقہ جس کی سرحدیں دونوں ملکوں سے ملتی تھیں اور وہاں مسلم اکثریت بھی تھی مگر حاکم ہندو تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پہلی جنگ 1947-48 میں کشمیر ہی کے تنازع پر لڑی گئی کیونکہ وہاں کے ہندو راجہ نے ہندوستان سے الحاق کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اقوام متحدہ نے مداخلت کی اور کشمیر تقسیم ہوگیا۔ سرحد کا نام سیز فائر لائن پڑ گیا۔ جموں کا شہر ہندوستان کے علاقے میں چلا گیا UN سیکورٹی کونسل نے اپنی 1949ء کی قرارداد میں طے کیا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ وہاں کے باشندے استصواب رائے کے ذریعہ کریں گے۔ مگر ہندوستان نے اپنی ہٹ دھرمی سے عملاً ایسا نہ ہونے دیا اور 1965ء میں اسی مناقشے کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان ایک اور جنگ ہوئی۔

آزادی ملنے کے ساتھ ساتھ ہی مشرقی پاکستان والوں کو احساس محرومی ہونے لگا کہ ان کو حکومت اور فوج میں متناسب حق نہیں مل رہا ہے اور مغربی بازو کے لوگ استحصال کر رہے ہیں۔ 1952ء میں لسانی مسئلے پر بنگالیوں کے غم وغصہ میں اضافہ ہوا تھا اس لیے کہ مشرقی بازو میں اکثریت بنگالی بولنے والوں کی تھی مگر ان پر اردو زبردستی مسلط کی جا رہی تھی۔ آنے والی دہائی میں معاشی واقتصادی وجوہات سے دونوں بازوؤں میں اختلافات کی خلیج بڑھتی چلی گئی۔ ان ہی مسائل کو اپنا ایجنڈا قرار دینے والی جماعت عوامی لیگ کو وہاں مقبولیت حاصل ہوگئی۔

1960ء میں عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت میں صوبائی خودمختاری کا نعرہ لگا دیا مجیب کو 1966ء میں ایک سازش کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ اسی سازش کو اگرتلہ سازش کے نام سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ 1969ء میں مشرقی پاکستان میں شدید احتجاج اور مظاہرے ہوئے تو شیخ مجیب کو رہا کر دیا گیا۔

1970ء میں وہاں تباہ کن سیلاب آیا مگر مغربی بازو نے خاطر خواہ اقدامات نہ کیے اور مشرقی پاکستانیوں کی ناامیدی اور مایوسی میں مزید اضافہ

ہوگیا۔

1970ء ہی میں پاکستان میں پہلی اور آخری مرتبہ آزادانہ ومنصفانہ انتخابات ہوئے جس کا سہرا بہر صورت جنرل یحییٰ خان کے سر بندھتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے دیگر پارٹیوں کا صفایا کردیا۔ مجیب الرحمٰن کی قیادت میں عوامی لیگ نے 313 رکنی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرلی وہ حکومت تشکیل دینا چاہتے تھے جو ان کا جائز حق تھا۔ اور مغربی بازو میں ذوالفقار علی بھٹو کو اکثریت ملی مگر بھٹو مجیب کو وزارت عظمیٰ ملنے کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔

مغربی پاکستان کا یہ رویہ جس کے پیچھے مخفی قوتوں کے اشارے اور مفادات تھے اور جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان والے اپنے جائز حق سے محروم کیے جارہے تھے۔ ملک کے مفاد میں مہلک ثابت ہوا اور دونوں ایک دوسرے سے مزید دور ہوتے چلے گئے۔

2 مارچ 71ء سے 25 مارچ 71ء تک مشرقی پاکستان میں مکمل نافرمانی اور بغاوت کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ فوج ابھی تک اپنی بیرکوں میں تھی۔ مختلف علاقوں میں مغربی پاکستانیوں اور غیر بنگالیوں کے ساتھ ناروا سلوک ہوا بلکہ کئی جگہ وہ ظلم کا نشانہ بھی بنے۔

ان افسوسناک واقعات کی وجہ سے غیر بنگالی فوجیوں میں اشتعال پیدا ہوگیا اور اس کے اثرات مغربی پاکستان تک پہنچے صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ مشرقی حصے میں بغاوت کو کچلنے اور حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے انتہائی اقدام کی فوری ضرورت ہے۔

مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی فوجی مطلوبہ مقدار میں موجود نہ تھے لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مغربی پاکستان سے فوجی یونٹس بھیجے گئے۔ دوسری جانب مشرقی پاکستانی یونٹس کو تمام اہم مقامات سے ہٹا دیا گیا۔ بے اعتمادی کی اس فضا نے متحدہ پاکستان کے رہے سہے جذبہ کو بھی ختم کر دیا۔ اس وقت تک اکثریت ان لوگوں کی تھی جو ملک توڑنے کی مکمل خود مختاری کے حق میں نہ تھے۔

فروری 71ء تک انفنٹری ڈویژن کی ایک بریگیڈ کو ہوائی جہاز سے وہاں پہنچایا جاچکا تھا۔ ڈھاکہ میں مسلسل ہڑتالیں ہورہی تھیں کاروبار ٹھپ ہوچکا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک چل رہی تھی آخرکار 25 مارچ 71ء کو فوج نے مشرقی پاکستان کے مرکزی شہر ڈھاکہ میں کریک ڈاؤن کیا۔ باغیوں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ مشرقی پاکستان فوجیوں اور پولیس سے اسلحہ لے لیا گیا۔ عوامی لیگ پر پابندی لگ گئی اور اس کے عہدیدار ہندوستان جاکر پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ شیخ مجیب کو گرفتار کرکے مغربی پاکستان روانہ کردیا گیا۔

پاکستانی فوج نے بڑا تند وتیز آپریشن کیا تاکہ حالات قابو کرکے قانون کی عملداری قائم کی جاسکے بہت سے فوجی اور سویلین اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نیم فوجی فورس ایسٹ پاکستان رائفلز سے بھی اسلحہ واپس لینے کا اقدام کیا گیا۔ EPR والوں نے متعدد مقامات پر بغاوت میں ہراول دستہ کا کام کیا تھا۔ چٹاگانگ میں میجر رفیق نے 26 مارچ کو بغاوت کردی تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہیں اس معاملے پر میجر ضیاء الرحمٰن پر سبقت ہے جنہوں نے 27 مارچ کو مشرقی پاکستان کی آزادی کا اعلان کیا۔ کالرگھاٹ کے ریڈیو سے انہوں نے نئی مملکت کا نام بنگلہ دیش بتایا۔

بغاوت میں اصل کردار یا کلیدی حیثیت پاکستانی فوج کے ان یونٹس کو حاصل تھی جن میں سو فیصد بنگالی تھے۔ ان میں 2E بنگال (جوئے دب پور) 4E بنگال (کومیلا) اور 8E چٹاگانگ شامل تھے۔ وہ تینوں اپنی تمام نفری کے ساتھ سلہٹ کومیلا اور چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں یا مشرقی سرحد کے نزدیک پناہ گزیں ہوگئے۔ انہوں نے بڑی چابکدستی سے محفوظ پناہ گاہیں تلاش کرلی تھیں مگر پاکستانی فوج بھی اتنی ہی پھرتی سے بغاوت کو کچلنے اور ان سے نمٹنے کے کام میں مصروف تھی۔

مشرقی پاکستان کے مغربی بارڈر کے قریب 3E بنگال (رنگ پور) نے باغیوں کی حمایت کی 1E بنگال (جیسور) جن سے اسلحہ نہیں لیا جاسکا تھا وہ بھی ان

سے مل گئے۔ علاوہ ازیں دوسرے بنگالی آفیسرز خواہ زمینی ہوں، یا فضائیہ اور بحریہ کے سب ہی ان سے جا ملے۔ وہی مجموعی قوت مکتی باہنی کی صورت میں پاکستانی فوج سے نبرد آزما ہوئی۔

میرا بھی بنیادی طور پر تعلق 2E بنگال رجمنٹ سے تھا جس کی تشکیل میں میرے والد کا کردار تھا اور اس کی بنیاد 7 فروری 49ء کو پڑی تھی وہ رجمنٹ بھی جودیب پور میں یعنی ڈھاکہ سے 26 میل دور مامور تھی۔ HQ بٹالین اور 2E کمپنی جودیب پور جبکہ ایک رائفل کمپنی ٹانگیل اور ایک میمن سنگھ میں امن و امان بحال کرنے کے لیے تھی۔ قبل اس کے کہ انہیں غیر مسلح کیا جاتا انہوں نے ایک رات قبل یعنی 27 مارچ کو بغاوت کردی جس کے نتیجہ میں بعض مغربی پاکستانی مفت میں مارے گئے جو بے داغ انفنٹری یونٹ کے ماضی کو داغ دار کرنے کے لیے کافی تھا۔

میجر ضیاء الرحمٰن کا تعلق ایسٹ بنگال رجمنٹ کی 8 بٹالین سے تھا۔ دو رائفل کمپنی ڈھاکہ کی جانب روانہ ہوئیں جس میں ایک EPR کمپنی کا مزید اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے نرسنگدی والا راستہ اختیار کیا۔ میجر شفیع اللہ کی کمانڈ میں یونٹ نے میمن سنگھ تک گاڑیوں میں سفر کرنے کے بعد بذریعہ ریل بھیراب بازار کی راہ لی۔ وہاں سے وہ پھر زمینی راستے سے انڈیا کے باڈر کے نزدیک سلہٹ کے تیلی پارہ چائے کے باغات کی جانب نکل گئے۔ برہمن باڑہ سے 4E بنگال بھی وہیں آکر ان کے ساتھ ملحق ہوگئی۔ دوسری جانب انڈین بارڈر سیکورٹی فورس (BSF) نے ان کو اسلحہ اور فوجی نفری کی کمک فراہم کی اور مشرقی پاکستان میں بغاوت کی ہر طرح ترغیب و مدد کی۔ ہندوستان نے بنگالیوں کے لیے اپنی سرحد بھی کھول دی اور ایک کروڑ کے قریب مشرقی پاکستانی وہاں پناہ گزین ہوگئے۔ ویسٹ بنگال کی حکومت نے بہار، آسام، میگھالیہ اور تری پورہ میں مہاجر کیمپ بنا دیے گئے دریائے ہاوڑہ سے ملحق اگرتلہ کا شہر واقع تھا جو ہندوستانی ریاست تری پورہ کا مرکز تھا۔ بنگلہ دیش میں کومیلہ ریلوے جنکشن سے وہاں تک کا زمینی فاصلہ 2 کلومیٹر ہے۔ 1970ء تک ریاست کا مرکز تری پورہ رنگامتی (اودے پور، جنوبی تری پورہ) تھا۔ مہاراجہ کرشنا کشور مانکیہ نے اسے اگرتلہ میں پرانی حویلی منتقل کیا تھا اور پھر اس کی منتقلی نئی حویلی یعنی اگرتلہ ہوگئی۔

برطانوی عہد میں ٹی پیرہ پہاڑی ریاست کا مرکز اگرتلہ تھا۔ اگرتلہ میونسپلٹی کا قیام مہاراجہ بیر چندرا مانکیہ (96-1862) کے زمانے میں ہوا اور اس کا حدود اربعہ 3 مربع میل جبکہ آبادی صرف ایک لاکھ تھی۔

شہر کی آبادی میں اکثریت بنگالیوں کی تھی اور ظاہر ہے زبان بھی وہاں بنگالی بولی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ تری پوری کے لوگ بھی شہر منتقل ہورہے تھے۔ اگرتلہ ایئرپورٹ (موجودہ سنگر بھل ایئرپورٹ) شہر سے تقریباً 12 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی آرمی کے 10th ایئرفورس کے کارگو گروپ کے زیر استعمال تھا جہاں سے مختلف سپلائیز ہوا کرتی تھی۔ وہ یہاں سے C-46 کمانڈو ٹرانسپورٹ کے جہاز اڑاتے تھے۔ جو برما میں اتحادی افواج کو اسلحہ اور دیگر اشیاء مہیا کرتے تھے۔

اگرتلہ کی تاریخ میں دوسری وجہ شہرت اگرتلہ سازش بنی یہاں شیخ مجیب کے قریبی ساتھی ہندوستانی لیڈروں اور RAW انٹیلی جنس کے اہل کاروں سے خفیہ ملاقاتیں کرتے تھے ان ہی سازشوں نے عملی شکل اختیار کی اور مشرقی پاکستان ایک آزاد مملکت بنگلہ دیش کی صورت اختیار کرگیا شیخ مجیب الرحمٰن بابائے قوم یا بابائے بنگلہ دیش قرار پائے۔ اس مرحلے پر کسی کے ذہن میں سوال آسکتا ہے کہ میں جو پاکستانی فوج کا افسر تھا، BSF-91 اگرتلہ سے کیا نسبت رکھتا ہے۔ تفصیل سے وجوہات بتانے کے لیے علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی مختصراً اتنا کافی ہے کہ میں یہ بتانے کے لیے کہ ایک اپنی ناپسندیدہ جگہ کیسے پہنچ گیا ایک فوجی

محاورہ نقل کروں کہ فوجی کو اس کے حال پر چھوڑ دو، میں ایک ضرب المثل Leave the Army Alone جسے میں اپنی گزشتہ کتاب میں بطور انتساب منتخب کرچکا ہوں۔

جب ہم جودیب پور گئے تو مجھے طے کرنا تھا کہ میں اسپیشل سروسز گروپ (SSG) یا پھر آرمی ایوی ایشن میں سے کسی ایک کو اختیار کروں۔ میں نے Army Aviation اسکول ڈھمیال راولپنڈی اختیار کرلیا۔ میری کارکردگی بہت اچھی نہیں رہی شاید یہی بتانے کے لیے میں آج زندہ ہوں میں نے جھجکتے ہوئے یہ شعبہ اختیار کیا تھا مگر اب میں اپنے ماضی پر قطعی شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے آرمی سے عشق تھا مگر معاشی معاملات ایسے تھے کہ میری بچگانہ یا احمقانہ سوچ تھی کہ فوج کا لباس زیب تن نہ کروں۔

میں 27 مارچ کو ڈھاکہ پہنچا جہاں مشرقی کمانڈ میں لاجسٹک فلائٹ میں میری ڈیوٹی تھی۔ ابھی میں اس رخصت پر تھا جو کسی دوسری جگہ فرائض انجام دینے کے لیے عملہ کو دی جاتی ہے لہٰذا آزاد تھا کہ مرضی کے مطابق وقت صرف کروں۔ مجھے مطلع کیا گیا کہ میرے مغربی پاکستان واپسی کے احکامات میرے منتظر تھے تاکہ آرمی ایوی ایشن کی ٹیم کے ہمراہ سری لنکا جاؤں اور وہاں کی فوج کو JVP پارٹی کی دہشت گردی کی کارروائی کو قابو کرنے میں مدد کروں۔ ساتھ ساتھ مجھے کہا گیا کہ جب تک آرڈر نہ مل جائے میں جوائننگ ٹائم میں مست رہوں۔

ڈھاکہ میں کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ میرے والد پنجاب اور والدہ بنگالی تھیں اور میں عجیب قسم کے جذباتی ماحول میں تھا۔ 2E بنگال میں شمولیت کرکے جودیب پور جانا ایک جذباتی فیصلہ تھا جس میں عقل کا مطلق دخل نہ تھا۔ میں حقیقت کا متلاشی تھا کہ جانوں 28 مارچ کی بغاوت کے پیچھے اصل محرکات کیا تھے۔ جو کچھ ان کے بارے میں سن رکھا تھا وہ کس حد تک صحیح ہے۔ میں اپنے فلائٹ کمانڈر میجر پیٹرک ٹائرنی کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں دس دن کے جوائننگ ٹائم کے وقفہ میں ہوں اگر انہیں میری ضرورت نہ ہو تو اپنی یونٹ کے ساتھیوں سے ملاقات کرآؤں۔

میجر پیٹرک نے مجھے رائے دی کہ ایسے پرآشوب ماحول میں وہاں جانا درست نہیں، وہاں میری جان کو خطرہ ہے۔ مگر میرے اصرار پر انہوں نے مجھے میجر لیاقت بخاری سے حفاظت کے لیے اسلحہ دلوادیا۔ میرے بیٹ مین مصطفیٰ کو بھی اسلحہ ملا جو میرے ساتھ کراچی سے ڈھاکہ آیا تھا۔ اس کا تعلق چٹاگانگ سے تھا۔

میں نے ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر کے ADC سے اس کی کار لے لی تاکہ جودیب پور تک کا سفر طے کروں۔ راستے میں سڑک پر جگہ جگہ رکاوٹیں تھیں۔ میں نے پیدل چلنا شروع کیا مگر میں جودیب پور سے خاصے فاصلے پر تھا جبکہ میرے تعاقب میں کچھ لوگ آرہے تھے۔ جن کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ مجھے چلتے چلتے ریل ٹرالی مل گئی جس کے ذریعہ میں برہمن باڑی پہنچ گیا جہاں 4E بنگال کا پڑاؤ تھا۔ اب وہ باغی ہوچکے تھے ان کے پاس کچھ دیر رکنے کے بعد میں 2E بنگال کے پاس بھیراب بازار پہنچ گیا۔ یہی رجمنٹ 27 مارچ کی رات کو اعلان بغاوت کرچکی تھی اور پھر وہ جودیب پور سے میمن سنگھ پہنچ چکے تھے۔ جہاں ایک رائفل کمپنی داخلی حفاظت پر مامور تھی۔ جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ ٹانگیل کی رائفل کمپنی کو بھی لے گئے۔

میں اپنے یونٹ تک پہنچ تو گیا مگر اب مجھے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ موت میرے سامنے رقص کررہی تھی۔ نوشتہ دیوار پڑھنے میں مجھے قطعی وقت نہ ہوئی۔ تلخ ترین اور ناقابل یقین بات جو معلوم ہوئی وہ یہ کہ یونٹ کے فوجی اپنے مغربی پاکستانی ساتھیوں کو تہ تیغ کرچکے تھے۔ یہ انتہائی قابل مذمت و افسوسناک سانحہ تھا مگر بہرحال حقیقت یہی تھی۔ صوبیدار ایوب کی فیملی کو بے رحمانہ اور ناقابل فراموش بہیمانہ طریقے سے ختم کردیا گیا تھا۔ ان تمام لوگوں کو ان کے مغربی پاکستان کے ساتھی متنبہ کرچکے تھے کہ اگر وہ یونٹ چھوڑ کر گئے تو موت یقینی ہے۔ بعض بنگالی

آفیسرز نے بھی انہیں مشورہ دیا تھا کہ چھٹی لے کر یا کسی طرح بھی ڈھاکہ چلے جائیں مگر ان سب نے باوجود ناگفتہ بہ حالات کے یونٹ کو اس طرح چھوڑ کے جانا گوارا نہ کیا۔ ایسی نازک صورتحال میں یونٹ چھوڑ کے جانا ان کے نزدیک خلاف مردانگی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یونٹ کے تمام ساتھی مل کر اپنے کسی بھی فوجی کے خلاف اقدام کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں گے۔ مگر ان کے تمام تصورات و خیالات یکسر غلط ثابت ہوئے اور اپنی جان سے ہاتھ دھونا بے چاروں کی قسمت قرار پائی۔ ان کی شہادت نے ان کی جرأت و ہمت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ ان کا جان کھو دینا اور اس طرح قتل کردیا جانا تاریخ میں ایک سیاہ کارنامہ ہے۔

بھیراب بازار پہنچ کر مجھے اپنے حسین خیالات بکھرتے نظر آئے۔ ”رجمنٹ کی شان دار آبرو سب سے زیادہ اہم ہے“ کا نعرہ ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اس سب کے باوجود پورے یونٹ نے جس ہنگامہ خیزی سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا وہ 31 مارچ 71ء کا دن میرے لیے یادگار ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کررہے تھے کہ ان کا ”چاند صاحب“ واپس آگیا ہے میں آج تک سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے ماحول میں جب نفرتیں اپنے عروج پر تھیں اور مقامی لوگ مغربی حصے کے رہنے والوں کے خون کے پیاسے تھے وہ بنگالی نوجوان کیونکر ایک پنجابی افسر کا استقبال کررہے تھے مگر کچھ نوجوان بنگالی افسروں میں نفرت کی جھلک نمایاں تھی اور اس صورت حال نے مجھے زندگی سے مایوس کردیا۔ نہ معلوم میری باری کب آنے والی تھی۔ وہ اب تک 3 مغربی پاکستانی افسروں کی جان لے چکے تھے اور چوتھا شکار میں خود ان کے جال میں پھنس چکا تھا۔ انہیں اپنی بغاوت کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا اور اس کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ میری قسمت مجھے یہاں لائی تھی' آیا تو تھا اپنی یونٹ کی چاہت میں' مگر معاملات اب میری دسترس سے باہر تھے اور مجھے محسوس ہوا کہ اب اسی پاکستانی فوج کی یونیفارم میں میرا پیغام اجل آیا چاہتا ہے۔

جب 21 مارچ 71ء کو لیفٹیننٹ کرنل ایم ایچ خان بھی کمانڈ سے ہٹایا گیا تو بریگیڈیئر جہاں زیب ارباب نے جو 57 بریگیڈیئر کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھے 32 پنجاب سے ایک بنگالی لیفٹیننٹ کرنل رقیب کو اس یونٹ کی سربراہی دی۔ جب بغاوت ہوئی تو کرنل رقیب کی جگہ میجر KM شفیع اللہ نے سنبھال لی۔ میجر شفیع نے میرے والد کے ایڈجیوٹنٹ کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے تھے۔ لہٰذا اس نے مجھے 2E بنگال کی کمانڈ دے دی۔ اسی کمپنی کی کمانڈ میرے والد بھی کرچکے تھے۔ نسیم کے ساتھ الفا کمپنی اور ایک اور کمپنی وقتی طور پر مجھے کمانڈ میں دے دی گئی۔ جب نافرمانی کی تحریک چلی تو شفیع اللہ بھی ایک سیکٹر کمانڈر تھا اور بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد وہ فوج اک سربراہ بنا۔ یہاں تک کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو 15 اگست 75ء کو قتل کر دیا گیا۔

ایک فوجی بغاوت میں میجر شفیع اللہ ریٹائر کردیا گیا اور میجر جنرل ضیاء الرحمٰن چیف آف آرمی اسٹاف بن گئے۔ شفیع اللہ' علاوہ ازیں کہ وہ نہ صرف ایک غیر معمولی فوجی افسر تھا' بلکہ اس میں بدرجہ اتم انسانی خوبیاں بھی موجود تھیں۔ منکسر المزاج انسان جس کی بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے خدمات اس سے کہیں زیادہ ہیں جو بیان کی جاتی ہیں۔ جب جودیب پور میں مغربی پاکستانی افسروں کو ذبح کیا گیا وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اگر وہ ہوتا تو شاید وہ سانحہ نہ ہوتا۔

ضیاء الرحمٰن اور خالد مشرف دونوں ہی شان و شوکت و طمطراق کی نمائش کرنا خوب جانتے تھے۔ لہٰذا اپنے کو نمایاں کرکے صف اول میں سرائیت کر گئے۔ اگر کبھی مشرقی پاکستان میں بغاوت کی تاریخ صحیح تناظر میں لکھی گئی تو شفیع اللہ کو اس کی خدمات کا صلہ ضرور ملے گا جو اس نے بنگلہ دیش کے لیے انجام دیں۔ وہ خالصتاً ایک ماہر و مشاق فوجی تھا جس نے پوری فوجی زندگی انضباط کے ساتھ گزاری اور یونیفارم اتارنے کے بعد سیاست میں قدم رکھا۔

5 اپریل 71ء کو جب میں نے ہندوستان جانے سے انکار کردیا تو دیگر افسروں میں میرے بارے میں شکوک وشبہات نے جنم لیا۔ چند 2E بنگالی افسروں کے علاوہ باقی سب ہی بنگلہ دیش سے متعلق تحریک میں میرے کردار سے متعلق کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ان باغیوں کے مابین ہی ایک چھوٹی سی بغاوت درپیش تھی وہ میرے بارے میں کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ شفیع اللہ' شی شو اور نسیم میرے طرفدار تھے اور میری جان بچانا چاہتے تھے۔ البتہ جوان افسروں کے جذبات مختلف تھے اور وہ کسی حد تک طیش میں تھے مگر سینئر افسروں کی موجودگی میں وہ میرے خلاف کسی قسم کا اقدام کرنے سے قاصر تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یونٹ میں دوسرے مسائل پیدا ہوسکتے تھے لہٰذا بڑی ہوشیاری سے انہوں نے مجھے بہلا کر یہ بتایا کہ کرنل MAG (محمد عبدالغنی عثمانی جو بعد میں مکتی باہنی کے کمانڈر انچیف اور جنرل بن گئے) مجھ سے بارڈر پر ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے فریب دیا گیا کہ 2E بنگال کے 6 پلاٹوں B کے کچھ جوان میجر خالد مشرف کی سربراہی میں بحفاظت وہاں تک پہنچا دیں گے۔

میجر خالد مشرف میرے بارے میں اسی وقت سے شکوک وشبہات میں مبتلا تھا جب میں برہمن باڑیہ میں اس سے ملا تھا اور اب تو وہ 4E بنگال کا کمانڈنگ افسر تھا اس نے میجر شفیع اللہ کو وائرلیس پر پیغام دیا تھا کہ مجھے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ مگر شفیع اللہ نے اسے واضح اور دوٹوک الفاظ میں بتادیا تھا کہ اگر میرا بال بھی بیکا ہوا تو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو 2E بنگال کا مجرم سمجھے گا۔ خالد مشرف کو خاموش ہوجانا پڑا مگر وہ میری جانب سے بدگمان رہا اور اس کا اثر نوجوان افسروں پر بھی پڑا جو میری جان کے دشمن ہوگئے جب میں تیلی پارہ کے چائے کے باغات میں تھا۔ اس نے کرنل عثمانی سے کہا کہ میں اس کے اسٹاف کے حوالے کردیا جاؤں مگر شفیع اللہ جھجک رہا تھا۔ خالد مشرف نے شفیع کو قائل کرلیا کہ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ کرنل عثمانی سے ملاقات کرلوں۔ جب ہم بارڈر پر پہنچے تو مشرف نے کہا ہمیں عثمانی کے کیمپ تک جانا ہوگا جو اگرتلہ میں تھا۔ 2E بنگال کی جیپ جو میری محافظت پر مامور تھی' کسی جگہ روک لی گئی جس کا مجھے علم نہ ہوسکا' جب میں 91 باڈر سیکورٹی فورس کی چیک پوسٹ پر پہنچا تو مجھے پوری صورت حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ وہاں کرنل عثمانی سے توثیق کے بعد مجھے باقاعدہ BSF 91 کی تحویل میں دیا جانا تھا مشرف مجھے اس کے اشارے دے رہا تھا اور یہی کہتا تھا کہ میری اپنی حفاظت کے پیش نظر یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔

دوسری جانب 2E بنگال کے عملہ کو یہ بتایا جاتا تھا کہ میں اگرتلہ کے راستے میں حادثے میں شدید زخمی ہوگیا ہوں اور علاج کے لیے اسپتال لے جایا جارہا ہوں۔ تاریخ نے میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کردیا تھا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں پاکستانی جنگی قیدی بن جاؤں کیا اس کی عقلی توجیح ہوسکتی ہے؟ شاید نہیں البتہ 2E بنگال سے میرا عشق تمام ہوچکا تھا اب ہمارے راستے جدا تھے بشرطیکہ مستقبل میں میری زندگی کی لکیر باقی ہو۔

میرے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ رات میں نے شدید خوف و ہراس کے عالم میں جاگ کر گزاری مگر میں درحقیقت اس وقت تمام جذبات سے عاری تھا اور کسی وقت مجھ پر نیند غالب آگئی۔

صبح میں نے دیکھا کہ میں تنہا نہیں بلکہ میرے دو ہمراہی وہاں موجود ہیں۔ ان کے نام مجھے بعد میں معلوم ہوئے۔ انل اور ناپن' وہ دونوں غیر مجاز رخصت پر جانے کے جرم میں قید کیے گئے تھے اور چالیس دن سے منتظر تھے کہ ان کو باقاعدہ سزا سنائی جائے مگر وہ دونوں زندہ دل قسم کے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور مجھے کم از کم یہ ہوا کہ چلو وقت گزاری کے لیے کوئی بندہ بشر تو موجود ہے۔

میری اسیری کی ابتداء تھی مجھ سے ایسا سلوک کیا جارہا تھا جیسے میں کوئی سپر کمانڈو قسم کی چیز ہوں جبکہ میرا

دور دور تک ایسی کسی شے سے تعلق نہ تھا۔ میں نے شدت سے احتجاج کیا جس کا کم از کم مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جسمانی تکالیف سہنے کا حوصلہ مجھ میں فزوں تر ہوتا گیا۔ مگر وہ میری نگہبانی پر مامور اسی طرح چوکس رہتے جیسے میں کوئی بھی غیر معمولی اقدام غیر متوقع طور پر کرسکتا ہوں۔ مجھ پر نظر ڈالنے والا متوجہ ضرور ہوتا تھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میری بعض حرکات کچھ لوگوں کے لیے دلچسپی یا سنسنی کا باعث ہوتی ہوں گی۔ ہندوستانی اور بعض بنگلہ دیشی یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ میں اسپیشل سروسز گروپ (اینٹلی جنٹس) سے متعلق تھا جو کرنل عثمانی کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

عثمانی کو بھی اس بات پر یقین آچکا تھا۔ خالد مشرف نے بڑی کامیابی سے اپنا جال بچھا دیا تھا۔ کرنل عثمانی نے آرڈر دے دیا کہ مجھے گولی مار دی جائے مگر بریگیڈیئر پانڈے اور BSF کے دیگر افسران میرے بارے میں کچھ اور پلان بنا رہے تھے ۔ میں ان کی فکر کے مطابق بہت کام کا آدمی تھا لہٰذا مجھے اپنی تحویل میں رکھنا چاہتے تھے۔

مجھ پر مامور نگرانی کرنے والے عام لباس میں تھے جو غیر معمولی بات تھی' دروازے کے پاس ایک JCO پستول لیے ہمہ وقت بیٹھا رہتا تھا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد ان کا رویہ کچھ بہتر ہوا اور وہ مجھ سے خوش گوار لہجے میں بات چیت کرنے لگے۔ ان میں سے دو ہری پال اور جے سنگھ نوخیز جوان تھے اور جب ہم میں تھوڑی قربت اور بڑھی تو وہ مجھے کبھی کبھار کھانے میں شریک کرلیتے اور اجمیر و امرتسر کے واقعات سناتے۔

مجھ سے پوچھ گچھ (Interogation) کی ٹیم کا پہلا واسطہ 6 اپریل 71 کو پڑا اور پھر یہ سلسلہ خاصی مدت تک چلتا رہا۔ بلکہ جب تک میں BSF-91 کی تحویل میں رہا' مختلف ٹیمیں بڑے سنگدلانہ طریقے سے مجھ سے کچھ نہ کچھ اگلوانے کی کوشش میں مصروف رہیں۔ مجھ پر جو کچھ وہاں بیتی اور جس طرح کا سلوک میرے ساتھ معلومات کے حصول کے لیے لیا گیا اس پر میں ایک علیحدہ کتاب لکھ سکتا ہوں۔ پہلے تو ان لوگوں نے مجھے لالچ اور حسین خواب دکھائے اور پھر دھمکیاں دینے پر اتر آئے۔ مگر میں جو ایک دفعہ بتا چکا تھا اس پر قائم رہا' کیونکہ حقیقت وہی تھی جسے وہ ہرگز ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

جب پرسش کا آغاز ہوا تو پہلے دو دن BSF کے دو آفیسر جو پنجاب سے تعلق رکھتے تھے مجھ سے وقفہ وقفہ سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ کپتان (اسسٹنٹ کمانڈنٹ) منا جس کا آبائی تعلق جہلم سے تھا' میرے لیے کچھ رسالے ٹوتھ پیسٹ و برش بھی لے کر آیا۔ مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ باغی فوج کو ہدایات و مشورہ دیتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ جو فریضہ انجام دے رہے تھے اس سے بہت زیادہ راضی نہ تھے۔ میں وہاں باغی لیڈروں کو سویلین اور فوجی دونوں کو آفیسر میس میں مسلسل آتے جاتے دیکھتا جو تقریباً 150 گز پر واقع تھا مجھے تو وہ گدھ لگتے تھے جو پاکستان کی لاش کی بوٹیاں نوچنے میں مشغول تھے۔

کوارٹر گارڈ ایک کھولی نما کمرہ ہوتا ہے اس سیل میں آرام و آسائش کا کوئی تصور نہیں۔ ایک فوجی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ وہاں کے مصائب و مشکلات برداشت کرسکتا ہے مگر جب میں اپنے جوابات میں ان کو مطلوبہ مواد فراہم نہ کرسکا تو میرے رکھوالوں نے اگلا اقدام میرے لیے جو تجویز کیا اس میں تشدد اور تھرڈ ڈگری اذیت کے حربے شامل تھے۔ جس میں جسمانی مار پیٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ کوئی خوش قسمت ممکن ہے رائفل بٹ سے بچ جائے جو بعض اوقات سر پر شدید ضرب کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور جس کی اندرونی چوٹیں شدید قسم کی ہوتی ہیں اور بعض اوقات حس و حرکت کو بھی چھین سکتی ہیں البتہ انسان زندہ رہتا ہے تاکہ اس پر دیگر قسم کے دباؤ ڈال کر کچھ اگلوایا جاسکے۔

انڈین بارڈر سیکورٹی ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو فوج اور پولیس کے درمیان کہی جاسکتی ہے۔

اور اس میں بڑے سفاک لوگ ہوتے ہیں۔ آج بھی میں سوتے سے اٹھ جاتا ہوں اور وہ مظالم جو انہوں نے مجھ پر روا رکھے، یاد کرتا ہوں تو پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی میرے دل میں ان کے لیے نفرت و حقارت کا جذبہ موجود ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھ پر وہ بدترین تشدد دو دن کے بعد شروع ہوا اور ظاہر ہے میرے اندر کسی حد تک اسے برداشت کرنے کی ہمت بھی تھی 24 گھنٹے انہوں نے مجھے تختہ مشق بنا رکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں درد و کرب سے بے حس ہو چکا ہوں۔ میرا جوڑ جوڑ ٹوٹ چکا تھا اور تقریباً نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ انسان ایک حد تک اذیت و تکلیف برداشت کرسکتا ہے۔ پھر اس پر ایک بے حسی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، جہاں وہ نہ رنج کی کیفیت محسوس کرتا ہے اور نہ انبساط کی، وہ ذہنی طور پر کسی اور ہی عالم میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ مکمل طور پر اعصاب کے ٹوٹ جانے سے محفوظ ہوجاتا ہے، مجھے بھی اتنا زدوکوب کیا گیا کہ میں بے حس ہوگیا، البتہ مکمل طرح ٹوٹنے سے بچ گیا۔

جب میرے ہوش و حواس بحال ہوئے تو مجھے کچھ لوگوں کی آپس میں بحث کرنے کی آوازیں محسوس ہوئیں، مجھے سیل سے باہر زمین پر لے جاکر بٹھا دیا گیا۔ دھندلکا چھا چکا تھا، مگر میں انڈین فوجیوں کی سبز رنگ کی یونیفارم دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایمبولینس میں ڈالا گیا اور M.I روم لے گئے۔ میں خواب و بیداری کی سی حالت محسوس کررہا تھا۔ وہاں مجھے ایک ڈاکٹر اور نرس نظر آئیں، میرے ایک انجکشن لگایا گیا، جس کی تکلیف مطلق محسوس نہ ہوئی اور پھر میں میٹھی نیند سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو محسوس ہوا، میں اسپتال کے بستر پر ہوں۔ درحالانکہ وہ اسپتال نہ تھا۔ میرے جوڑ جوڑ میں درد بس چکا تھا۔ سر منوں بھاری تھا، مجھے محسوس ہوا کہ میرا شیو بنایا گیا ہے اور مجھے نیند ہی کی حالت میں اسپنج غسل بھی دیا گیا ہے۔ کمرے کے باہر اب بھی وقفہ وقفہ سے کچھ لوگوں کے آپس میں بات کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر آواز دھیمی تھی اور سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ BSF-91 سیل سے نکلتے وقت بھی مجھے یہی محسوس ہوا تھا۔

میرا اندازہ ہے کہ انڈین فوج کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ ایک پاکستانی افسر اور شاید سپر کمانڈو BSF-91 کی تحویل میں ہے اور وہ چاہتے تھے کہ اپنی تحویل میں لے کر مجھ سے پوچھ گچھ کریں، مگر جب انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا جو BSF-91 نے درگت بنادی تھی تو سارا معاملہ اپنے بریگیڈ کمانڈر کو بتا دیا۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا تھا، شاید اس کا نام راوت تھا۔ بہرحال وہ جو بھی تھا، مگر میرے حق میں تو وہ مسیحا ثابت ہوا اور میری جان بچالی۔ اس نے فوراً ہدایات دیں کہ BSF-91 مجھے فوج کے حوالے کردیں، لیکن BSF-91 نے صاف انکار کردیا۔

فوج کا کوڈ اور مزاج یہ ہے کہ وہ کبھی اجازت نہیں دیتے کہ کسی فوجی پر دوسرا ادارہ یا محکمہ جبر و تشدد کرے، اس کے تمام حقوق وہ اپنے لیے محفوظ سمجھتے ہیں اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا کہ بریگیڈیئر راوت نے ایک فوجی جتھہ روانہ کرکے مجھے BSF-91 سے اپنی تحویل میں لے لیا۔ مگر سیاست بہرحال اپنے طور طریقے رکھتی ہے، وہ زمانہ تھا جب انڈین آرمی کو مشرقی پاکستان میں مداخلت کے احکامات نہیں ملے تھے اور تمام معاملات کو BSF-91 ہی دیکھ رہی تھی۔ دو دن میں میری حالت بھی قدرے بہتر ہوگئی۔ زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، البتہ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگیا تھا۔

مجھے دوبارہ BSF-91 کی تحویل میں دے دیا گیا، مگر BSF-91 نہیں، بلکہ ان کے سویلین عملے کو، تاکہ وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرسکیں۔ بعد میں ڈھاکہ میں مجھ سے ایک خوش اطوار معلومات کرنے والے افسر نے کہا کہ میں BSF-91 سے انڈین فوجیوں کی وقتی تحویل کا کسی سے تذکرہ نہ کروں، اس سے میرے بارے میں منفی تاثر قائم ہوگا۔ یہ قطعی احمقانہ

بات تھی، بدمعاش و بدقماش کو اس کے کرتوت بھگتنا چاہئیں۔

2E بنگال کے میرے ساتھیوں نے میری جاں بخشی تو کردی، مگر ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے زندہ درگور بھی کردیا۔ نہ معلوم کس وجہ سے، جو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ہم سب پاکستانی تھے اور فوج میں ایک دوسرے کے رفیق بھی، انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے اپنے وطن سے محبت ہے، مگر میں ان کے خلاف کسی قسم کا بغض وعناد نہ رکھتا تھا۔ وہ راتوں رات کیونکر میرے خلاف ہوگئے؟ یہ معاملہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اگر وہ مجھے اپنے منصوبوں کے درمیان حائل سمجھتے تھے تو مجھے مار کر مجھے اپنے وطن کی سرزمین پر دفن کردیتے۔ اتنا سلوک تو اپنے بھائیوں اور ساتھیوں سے متوقع ہوتا ہے، مگر مجھے دشمن کے حوالے کردینا کہ وہ میرے ساتھ من پسند سلوک کریں، یہ بربریت تھی۔ جس کا میں قطعی مستحق نہ تھا۔

قدرت کا اپنا نظام اور اپنی تکوین ہے اور جو بوتا ہے، اسے کاٹنا بھی ضرور ہوتا ہے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے مجھے زندگی کا بدترین دور گزارنے کے لیے دشمن کے حوالے کیا تھا، اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ گئے اور اسی سرزمین پر جس کی آزادی کی جنگ انہوں نے لڑی تھی۔ یہ سب باتیں تاریخ نے ان کے لوح مزار پر تحریر کردیں۔ یہاں میں یہ ضرور اعتراف کروں گا کہ اس زمانے میں میرے دل و دماغ میں ان کے خلاف نفرت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ قسمت کا کھیل دیکھیے کہ میجر خالد مشرف جو بعد میں میجر جنرل بنا، 2E بنگال ہی کے سپاہیوں (غالباً 6 پلاٹون B کمپنی) کے ہاتھوں اس فوجی بغاوت میں مارا گیا، جس میں 1975ء میں ضیاء الرحمن کو اقتدار ملا تھا۔ وہ خود کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک اور بغاوت کرنا چاہتا تھا، مگر ناکام ہونے پر فرار کی کوشش میں مارا گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے دونوں ساتھیوں جن کا مقدر بھی اسی جیسا تھا، ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مردانہ وار جیو اور مردانہ جرات کے ساتھ موت کو گلے لگالو۔“

مجھے مشرف سے کوئی شکایت یا گلہ نہیں، ان حالات میں شاید اسے وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جو اس نے کیا، وہ ایک بہادر سپاہی تھا، مگر اس کی ہوس اقتدار نے اسے مروادیا۔

11 اپریل 71ء کی رات کو مجھے کپتان منا MI رو سے BSF گارڈز کی نگرانی میں کوتوال تھانہ، اگرتلہ لے گیا۔ تھانہ کے انچارج سب انسپکٹر نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور جائزہ لینے کے بعد ایک بدبودار کھولی میں قید کردیا۔ جہاں پیشاب کی سڑاند سے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ میں نے شدید احتجاج کیا، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ میری ذہنی کیفیت اب تک خاصی بہتر ہوچکی تھی، مگر اب جو ماحول مجھے میسر ہوا تھا، اس میں سوائے آرزوئے مرگ کے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ وہ رات میری زندگی کی سیاہ ترین رات تھی۔ تاریکی، مہیب سناٹا اندرونی اور خارجی دونوں طرح میں سرد پڑ چکا تھا۔ امیدیں مایوسی میں بدل گئیں اور میں نے اللہ سے دعا کی کہ یا تو آزادی مل جائے، ورنہ موت آجائے۔

آج بھی وہ تلخ یادیں میرے جسم میں جھرجھری پیدا کردیتی ہیں اور شاید مرتے دم تک میں فراموش نہ کرسکوں۔

وہ دہشت وبیم ورجا کی رات اور جانکنی کا عالم، جس کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔

☆☆

(جاری ہے)

گور غریباں

ڈاکٹر افشاں ملک

صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے ہر قول و فعل میں کچھ راز پنہاں ہوتے ہیں جن کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی، ان کے عمل کی گہرائی میں جاکر کوئی عملی اقدام کرنا ہی بہتر ہوتا ہے

ایک شخص کی نادانی جو امر حقیقت سے ناواقف تھا

میری بچپن کی دوست حمامہ نے ابھی کچھ سال پہلے جس جگہ اپنا مکان تعمیر کرایا تھا وہ پرانی بستی کے اختتام پر ضلع جیل کی مغربی سمت کی اونچی دیوار کے عین مقابل ایک میدان کو چھوڑ کر مغرب کی طرف واقع تھا۔ مکان کے سامنے سے ایک کشادہ سڑک گزرتی تھی۔ اس کے گھر کی بالکنی میں کھڑے ہوکر جیل کی اونچی بلکہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چار دیواری کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پوری فصیل ڈیڑھ گز سے زیادہ چوڑی تھی اس پر پیلے رنگ کا پلاستر کیا گیا تھا جو میلا ہوکر دیکھنے والوں میں صرف جیل کی سخت گیری کا احساس ہی پیدا کرتا تھا۔ جیل خانے کا صدر دروازہ دوسری طرف مغرب کی جانب کھلتا تھا۔ اسی جانب پہرے دار سپاہیوں کے فیملی کوارٹر تھے۔

یہ مکان جس کا نام حمامہ کے شوہر عدیل احمد نے ”دارالسلامہ“ رکھا تھا اتفاقاً ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے گزرنے والے لوگ اس بستی کا راستہ اکثر عدیل احمد سے پوچھتے جو سامنے والی سڑک پر آگے جاکر جنوب میں آباد ہوئی مدرسہ کالونی کی طرف مڑ

جاتا تھا۔ مدرسہ کالونی جنوب کی طرف تھی اور جیل اور مدرسہ کالونی کے درمیان جو لمبا چوڑا میدان تھا اسے ''گور غریباں'' کہا جاتا تھا۔ میں جب بھی اپنی دوست حمامہ کے یہاں ٹھہری تو سب سے زیادہ تکلیف دہ اور توجہ کا مرکز میرے لیے یہی گور غریباں رہا ہے......!!!

شام ہوتی یا دوپہر یا پھر رات کوئی بھی وقت ہوتا میں دیکھتی کہ جیل سے ملحق بنے پوسٹ مارٹم ہاؤس سے ایک نہ ایک نعش نکل کر آتی۔ نعش کے ورثاء اگر ساتھ ہوتے تو گور غریباں میں کسی بھی جگہ دستور کے مطابق قبر کھودتے اور اس میں پوسٹ مارٹم شدہ نعش کو دبا دیتے۔ اگر نعش لاوارث ہوتی تو پولیس کے کچھ وردی پوش جوان ساتھ آتے اور جیل کے جمعدار سے گڑھا کھدواتے اور اس میں مردے کو دبا کر ہلکی مٹی ڈلوا کر کام ختم کر دیتے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ پچھلے دنوں سے مردوں کے آنے کا یہ سلسلہ کافی بڑھ گیا تھا......!!!

مجھے نہیں معلوم کہ حمامہ کے گھر میرا بار بار آنا حمامہ سے میرا لگاؤ یا بچپن کی دوستی تھی، یا یہ درد انگیز مناظر تھے جو میرے لیے عبرت حاصل کرنے سے کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ ہر مردہ موجودہ صورت حال اور آنے والے دنوں کی خدشات کی نشاندہی کرتا تھا......!!!

اس رات جب میں حمامہ کے گھر رات کو ٹھہری تو ساری رات سو نہیں سکی۔ ہر گھنٹے کے بعد جیل کی فلک بوس عمارت کے اندر سے پہرے دار سپاہی کی قیدیوں کو گننے کی آواز آتی پھر لوہے کے گھنٹے پر ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی اور گرجدار آواز سے پورا ماحول گونج جاتا۔ پہرے دار اعلان کر رہا ہوتا۔

''بیرک نمبر چوبیس، اڑتیس قیدی، ایک بیٹری، تالا کنجی ساب ٹھیک۔''

میں سوچتی کہ ان اڑتیس قیدیوں میں سے اگلے دنوں مین کس کو یا کتنوں کو کم ہو جانا ہے اور کس کو جیل سے گور غریباں تک کا سفر طے کرنا ہے۔ اکثر اس جیل میں قیدیوں اور پہرے داروں کے بیچ جھڑپیں ہوتی تھیں، شور مچتا تھا اور پگلی گھنٹی کی آواز گونجا تیت تھی۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ پگلی گھنٹی اس الارم کو کہتے ہیں جب جیل کے اندر بغاوت ہونے کی اطلاع جیلر یا جیل سپرینٹنڈینٹ کو دینی ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم پر پولیس کا عملہ کارروائی میں گولی چلاتا ہے اور قیدیوں کی بغاوت کو رفع کر دیتا ہے۔ آج کل پگلی گھنٹی کے ساتھ ہی ڈیوٹی پر موجود سپاہی ایک مخصوص سیٹی بجا کر بھی جیل کے اندر ہونے والی بغاوت کی اطلاع جیلر کو دیتا ہے۔

حمامہ کے شوہر عدیل احمد گاؤں میں اپنے آباد اجداد کی اراضی اور حویلی چھوڑ کر یہاں آ بسے تھے۔ آمدنی کا ذریعہ کھیتی کی زمین اور ایک باغ تھا جس سے خاصی موٹی رقم انہیں مل جاتی تھی سو بے فکری ہی بے فکری تھی۔ کسی کام سے مطلب نہ تھا۔ تاریخی کتابوں کا مطالعہ ان کا واحد شوق تھا۔ روزانہ کوئی کتاب اٹھاتے اور اپنے مکان کے باہری برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس راستے سے گزرنے والے ان سے ہی مدرسہ کالونی کا راستہ پوچھتے جو سڑک اور گور غریباں کے میدان سے جنوب مغرب کی طرف واقع تھی۔

عدیل احمد عجیب آدمی تھے۔ زبان سے راستہ نہ بتا کر عام طور پر شہادت کی انگلی اٹھا دیتے اور انگلی کا یہ اشارہ سیدھا گور غریباں کی طرف ہوتا۔ صاف پتہ چلتا کہ عدیل احمد مدرسہ کالونی کی جگہ راہ گیروں کو گور غریباں کا راستہ بتا رہے ہیں۔ کئی بار ان کی اس غلط نشاندہی پر راہ گیران سے جھگڑتے اور معاملہ طول پکڑ جاتا۔ لیکن عدیل احمد کو میں نے ہمیشہ ہی راہ گیروں کے مدرسہ کالونی کا راستہ پوچھنے پر گور غریباں کی طرف ہی اشارہ کرتے دیکھا۔

مدرسہ کالونی ابھی کچھ سال پہلے ہی شہر کے جنوب مغربی حصے میں اس جگہ بسائی گئی تھی جہاں کبھی کسی مسلم جاگیردار کا ایک وسیع اور کشادہ باغ ہوا کرتا تھا۔ جاگیر ضبط ہوئی تو کثیر العیال ''احمد شاہ جاگیردار''

کے بیٹوں نے باغ بیچ دیا اور جائیداد سے محروم ہو گئے۔ احمد شاہ کے خاندان نے تیزی سے آرہے زوال کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ بیٹے جو عموماً تعلیم سے محروم رہ گئے تھے، ادھر ادھر جا کر کچھ کام دھندہ کرنے لگے۔ بیٹیاں اپنے سے کم موقر خاندانوں میں یا تو بیاہی گئیں یا انہوں نے اپنی مرضی سے کہیں نہ کہیں ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔ چھوٹے لڑکے شاہنواز نے ''دارالسلامہ'' کے سامنے ہی ایک چھوٹی سی کپڑے کی دوکان کھول لی جس میں وہ گور غریباں میں لائے جانے والے مردوں کا کفن بھی بیچا کرتا تھا۔

صورت یہ ہوتی تھی کہ پولیس کے ملازمین خود یا مردے کے لواحقین شہر میں کافی دور واقع کپڑا بازار میں جا کر کفن خریدنے کی زحمت سے بچنے کے لیے شاہنواز کی دوکان سے ضروری کپڑا خریدتے اور مردے کو لپیٹ کر اس مقصد سے کھودے گئے گڑھے میں دبا دیتے۔ اگلے دن صبح ہونے سے پہلے ہی یہ کپڑا گڑھے سے نکل کر پھر شاہنواز کی دوکان پر آجاتا جسے وہ گاہکوں کے آنے سے پہلے ہی کوئلے والی استری سے پریس کر کے تھان جیسا بنا دیتا۔ ایک مردے کا کفن کتنے مردوں کا تن ڈھکتا اور انہی پھر ننگا کر دیتا، اس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ لیکن کئی بار بے کفن کر دیے گئے مردوں کے ہاتھ پاؤں یا سر کتوں کے بیچ کھینچے اور بھنبھوڑے جاتے ہوئے دیکھے جاتے۔

میں نہیں جانتی کہ عدیل احمد صبح سے شام تک باہر اپنی مختصر سی بیٹھک میں اکیلے بیٹھے ہوئے مدرسہ کالونی کا راستہ پوچھنے والوں کو شہادت کی انگلی سے گور غریباں کی طرف اشارہ کیوں کرتے تھے، اس سے ان کا حقیقی مقصد کیا تھا؟ میں نے یا حمامہ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لیکن کئی بار میرے سامنے بھی ایسا ہوا کہ راستہ پوچھنے والوں کے تلخ تنازعے اس مسئلے کو لے کر گھر کا سکون درہم برہم کر دیتے۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کبھی تکلف نہیں رہا کہ میری دوست حمامہ ایک خوب صورت، شائستہ اور حلیم الطبع عورت ہے۔ وہ عام طور پر پرسکون رہتی ہے اور چھوٹے متنازعہ مسئلوں میں پڑنے سے گریز کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نسبتاً زیادہ خوب صورت عورتیں عموماً خود مرکزیت کے سحر میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر محسوس کرنے لگتی ہیں کہ ان کی شخصیت بنا کسی باہری کوشش کے سبھی کی توجہ کا مرکز ہے۔ انہیں دوسروں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کے لیے کسی باہری موضوع کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ مجھے لگتا ہے کہ حمامہ بھی اسی خود مرکزیت میں گرفتار خاتون ہے اور وہ کسی طرح کے باہر جھمیلوں پر پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتی ہے یا پھر وہ اتنی گہرائی سے مسئلے کو سوچتی ہی نہیں ہے تبھی تو اس نے آج تک اپنے شوہر عدیل احمد سے اس بات پر استفسار نہیں کیا کہ وہ مدرسہ کالونی کا راستہ پوچھنے والوں کو گمراہ کیوں کرتے ہیں؟ لیکن میرا مزاج ذرا مختلف قسم کا ہے۔ میں عدیل احمد کے اس غیر اخلاقی رویہ کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب انسان کے اس منفی رویہ کی وجہ مجھے بار بار حمامہ کے گھر کھینچ لاتی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے حمامہ کے گھر کے سامنے ویران پڑے ہوئے میدان میں لاوارث مردوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ اخبار بتاتے ہیں کہ پولیس مشتبہ دہشت گردوں کو کہیں نہ کہیں آمنے سامنے کی مٹھ بھیڑ میں مار گراتی ہے۔ کئی بار یہ مشتبہ دہشت گرد پولیس سے بچ کر بھاگ نکلنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور کئی بار ہلاک ہو جاتے ہیں۔

نئے شہر میں ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے ابھی میری زیادہ لوگوں سے جان پہچان نہیں ہوئی ہے۔ اتفاق سے حمامہ اسی شہر میں ہے میرے شوہر اپنی ملازمت کے سلسلے میں جب ایک دو دن کے لیے باہر جاتے ہیں میں حمامہ کے گھر آجاتی ہوں۔ ہم دونوں اکثر

شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے چھت پر سے یہ نظارے دیکھتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم ہاؤس سے چیر پھاڑ کی گئی لاشیں جنہیں پوسٹ مارٹم ہاؤس کے فورتھ کلاس ملازم دو بانس کے ڈنڈوں پر سلے ہوئے مضبوط ٹاٹ نما کپڑے پر ڈال کر ڈھو کر لاتے ہیں اور شاہنواز کی دکان سے خریدے ہوئے کفن میں لپیٹ کر گڑھے میں دبا دیتے ہیں۔ اگلے دن کے اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ فلاں فلاں نام کے دہشت گرد پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے مار ڈالے گئے۔ مرنے والوں کی شناخت اکثر نہیں ہوتی۔ ان کی جیب سے نکلے ہوئے پرچے اس بات کا ثبوت مان لیے جاتے ہیں کہ وہ کسی خوفناک دہشت گرد تنظیم سے نہ صرف جڑے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ سرگرم کارکن بھی رہے ہیں۔ سورج غروب ہونے تک گور غریباں میں چہل پہل بنی رہتی ہے۔ کبھی کبھی رات ہو جانے پر مردوں کو دفن کرنے کے لیے ٹارچ یا لالٹین کا انتظام بھی کر لیا جاتا ہے۔ شاہنواز مطمئن ہے کہ کفن فروشی اس کے خاندان کی کفالت با آسانی کر رہی ہے۔ ہم دونوں اکثر شام کی سیاہی پھیلنے تک چھت پر کھڑے یہ نظارہ دیکھنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اب گور غریباں میں دبائے جانے والے مردے ہم پر ہیبت کا احساس طاری نہیں کرتے۔ کیونکہ روز روز دیکھتے رہنے سے یہ ہمارے روزمرہ کے مشاہدے کا حصہ بن گئے ہیں۔

'دارالسلامہ' کے سامنے میدان کے پار سینٹرل جیل سنگ دلانہ سکوت میں لپٹی ہمیں ایک ایسی تاریخ سے آشنا کراتی رہتی ہے جس نے سامراجی دور کے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ انگریز حاکموں کا اقتدار قائم ہونے کے بعد سامنے ایستادہ برگد کے پیڑ پر کئی باغیوں کو رسی سے لٹکا کر پھانسی دی گئی تھی اور یہ اسی قبرستان میں دفن ہوئے تھے۔ اس طرح گور غریباں کی تاریخ مدرسہ کالونی سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ اب پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیے جانے کا طریقہ باقی نہیں رہا۔ سینٹرل جیل کے شمالی گوشے میں ایک چھوٹا سا پھانسی گھر بنا دیا گیا تھا جس میں کبھی کبھار ہی کسی مجرم کو پھانسی دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پوری طرح شکستہ ہو گیا اور اب جو مردے گور غریباں میں لائے جاتے ہیں وہ پھانسی یافتہ نہیں بلکہ پولیس مٹھ بھیڑ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

وہ دن میرے لیے زندگی کا سب سے عبرتناک دن تھا، عدیل احمد باہر اپنی نشست گاہ میں بیٹھے تھے تب انہوں نے سڑک سے گزرتے ہوئے کسی مسافر کو راہ پوچھنے پر ایک بار پھر مدرسہ کالونی کی جگہ گور غریباں کے راستے کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیا۔ وہ مسافر اشارے کی سمت میں چلا۔ لوٹ کر آیا تو اس نے زبردست ہنگامہ کر دیا۔ عدیل احمد کسی انہونی سے بچنے کے لیے اندر آ گئے۔ کچھ دیر بعد غصے میں چیختا ہوا مسافر خاموش ہو کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ میری دوست حمامہ جس کو لے کر میرا ماننا تھا کہ اس نے کچھ لاابالی سی طبیعت پائی ہے اور وہ باہری جھمیلوں میں پڑنے سے گریز کرتی ہے اور اس معاملے میں بھی ہمیشہ خاموش رہتی ہے اس دن غصے میں آ گئی اور عدیل احمد کے سامنے کھڑے ہو کر ان کے اس رویہ پر ناراض ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

''عدیل اب میں تنگ آ گئی ہوں آپ کی اس حرکت سے۔ کیوں گمراہ کرتے ہیں راہگیروں کو؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ کسی کو گمراہ کرنا قطعاً منفی رویہ ہے۔ آپ ایک تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ اچھے خاندان کے فرد ہیں۔ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ آپ مدرسہ کالونی کا راستہ پوچھنے والے ہر شخص کو اپنا ہاتھ اٹھا کر قبرستان کی طرف اشارہ کر دیں۔ آپ راہ نمائی نہیں کرنا چاہتے نہ کریں لیکن بھٹکائیں تو نہ کسی کو۔''

حمامہ بہت دکھی ہو گئی تھی اور عدیل احمد سے اس کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ عدیل احمد کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں اور بولتے ہوئے ان کی آواز بھرا رہی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

ادب سے انتخاب

دیویاں

دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جسے عزیز رکھتے ہیں، اسے دنیا سے جلد اٹھا لیتے ہیں۔ دیویوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جس کو عزیز رکھتی ہیں، اُسے کہیں کا نہیں رکھتیں۔ خود اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ دیویوں کو عزیز رکھنے کا سودا نہیں! (رشید احمد صدیقی)

آپ کو......!

لکھنؤ کی ایک صحبت میں جب کہ مرزا وہاں موجود تھے، ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی ''اپنے تئیں'' بولتے ہیں، وہاں اہلِ لکھنؤ ''آپ کو'' بولتے ہیں، آپ کی رائے میں فصیح ''آپ کو'' ہے، یا ''اپنے تئیں''؟ مرزا نے کہا، ''فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے، جو آپ بولتے ہیں، مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں!'' (مرزا اسد اللہ خاں غالب)

''آج کسی شخص کو تاریخ کا وہ اجنبی گھڑسوار یاد نہیں جس نے لق و دق بیاباں میں ابراہیم ابن ادھم سے بستی کا راستہ دریافت کیا تھا۔ ادھم بلخ کے شاہ تھے اور انہوں نے تخت و تاج چھوڑ کر فقر اختیار کر لیا تھا۔ گھڑسوار نے بستی کا راستہ پوچھا تو ابن ادھم نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اس راستے کی طرف اشارہ کیا جو بستی کی طرف نہیں قبرستان کی طرف جاتا تھا۔ گھڑسوار لوٹ کر آیا اور اس نے ابراہیم ابن ادھم سے کرخت لہجے میں پوچھا کہ میں نے تم سے قبرستان کی نہیں بستی کی سمت دریافت کی تھی تم نے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کیوں کی؟ ابراہیم ابن ادھم نے دوبارہ بستی کے بجائے قبرستان کی طرف شہادت کی انگلی اٹھا دی۔ بس پھر کیا تھا گھڑسوار نے گھوڑے سے اتر کر ابراہیم ابن ادھم کو لات گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ مسلسل اپنی شہادت کی انگلی قبرستان کی طرف اٹھاتے رہے۔

چودہ سو سال کا عرصہ گزر گیا۔ لگتا ہے کہ ابراہیم ابن ادھم اپنے زمانے کی طرف نہیں ہمارے زمانے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تب سے اب تک کوئی یہ نہیں سمجھا کہ ابراہیم ابن ادھم کا اشارہ مستقبل کے ان دنوں کی طرف تھا جن میں ہم تم جی رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ ہمیشہ لیے دیے رہنے اور بظاہر باہری معاملات سے بیگانہ دکھائی دینے والی میری دوست حمامہ کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں اس نے گہری نظروں سے اپنے شوہر عدیل احمد کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیا آپ ابراہیم ابن ادھم کے اشارے کو سمجھ پائے عدیل؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ آپ کی رسائی بھی اس اشارے میں چھپی نصیحت تک نہ ہو سکی۔ عدیل احمد اشارے نقل نہیں کیے جاتے ان کو سمجھ کر میدان عمل میں اترنا پڑتا ہے۔''

میں نے دیکھا عدیل احمد سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے اور حمامہ وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆

ایک جنگ اور

شاهد جمیل

آج کل بد عنوانی اور بے ایمانی ہر معاشرے کا ناسور ہے۔ ہر ادارے میں میں کرپشن عام ہے۔ چپڑاسی سے لے کر بڑے عہدے دار تک ہر شخص بے ایمان ہے لیکن پھر بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کرپشن کے خلاف جنگ کر رہے ہیں

معاشرت کی بگڑتی حالات کی کہانی

سات دنوں کے اندر گھوٹالے کی انکوائری رپورٹ پیش کرنے کا حکم صادر ہوا تو اچانک میری پریشانی بڑھ گئی۔ معاملہ حساس اور سیاسی نوعیت کا تھا۔ پی اے صاحب نے مجھے فکر مند دیکھ کر بتایا کہ بندیشوری شرما گوکل ڈیہہ بلاک آفس جا چکے ہیں۔ میں نے انہیں فوراً طلب کیا۔ شرما جی نے بتایا کہ ون کرانتی ایکسپریس مناسب ٹرین ہے۔ یہ رات کے سات پچپن میں دلی سے آتی ہے۔ تلکا مانجھی جنکشن پر اتر کر وہاں سے لوکل ٹرین سے چنڈی تک جانا ہے۔ چنڈی سے گوکل ڈیہہ بیس کیلومیٹر دور ہے۔ ایک بس صبح شام آتی جاتی ہے۔ ٹم ٹم بھی چلتی ہے لیکن آپ اس سے نہیں جائیے گا۔ پہاڑیوں کے درمیان انگریزوں کا بنایا ایک خوب صورت سا بنگلا ہے۔ اسی میں گوکل ڈیہہ پر کھنڈ ہے۔

کوثر کا غصہ عروج پر تھا۔ سوٹ کیس تیار کرتے ہوئے سرکار کو بد دعائیں دے کر بھی جب اس کا جی ہلکا نہیں ہوا تب وہ بڑبڑانے لگی۔ ”جان بوجھ کر پھر جنگل میں بھیجا جا رہا ہے۔ آسام اور جموں کشمیر الیکشن میں بھی آپ کو جبراً بھیجا گیا تھا۔ اور بنے لڑاکو......

اتنی سمجھ نہیں، سینیئر سے لڑنا، دیوار سے سر ٹکرانا ہے۔ کارگر نسخہ، خوشامد۔ تھوڑی سی خوشامد اور کچھ دے لے کر بڑے سے بڑا کام نکالا جا سکتا ہے۔ کوئی ہمیں بتائے، خوشامد کون نہیں کرتا؟ کسے اچھا نہیں لگتا؟ لیکن میری بات سنتا کون ہے؟ منکوحہ ہوں نا، باندی ہوتی تو کام چھوڑنے کا خوف دلا سکتی......“

بجلی چلی گئی تو حسب معمول کوثر کا اعلان عام ہوا۔

”جو جہاں ہے، وہیں رہے گا۔“

میں بھی اسٹیچو بن گیا۔ اکثر کپ گلاس مجھ سے ہی ٹوٹے ہیں۔

کینڈل جلاتے اسے نوشے بھائی یاد آ گئے۔ و پھر بڑبڑانے لگی۔ ”ایک نوشے بھائی ہیں جو گھر یا ہ کے طعنے مہنے سن سہہ کر بھی بیوی بچوں کو خوش رکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ کتنی چالاکی سے الگ ہوئے سارا الزام گھر والوں پر لگا۔ دو سال کرایے کے مکان میں رہ کر عالی شان مکان بنوا لیا۔ لاڈلی شہلا نے ایک وقت کا کھانا چھوڑا، دوسرے دن کار کی چابی ا کے حوالے کر دی گئی......“

خلاف معمول بجلی فوراً آ گئی۔ کوثر چپ ہ

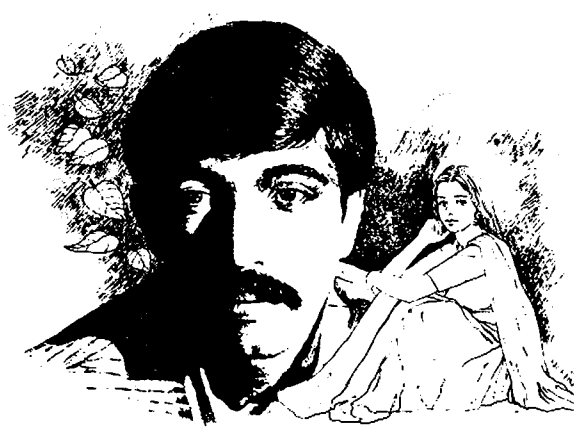

اور بیٹیاں آنگن سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے ٹارچ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے کوثر کی تلاش شروع کی۔ وہ اپنے کمرے میں نظر نہیں آئی۔ باتھ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ کچن سے کھٹ کھٹ کی آواز آ رہی تھی۔ میں قریب گیا۔ کوثر زادِ راہ رکھتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی۔ ”ان لوگوں نے تو شرط لگا دی تھی کہ شادی چھوٹی بیٹی سے کریں گے۔ اماں کمزور پڑیں لیکن ابا اڑ گئے تھے...... اپنی اپنی قسمت۔ آپا کم شکل ہو کر بھی بازی مار گئیں۔ سبزی کے لیے بھی چپراسی کو پانچ سو کے نوٹ تھماتی ہیں۔ شادی بیاہ میں قیمتی گفٹ دے کر کس ادا سے کہتیں نا بابا! مجھ سے یہ نہیں سنا جائے گا کہ ناہید نے بھی سو، دو سو روپے کا لفافہ پکڑا دیا ہے......“

بے چاری کو معلوم نہیں، سوچ کی مٹھی میں دکھ سکھ دونوں ہوتے ہیں۔ میں فی الفور جواب دے سکتا تھا۔ پھر بھی الٹے پاؤں کمرے میں لوٹ آیا۔ ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر میں خاموشی کے غار میں دبک جاتا ہوں۔ پہلی جھڑپ میں شکست کھائے مرغے کی طرح روبرو نہیں ہوتا۔

رات کے سوا گیارہ بجے چنڈی ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ دو چار مسافروں کے ساتھ ڈبے سے تھوڑی روشنی بھی پلیٹ فارم پر اتر آئی تھی۔ میں لپک کر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گیا اور اس سے ویٹنگ روم کھولنے کی گزارش کی۔ نوجوان اے ایس ایم نے سراپے کا جائزہ لے کر کہا۔

”سر! آدھی رات تو گزر چکی ہے۔ اچھا ہوگا آپ یہیں آرام کرسی پر لیٹ کر صبح کر لیں۔ وہاں بہت مچھر ہوں گے......“

بات مناسب اور مشورہ معقول تھا۔ میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

''کسی خاص کام سے ہی آئے ہوں گے؟''
اس نے پوچھا۔
''جی۔''
مختصر سا جواب دے کر میں نے سوال کے دریچے کو بند کر دیا تھا۔ پھر بھی اس نے پیش کش کی۔
''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلاتکلف کہیے گا۔''
دوران سفر میں خاموش رہتا اور میل جول نہیں بڑھاتا۔ سفر میں اپنائیت، ہمدردی اور تعاون ہی نشہ خورانی گروہ کے کارگر ہتھیار ہیں۔ سادہ لوح اور ملنسار مسافران کے آسان شکار ہوتے ہیں۔ خبریں پڑھ سن کر حساس مسافر اسی طرح کے خدشے اور خوف سے دوچار رہتے ہیں، جس طرح فرقہ وارانہ فساد کے بعد لوگ ایک دوسرے کی گلی محلوں سے گزرتے وقت۔
میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے نوجوان خاندانی لگا۔ وہ بھی مجھے اہم سمجھ رہا ہے۔ میں پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ اے ایس ایم آفس میں ہوں۔ خوف زدہ ہونے کی بات نہیں۔ منزل نادیدہ ہو تو سفر پوچھ پوچھ کر ہی طے کی جاتی اور ضرورت زبان کھولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے التجا کی۔
''بلاک آفس جانا ہے۔ بس کے متعلق ضروری جانکاری دے سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''
اس نے تپاک سے کہا۔
''بم بھولے بس، دو کھیپ لگاتی ہے۔ صبح آٹھ بجے آتی اور نو بجے لوٹ جاتی ہے۔ پھر شام پانچ بجے آ کر چھ بجے لوٹتی ہے۔ اس طرح دونوں جانب سے آنے جانے والوں کو صبح اور شام کا وقت مل جاتا ہے۔ یہ وقت ٹرین سے بھی میل کھاتا ہے۔ لیکن سڑک بہت خستہ ہے...... ٹم ٹم کا سفر مناسب نہیں۔''
اطمینان نصیب ہوا تو تھکا جسم گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ڈھیلا پڑنے لگا۔ تیسرے پہر نے ماں کی طرح باہیں پھیلا دیں اور میں ان میں سما گیا۔
نہ جانے کب سے کھڑی مال گاڑی ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی۔ ڈھنمناتے ڈبے کی بے ہنگم کرخت آواز میں بریک سے جکڑے چکے کی سسکاری بھی شامل تھی۔ میری نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے بھی وعلیکم السلام نکل گیا۔ اس کا چہرہ کنول کی طرح کھل اٹھا اور مسرت، ترنگوں کی طرح میرے دل میں پھیلنے لگی۔ اس کی قیافہ شناسی متاثر کن تھی۔
''بہت تھکے تھے، اسی لیے دانستہ چھوڑ دیا تھا...... میرا نام اخلاق احمد خاں ہے۔ میں ایسٹ چمپارن کا رہنے والا ہوں۔'' اس نے اپنائیت سے پر لہجے میں کہا۔
کف کے اندر گھسی گھڑی نکال کر دیکھنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔
''ابھی وقت ہے، فریش ہولیں۔ ویٹنگ روم کی صفائی کرادی ہے......''
وہ چابی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر میرا عقیدہ اور بھی راسخ ہو گیا کہ آدمی پیدائشی نیک طینت، ملنسار و معاون ہوتا ہے۔ وہ بڑھے ناخن کو تراش لیتا ہے کہ وہ تشدد و تعدی کے لیے اکساتے ہیں۔ نیک جذبے خودرد پودوں کی طرح دل میں اگتے اور بارآور ہوتے ہیں۔ مذہبی، علاقائی اور ملکی رشتے دوب کی طرح ذرا سی نمی پا کر لہلہا اٹھتے ہیں۔
انتظام تازہ تھا۔ فنائل کی بو تیز تھی۔ صابن کی نئی ٹکیہ کے ساتھ شیمپو کا منی پاؤچ بھی رکھا تھا۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تھے، جن میں چوکنی مکڑیاں اور کیڑے مکوڑوں کی جھولتی کھوکھلی لاشیں تھیں۔ چھپکلیاں گھڑیال سی بے خوف پڑی تھیں۔ اینٹ گھسا کر روشندان کو بند کر دیا گیا تھا۔ ناکارہ فلش کے اوپر بنا مینے کا گھونسلہ ویران تھا۔ مستقل بند کھڑکی پر نیم سوختہ آنسو بہائے انگلی بھر لمبا کینڈل سر کٹے بت کی طرح ایستادہ تھا۔ رفع حاجت کے دوران سامنے کی دیوار پر انسان و حیوان کے اختلاط کی تصاویر بنا کر منچلوں نے فحش جملے بھی رقم کر دیے تھے۔ پلاسٹک کی گھناؤنی بالٹی، موبل کا سربریدہ ڈبہ، ہینڈل ٹوٹا جگ اور کونے میں پیک وکھینی کی غلاظت کے داغ

دھبوں سے شدید کراہیت پیدا ہوئی تھی۔ کسی طرح ضروریات سے فارغ ہو کر میں لوٹ آیا۔
اخلاق احمد میرا منتظر تھا۔ اس نے بغل میں ایک کرسی لگا رکھی تھی۔ اس پر بیٹھتے ہی سرکاری کاغذ پر رکھے سوکھے ناشتے کو میری جانب کھسکا کر اس نے کہا۔
''اماں ڈانٹ ڈپٹ کر رکھوا دیتی ہیں...... بہن کے ہاتھوں کا بنا ہے۔ ابا کے انتقال کے بعد اماں نے باورچی خانے میں قدم نہیں رکھا۔ لیکن ان کی ناک بڑی حساس ہے۔ کہیں بھی ہوں، ہدایات دیتی رہتی ہیں۔ مسالہ تیار ہو گیا ہے۔ اور بھنو گوشت کو۔ گیس نکال کر کوکر بند کر دو، پلاؤ کی کنی ختم ہو جائے گی۔ گرم مسالوں کا وہ خوب استعمال کرتی تھیں۔ ایک دن سالن میں مزا کم ہونے کی شکایت پر انہوں نے ابا سے کہا تھا لذت گرم مسالوں سے ہی بڑھائی جاتی ہے۔ مجھے پچیس پچاس گرام کی پڑیوں کو مہینے بھر چلانا پڑتا ہے۔ خدا کی مار پڑے مہنگائی پر۔ بے چارے غریب غربا تو ڈاکٹر کی سخت ہدایت پر مریض کو دو چار دن پھل دودھ چکھا دیتے ہیں۔''
تصور کی بالکونی پر کوثر آ کھڑی ہوئی۔ میٹھا مجھے پسند ہے۔ اس نے زادِ راہ میں بیسن کا لڈو اور انڈے کا حلوا بھی دیا ہے۔ وہ سب کی پسند، ناپسند کا خیال رکھتی ہے۔ صدف کو مرغ، بیگن، کدو پسند ہے تو فلک کو مچھلی، نوا، بھنڈی۔ مجھے کریلا، کٹہل، کیلا، مونگ کی بھنی دال، ساگ اور چٹنی پسند ہے اور الماس کو صرف گوشت، مچھلی اور انڈا۔ کوثر حکمت لگا کر سب کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے۔
اچانک مجھے گزشتہ رمضان یاد آ گیا۔ بیس تاریخ کو عید تھی۔ اگر پچیس چھبیس کو پڑ جاتی تو سرکار پیشگی تنخواہ کا اعلان کر سکتی تھی۔ ایک نئے لون کی قسط بھی شروع تھی۔ کام چلاؤ خریداری کی پیشکش پر کوثر اپنی قسمت کو کوسنے لگی تھی۔ اگلے سال کی یقین دہانی پر تو وہ بھڑک اٹھی تھی۔ حالات بگڑتے دیکھ کر میں گھر سے باہر نکل گیا کہ بک بول لینے سے اس کا جی ہلکا ہو جائے گا۔ میں کچھ دیر تک دروازے پر ہی کھڑا سوچتا رہا کہاں جاؤں؟ مجھے معلوم ہے، دل برا ہو تو شفق سیاہی مائل لگتی، دھبے میں چاند نظر آتا اور کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اندھیرے کمرے میں لوٹ کر میں لیٹ گیا تھا۔ کوثر مجھے غیر موجود سمجھ کر خود کلامی کرنے لگی۔
''میں بھی پاگل ہوں۔ چاہتی ہوں نوشے بھائی جیسا بن جائیں۔ ہر انسان کی سوچ الگ اور جینے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ کوثر بیگم! کیا یہ کم ہے؟ ایک ایماندار افسر کی بیوی کہلاتی ہو اور سماج میں مخصوص عزت پاتی ہو......''
پھر اس نے بیٹیوں کو پھٹکارا۔
''کیسی ہو تم سب؟...... چپ نہیں کرا سکتی تھی مجھے؟ الماس! تم نے بھی پاپا کو نہیں روکا۔''
وہ متفکر لہجے میں بولی۔
''خدا جانے کہاں نکل گئے؟ کب لوٹیں گے؟ کھانا لگانے جا رہی تھی......''
معیادی بخار والے دن بھی اچھے گزرے تھے۔ گھریلو کام کاج ٹھپ۔ بھنورے کی طرح وہ پھیرا لگا جاتی تھی۔ کبھی پیشانی پر تو کبھی بنیان کے اندر ہاتھ گھسا کر سینے پر رکھے رہتی۔ ایک بار بچوں سے نظریں بچا کر تپتے گال پر رخسار رکھ کر کہا تھا۔
''توا کی طرح گرم ہے۔''
پھر اسے سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر اور دواؤں پر غصہ آ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔
''منا بھائی، ایم بی بی ایس ہوگا موا...... یا پھر کیپسول میں ہی ستو بھرا ہے......''
کوثر مجھے بھی دوا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی۔ پہلے ہاتھ میں پانی بھرا گلاس پکڑاتی۔ پھر وہ منہ میں دوا رکھتے ہی بلند آواز میں 'کافی اللہ شافی اللہ' کا ورد کرنے لگتی۔ وہ اکثر کہتی ہے۔
''دوا میں کیا رکھا ہے۔ شفا تو اللہ دیتا ہے......''
اخلاق شرمسار نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
''آپ نے تو حلوا چکھا ہی نہیں؟ پرانا نہیں، دو دن قبل گھر سے آیا ہوں۔ معاف کیجیے گا، میں بھی کیا

کیا بتانے لگا؟ ناشتا کرتے وقت اکثر مجھے گھر والے یاد آنے لگتے ہیں۔"

کوثر ذہن کے اوٹ میں چلی گئی۔ جھینپتے ہوئے میں نے حلوہ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ کر سوچا۔ پردیسی کے دل میں گھر آباد رہتا ہے اور گزرے دن عجائب گھر کی نادر چیزوں کی طرح دلکشی نہیں کھوتے......

بس اسٹینڈ جاتے وقت جب میں نے اسے مڑ کر دیکھا تب وہ گرم جوشی سے ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک میں اس کی حد نگاہ میں رہا۔ اپنائیت کا یہ جذبہ سون ندی کے بالو میں موجود سونے کے ذرے کی طرح چمکنے لگا۔

بس اسٹینڈ پر بھیڑ دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ ایک پان دکاندار سے دریافت کرنے پر اس نے کہا۔

"بس بارات لے کر کہیں گئی ہے۔ کل شام نہیں آئی تھی۔ آج دیر سویر جرور آئے گی۔ جگہ مل جائے اس کی چنتا کیجیے سریمان!"

اس جانکاری سے تھوڑی راحت ملی۔ لیکن جگہ حاصل کرنے کی فکر بڑھ گئی۔ وقت گزارنے کے لیے میں ٹہلتا ہوا مشاہدہ کرنے لگا۔ ایک بوڑھی عورت جھولا پکڑے بیٹھی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ مرغی جھولے سے باہر سر نکالے منہ کھول کر زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ ایک ہوٹل کے سامنے دو تین کتے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک زخمی تھا، جس کی گردن کا ناسور رس رہا تھا۔ کیڑوں اور مکھیوں سے وہ بےکل تھا۔ اسے کہیں بھی زیادہ دیر تک ٹکنے نہیں دیا جاتا۔ بغل والے چائے دکاندار نے جب اس کے کولہے پر گرم پانی پھینک کر بھگایا تب ایک بوڑھے نے بھی لاٹھی دکھا کر اسے دھتکارا۔ وہ پھر آ کھڑا ہوا۔ یقیناً وہ زیادہ بھوکا ہوگا۔ ہوٹل والے کی پالتو بلی ٹیبل کے نیچے گرتے جوٹھن کو ٹہل ٹہل کر کھا رہی تھی۔ گولر کے پیڑ کے نیچے مجمع لگائے ایک سپیرا، سانپ اور نیولے کو لڑنے کے لیے اکسا رہا تھا۔ دونوں لڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن تماش بین لڑائی دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ پیپل کے چھتنار پیڑ کے نیچے بیٹھے چند لوگ جوا کھیل رہے تھے۔ دو چار بچے مندر کے چبوترے پر کھڑے ہو کر انہیں بغور دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکا اپنی بکری کو کٹہل کا پتا کھلا رہا تھا۔ ٹم ٹم میں جتے زخمی مریل گھوڑے گردن سے جھولتے خالی توبڑے سے نجات پانے کے لیے بار بار سر جھٹک رہے تھے......

اچانک شور بلند ہوا۔ دھول اڑاتی، ڈولتی، رینگتی بس کو آتے دیکھ کر مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ اسٹینڈ پر بس لگانے سے قبل مسافروں نے ہلا بول دیا۔ زور آزمائی شروع ہوگئی۔ میں گھبرا کر دور جا کھڑا ہوا۔ لیکن بس چھوٹ جانے کا یقین ہوتے ہی میں بھی بھیڑ چیرتا، سوٹ کیس کھینچتا اور تھرمس بچاتا ہوا پشت کی جانب بڑھنے لگا۔ پچھلے چکے کے اوپر بنے دو سیٹا کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک زوردار دھکا کھا کر اسی پر لڑھک گیا۔ سیٹ پر کسی نے ایک گچھا پھینک رکھا تھا۔

ڈرائیور بس کا انجن اسٹارٹ چھوڑ کر کود گیا۔ بہت دیر کے بعد وہ آیا اور زور زور سے ایکسیلیٹر دبا کر چھوڑنے لگا۔ دھول آمیز ڈیزل کے بدبودار کالے دھوئیں سے بس میں سوار مسافروں کے دم گھٹنے لگے۔ اس نے دو چار مسافروں کو جبراً کیبن میں ایڈجسٹ کر کے شنکر بھگوان کو دیکھا۔ ان کا چہرہ اداس اور گرد آلود تھا۔ پھر اس نے پاس پڑے چکٹ صافی سے دھول اڑا کر باسی مالا کو بدلا، اگر بتی جلا کر کھونسا اور لیموں مرچ کی سوکھی لڑی کو نوچ کے تازہ لڑی لٹکا کر شنکر بھگوان کو پرنام کیا۔ شیشے پر چونے سے ۷۸۶ لکھا تھا۔ بجرنگ بلی، عیسیٰ مسیح اور سائیں بابا کی تصویر سے ہٹا کر کاجول اور شاہ رخ خان کی تصویر لگائی گئی تھی۔ گیٹ پر لکھا تھا 'لٹک مت، پٹک دوں گی / اندر آ جا، جگہ دوں گی' اور انجن کے ڈھکن پر لکھا تھا۔ 'میں ہوں مزاج گرم مجھ پر نہ رکھنا پیر / نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے بیر'

بس رینگنے لگی تو کسی طرح گردن نکال کر ایک

مزدور نما شخص مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سرجی! جرا سا......" اس نے گھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

گچھا والا سمجھ کر اسے گھسنے میں مدد دیتے ہوئے میں نے سوچا۔ اب دوسرا بھی آتا ہی ہوگا......

بس رینگنے لگی تو چکے میں لگے موٹے گیئس، لوز اسپرنگ اور اور لوڈنگ کے سبب چکہ مڈگاڈ سے ٹکرانے لگا۔ رفتار بڑھی تو کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتا چکا، ہتھوڑے کی طرح کمر پر ضرب لگانے لگا۔ جب بس رفتار پکڑتی تب کھٹ کھٹ کی آواز پتھر توڑتی کریشر مشین کی آواز میں تبدیل ہو جاتی۔ لیکن جب بھی رفتار کمزور پڑتی تب کمر پر طبق کوٹے جانے کا احساس ہوتا۔ سیٹ مل جانے کی خوشی کافور ہوگئی۔

بغل کے ہم سفر نے مانگ کر کھینی کھائی اور دودھ پلاتی ایک کم سن عورت کے نیم عریاں پستان کو کئی بار گردن گھما کر دیکھا تھا۔ اب سڑک زیر تعمیر مندر پر نظر پڑتے ہی اس نے ہنومان جی کو پرنام کیا۔ پالنا میں جھولتے بچے کی طرح اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے کئی بار جماہی لی، جسم کو آڑا ترچھا کر کے سامنے والی سیٹ کے نیچے پاؤں گھسایا پھر گھڑکی اور پشت سے بنے زاویے میں سر پھنسا کر اس نے آنکھیں موندلیں۔ وہ چند منٹوں میں ہی ماں کی چھاتی سے لگے بچے کی طرح سو گیا۔ کھینی کے ٹکڑے پھول کر نیم وا ہونٹوں سے پھسلنے لگے تھے۔ اچانک لار کا ایک قطرہ ٹپکا اور بازو پر گر کے لڑھک گیا۔ ہونٹ اور کپڑے سے ہم رشتہ لار کے تار پر جب بھی کرن پڑتی، وہ چمکنے لگتا۔

مسافروں کو اتارتی، سوار کرتی ہوئی بس حسب معمول چل رہی تھی۔ ایک بڑے سے گڈھے کو پار کرتے وقت بس بائیں جانب کچھ زیادہ جھکی تب ایک دھماکہ ہوا۔ کھڑے مسافر لڑھک پڑے۔ میں بغل والے کی آغوش میں جا سمایا۔ لوگ دھڑا دھڑ اترنے لگے۔ مسافر بلا احتجاج سامانوں کو سر، کندھوں پر ڈال کر اور ہاتھوں میں لے کر چل دیے۔ پڑوسی مسافر بھی گچھا اٹھا کر اگلی سیٹ کو پھلانگ کر اتر گیا۔

کھینی کا ملبہ گریبان کے اندر گھس کر جب برساتی کیڑے کی طرح ذہنی کلفت بڑھانے لگا تب میں نے رومال کو دستانے کی طرح پنجے میں پھنسا کر ہاتھ بنیان کے اندر گھسایا۔ پھر چٹکی سے لونڈے کو پکڑ کے آس پاس کے حصوں کو پوچھا اور ہاتھ سیٹ کے نیچے لے جا کر رومال چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا۔ بس ضرور کسی باہو بلی کی ہے یا پھر یہاں کے لوگوں میں احتجاج کی چنگاری بھی نہیں۔

خلاصی اسکرو ڈرائیور سے چکے کو ٹھونک بجا کر دیکھتے ہوئے غصے کو اگلنے لگا۔

"بہنچو! نچنیا اور بینڈ باجے والے کو چھت پر چڑھا دیا تھا...... اسٹپنی بھی گیا...... کھیل کھتم، پیسہ ہجم...... ہاہا...... ہاہا...... جا، بڑھا کے......"

بس کو دو تین بار تھپ تھپا کر وہ املی کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر پسینے پوچھنے لگا۔ ڈرائیور بس سے کود کر اترا۔ پھر وہ پیشاب کر کے خلاصی کو ساتھ لے کر گجور بنے کی طرف چل پڑا۔

جب بس خالی ہوگئی تب میں بھی بلائے ناگہانی کا سامنا کرنے اتر گیا۔ بغل والے نے لپک کر اردلی کی طرح ہاتھ سے سوٹ کیس اور تھرمس لیتے ہوئے کہا۔

"چلیے سرجی! پہنچا دیتا ہوں...... ادھر ہی جانا ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

جادا دور نہیں، دو کوس سے بھی کم بچا ہے۔ پگڈنڈی سے چلیں گے تو ایک کوس ہی پڑے گا......"

اس کی آفر اچھی لگی۔ جانکاری سے قدرے راحت ملی اور اس کے خلاف ابلتا غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

پہلے اس نے گچھا کا مریٹھا بنا کر سر پر رکھا۔ پھر بریف کیس کو سر پر اور تھرمس کو بغل میں لٹکا کر وہ سڑک چھوڑ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس کی رفتار تیز تھی۔ لیکن جب فاصلہ بڑھ جاتا تب وہ کھڑا ہو کر

انتظار کرنے لگتا۔ ایک چاپاکل کے نزدیک اس نے سوٹ کیس اور تھرمس کو صاف ستھری جگہ پر رکھ کے پہلے خوب پانی بہایا۔ پھر نل کے منہ کو دھویا۔ جب میں قریب پہونچا تب اس نے التجا کی۔

”سر جی! تھوڑا پانی پی لیں...... ابھی اور چلنا ہے......“

اسے نل سے پانی بہاتے دیکھ کر ذہن میں مڈل اسکول رقص کر گیا۔ لنچ بریک میں نل پر دھکا دھکی شروع ہو جاتی تھی اور اسی طرح پانی بہایا جاتا تھا۔ بچے باری باری ایک دوسرے کو پانی پلاتے تھے۔ جب کوئی شرارتاً آخری چلو پانی دوستوں پر اچھال دیتا تب چالاک بچہ بھگدڑ کا فائدہ اٹھا کر نل سے پانی پینے لگتا تھا۔ گرمی کے موسم میں نل کے آس پاس برنیاں اور مدھو مکھیاں اڑتی رہتی تھیں۔ پانی پیتے وقت برلی کے جسم کا پچھلا حصہ دھونکنی کی طرح پھولنے پچکنے لگتا تھا۔ اس نے مجھے گم صم کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

”سر جی! تھرمس کے ڈھکن میں پانی دوں؟“

میں، ماضی سے حال میں لوٹ آیا اور فوراً اوک سے پانی پینے کے لیے نل پر جھک گیا۔ وہ ہینڈل کو اوپر اٹھا کر ہلکے دباؤ کے ساتھ نیچے دباتا۔ پانی لوٹے کی دھار کی طرح چلو میں گرتا۔ احتیاط کے باوجود پانی ناک میں گھس جاتا۔ جوتے، پینٹ کی مہریاں اور آستینیں تر ہو گئیں۔ ناک میں بھی جلن ہونے لگی تھی۔ اس نے بڑے بزرگ کی طرح تسلی دے کر مشورہ دیا۔

”کوئی بات نہیں، سوکھ جائے گا۔ منہ ہاتھ بھی دھو لیں سر جی!“

جب میں فارغ ہو گیا تب اس نے پہلے ہاتھ اور منہ دھویا۔ پھر بائیں ہاتھ سے نل کا منہ بند کیا اور دو چار زوردار ہاتھ چلا کر منہ ہتھیلی سے ہٹا کر سوں، سوں کی آواز نکالتے ہوئے خوب پانی پیا۔ پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جانگھ تک پاؤں کو دھویا، آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مارے، چہرہ خشک کیے بغیر سوٹ کیس کو سر پر رکھا اور تھرمس کو کندھا میں لٹکا کر دو

پگڈنڈی پر آ گیا۔

میلہ جاتے بچے کی طرح وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ آم کے ایک باغ سے گزرتے ہوئے اس نے بوڑھے رکھوالے کو مخاطب کیا۔

”جے شری رام کاکا!...... بڑا اچھا ہے۔ دن بھر کھوب آم چوسو...... یہ نہیں کہ......“

بوڑھے نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر چوکی کے اوپر نیچے رکھے آموں کو دیکھا۔ پھر چن چن کر دو چار اچھے اور پکے آموں کو اسے دیتے ہوئے کہا۔

”لے لو، تم بھی کھا لینا...... یے ساہب کون ہیں؟“

”بڑے ساہب ہیں...... راجدھانی سے آئے ہیں اور پھس چیکنگ کرنے......“

گمچھا میں آم باندھتے ہوئے اس نے بتایا۔

اس کی قیافہ شناسی پر میں ششدر رہ گیا۔

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر مجھے ”رام رام“ کہہ کر عاجزی سے پوچھا۔

”ہوکم ہو تو ہجور کے لیے بھی بھجوا دوں؟“

”نہیں، نہیں......“

میں تیز قدموں سے میں آگے بڑھ گیا۔

سر جی! بڑا نیک آدمی ہے۔ بھجکا آم گریب بچوں میں بانٹ دیتا اور کھانے لائک کو گھر لے جاتا ہے۔ چوا آم کھراب تھوڑے ہی ہوتا ہے......“ اس نے کہا۔

دفتر کھلا تھا۔ بی ڈی او کے چیمبر میں داخل ہو کر اس نے سوٹ کیس اور تھرمس کو ٹیبل پر رکھا پھر صاف ستھری ایک کرسی کو گمچھا سے صاف کر کے بولا۔

”بیٹھیے سر جی! بڑا بابو کو کھوج کر لاتا ہوں......“

اس کے نکلنے سے قبل ایک ادھیڑ عمر شخص داخل ہوا اور فرشی سلام ٹھونک کر بولا۔

”مجھے پتا ہے، حضور کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے...... خدا گواہ ہے، بندہ مجبور تھا۔ حاکم کی منجھلی بیٹی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور انہیں شہر جانا پڑا ورنہ ریلوے اسٹیشن پر حاکم کے ساتھ خاکسار کو بھی

سواری کے ساتھ منتظر پاتے...... بس کی خرابی کا پتا چلتے ہی موٹر سائیکل سوار کو بھیجنے نکلا ہی تھا کہ......“

بات نامکمل چھوڑ کر وہ میرے ہم سفر سے مخاطب ہوا۔

”چل ہریا!...... حاکم والے کمرے میں...... تیری قسمت پر مجھے رشک آتا ہے۔ تجھے حضور کی خدمت کا موقع مل گیا...... یہ میرے نصیب میں نہ تھا......“

کمرہ عمدہ اور آراستہ تھا۔ ضروریات کی تقریباً تمام چیزیں موجود تھیں۔

”غسل کروں گا......“ میں نے اطلاعاً کہا۔

ہریا ہاتھ جوڑ کر جانے لگا، تب میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اسے رکھ لو...... بچوں کے لیے لیتے جانا......“

بڑا بابو لپک کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

”اس کی یہ مجال کہ محنتانہ وصولے۔ حضور کی خدمت تو ہم سب پر فرض ہے...... اور یہ تو بلا نوکری آفس کے ہی ٹکڑوں پر ایک بڑے کنبے کو پال رہا ہے۔“

پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”کھڑا کیوں ہے؟“

ہریا چابی والے کھلونے کی طرح چل پڑا۔

بڑا بابو کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ لپک کر برآمدے میں گیا اور جاتے ہوئے ہریا کو روک کر دبی زبان میں وہ حکم صادر کرنے لگا۔

”تھوڑی دیر میں ایک پھیرا لگا جانا، خاص کام ہے...... اور کل ذرا سویرے چہرہ دکھانا۔“

بڑا بابو تیز قدموں سے لوٹ آیا اور ملتجی لہجے میں بولا۔

”گیلے کپڑے حمام میں ہی چھوڑ دیجیے گا...... حضور کو کمرے سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

بڑا بابو اجازت لے کر کمرے سے نکل گیا۔ پھر اس کی پھٹکار سنائی دینے لگی۔

”سورین!...... سورین! ابے کہاں مر گیا؟ کام چور، نوکری مستقل ہوتے ہی چال ڈھال بدل گئی...... کل تک میرے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور آج مجھے دوڑانے لگا ہے......“

اب وہ ہدایات دے رہا تھا۔

”تیری ڈیوٹی آج رات نو بجے تک اور صبح پانچ بجے سے...... بڑے صاحب کو ہر حال میں خوش رکھنا ہے...... نہیں تو......“

مجھے غسل کی جلدی تھی۔ حمام میں گھس گیا۔ تین بار صابن لگا کر غسل کرنے پر بھی کراہیت سینے سے چپکی رہی۔

دن بھر آگ اگلنے والا سورج میدان چھوڑ چکا تھا۔ پرندے بسیرا کے لیے لوٹ رہے تھے۔ لوٹتے مویشیوں کے گلے میں بندھے گھنگھروؤں کی مدھم آواز میں گھنٹی کی آواز تیز تھی۔ ایک بچہ بھینس کی پیٹھ پر بیٹھا بانسری بجانے میں مگن تھا۔ ایک ہاتھی جھومتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر ٹہنیاں لدی تھیں۔ مہاوت بار بار اس کے کانوں پر لات مار رہا تھا۔ اشوک کے پیڑ پر گوریا ئیں شور مچا رہی تھیں۔ پہاڑوں کی ہریالی سیاہی مائل ہونے لگی تھی۔ غسل نے بھوک کی شدت بڑھا دی تھی۔ پرکشش مناظر کے باوجود میں کمرے میں لوٹ آیا۔

مجھے ناشتہ کرتے ہوئے دیکھ کر بڑا بابو چکرا گیا۔ وہ فوراً پاؤں پکڑ کے بیٹھ گیا۔ پھر وہ سر کو پاؤں سے رگڑتے ہوئے بولا۔

”حضور! حاکم ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر خطا ہو گئی ہو، تو بندہ دست بستہ معافی کا مطلب گار ہے۔ رحم کیجیے بندہ پرور!...... رحم...... رحم......“

اس کی اداکاری پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”یہ کیا؟ پاؤں چھوڑیے......“

وہ فوراً ہاتھ جوڑے کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم لرزہ براندام اور آنکھیں نم تھیں۔ میں نے ترش لہجے میں پوچھا۔

”کیا نام ہے؟“

’’حضور! غلام کا نام تو راما اوتار ہے...... لیکن سبھی بڑا بابو کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں......‘‘

’’اچھا! تو آپ ہی بڑا بابو کے عہدے پر فائز ہیں؟‘‘

’’جی نہیں۔ فی الحال پر بھاری ہوں......‘‘

’’اصل عہدہ؟‘‘

’’یو۔ڈی۔سی......‘‘

’’یہاں کتنے دنوں سے ہیں؟‘‘

’’فقط دس برسوں سے......‘‘

’’کبھی ٹرانسفر نہیں ہوا؟‘‘

’’کئی بار ہوا حضور!‘‘

’’پھر لوٹ آئے؟‘‘

’’نہیں حضور! جانے کا سوقع ہی نہیں ملا......‘‘

’’یعنی؟‘‘

’’حاکم لوگ ہی اسٹے آرڈر لے آتے ہیں......‘‘

’’آپ ان لوگوں کے من مطابق کام کرتے ہوں گے؟‘‘

’’اس میں تو کئی شک نہیں......‘‘

’’اردو خوب بولتے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا......‘‘

وہ قطع کلام کرتے ہوئے لہک کر بولا۔

’’حضور! فیض آبادی ہوں نا...... اجداد فارسی کے عالم تھے۔ میری تعلیم بھی مکتب سے شروع ہوئی افسوس! میرے بچے اردو سے بھی نابلندرہ گئے۔‘‘

میں نے طنزاً کہا۔

’’زیادہ افسوس نہ کیجئے۔ آج اردو کی روٹی کھانے والوں کے بچے بھی اردو سے نابلد ہیں۔‘‘

پھر تفنن طبع کے لیے پوچھا۔

’’فیض آبادی صاحب! شعروادب سے بھی شغف رکھتے ہی ہوں گے؟‘‘

’’جی حضور! بے روزگاری کے زمانے میں خادم فیض آبادی کے نام سے شاعری کرتا تھا۔ مقامی اخبار میں چند کلام شائع بھی ہوئے تھے۔ لیکن نوکری میں آتے ہی عدیم الفرصت ہوگیا۔ حضور! اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ احقر، کرم کو ہی دھرم سمجھتا اور وفاداری کو جزو ایمان۔ اکبر الٰہ آبادی میرے آئیڈیل ہیں۔ ان کے ایک شعر نے ہی میری زندگی کا رخ بدل دیا ہے۔‘‘

میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

’’مجھے بھی تو سنائیے وہ شعر۔ ہوسکتا ہے میری زندگی میں بھی کوئی انقلاب آجائے۔‘‘

’’ملاحظہ کیجیے حضور!

نہ اف کیجئے نہ بٹ کیجئے جو افسر کہے جھٹ کیجئے‘‘

بڑا بابو نے بلیغ پیرائے میں عندیہ پیش کر دیا تھا۔

تلملا کر میں نے اسے بیسن کا لڈو پکڑاتے ہوئے کہا۔

’’اب اسے چکھ لیجیے نا بابا، نامت کیجیے۔‘‘

پھر میں نے سخت ہدایتی لہجے میں کہا۔

’’کان کھول کر سن لیں۔ دوران تفتیش میں اپنا کھانا کھاتا ہوں۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ آپ آفس کے روح رواں اور بے حد سمجھدار ’’پر بھاری بڑا بابو‘‘ ہیں۔ امید ہے انکوائری میں ضروری تعاون کریں گے۔ سمجھ گئے؟‘‘

لڈو بڑا بابو کے گلے میں پھنس گیا۔ وہ اسے بمشکل حلق کے نیچے اتار کر بولا۔

’’حضور! عشائیہ کا انتظام خاکسار نے اپنے طور پر کیا ہے......‘‘

’’کہہ دیا نا۔‘‘ میں نے ناگواری ظاہر کی۔

’’دو چار قسم کا آم ہے، اجازت ہو تو صرف دہی......‘‘ وہ ہمت یکجا کر کے بولا۔

’’آپ نہیں مانیں گے؟‘‘ مجھے غصہ آنے لگا۔

چالاک ماہی گیر ہے۔ جال خوب گھما کر پھینکتا ہے۔ چھوٹی مچھلیوں کو بھی نہیں چھوڑتا ہوگا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ بڑا بابو نے لہک کر پوچھا۔

’’حضور! اب چائے پیش کروں؟‘‘

’’کیجیے۔‘‘ جان چھڑانے کے لیے میں نے کہہ دیا۔

’’بہت، بہت شکریہ حضور! پلک جھپکتے میں حاضر ہوتا ہوں......‘‘

وہ خوش ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

چائے پی کر میں اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

بی ڈی او اور متعلقہ کلرک دانستہ غائب تھے۔ معلوم ہوا

کہ ڈی ڈی سی منتری جی کے بلاوے پر ہیڈ کوارٹر گئے ہیں۔ میں نے سوچا۔ بڑا بابو ہی ترپ کا پتا ہے۔ اسے ہی چارے کے طور پر استعمال کرنا ہوگا۔ میں نے فی الفور حکمت عملی بدل دی۔

بڑا بابو نے عشائیہ کا عمدہ اہتمام کیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کو سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ بھانت بھانت کی ڈشیز، کسی بھی شخص کے دل کو نرم اور خوشبو، اشتہا کی لو کو تیز کر دیتی۔ میں نے رسماً کہا۔

’’بڑا بابو! آخر آپ نہیں مانے......‘‘

’’حضور! خاں صاحب کے آنسو نے مجھے......‘‘ وہ چپ ہوگیا۔

’’خاں صاحب؟...... کیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جی حضور! خاں صاحب نے بیوی بچوں کی مدد لے کر بڑی محبت و عقیدت سے کھانا تیار کیا تھا۔ میں نے جب دسترخوان لگانے سے انہیں منع کیا تب ان کے آنسو رواں ہوگئے۔ انہیں آنسو بہاتے دیکھ کر بیوی بچے بھی سسکنے بلکنے لگے کہ ساری محنت اکارت گئی۔ حضور! ان کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ داد و بخشش کی تمنا تو خودرو پودوں کی طرح ہر دل میں اگتی ہے۔ حضور! جو سزا تجویز کریں...... بندہ کو سر افگندہ پائیں گے......‘‘

بڑا بابو اقبالیہ مجرم کی طرح سر جھکا کر ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔

وہ مجھے پس و پیش میں گرفتار دیکھ کر بولا۔

’’گستاخی معاف! بزرگوں سے سنا ہے، ہر رزق پر کھانے والا کا نام لکھا ہوتا ہے۔ حضور دانشور ہیں...... کفران نعمت......‘‘

حکمت عملی کے تحت شطرنج کی بساط پر شہہ، پیادے سے مات کھا گیا۔ ساتھ کھانے کی پیشکش کو بڑا بابو خوبصورتی سے ٹال گیا۔

’’میری مجال، حضور کی ہمسری کروں؟ ذرہ، آفتاب نہیں ہوسکتا۔ بھلا میں حاکم کی جگہ کیسے لے سکتا؟ لیکن حکم عدولی بھی نہیں کرسکتا۔ صرف ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل کر لیتا ہوں...‘‘

وہ بغل کی کرسی پر بیٹھ کر کبھی التجا اور کبھی ضد کر کے مجھے کھلانے لگا۔

بڑا بابو شاطر حجام کی طرح اہم جانکاریاں منتقل کرتے ہوئے مجھ پر نفسیاتی دباؤ بنانے لگا۔ بی۔ ڈی۔ او کی مدح سرائی کرتے ہوئے اس نے مجھے جانکاری دی کہ حاکم مشہور سماج سیوک شری گنیش ترپاٹھی کے بیٹے ہیں۔ مذہبی کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور کئی مہا یگیہ کرا چکے ہیں۔ ان کے خسر بھارت سرکار میں کابینہ وزیر کا پی۔ ایس ہیں...... حاکم کو کاسٹ لائن پر ٹنگ کیا جارہا ہے......

میری دانستہ خاموشی سے شہہ پاکر بڑا بابو بیباکی سے بولنے لگا۔

’’حضور! کون نہیں جانتا کہ منصوبوں کے عمل درآمد کا بھی ایک منصوبہ ہوتا ہے۔ ودھایک فنڈ سے ہونے والے کاموں میں مانیہ منتری جی اور ودھایک جی کی اچھاؤں کا پالن کرنا پڑتا ہے۔ ویکاس کاریوں میں لگے لوگوں کے سر ہی بدنامی آتی ہے۔ کوئلے کے کان سے نکلا مزدور ہو یا انجینئر، دونوں کے چہرے پر سیاہی لگی ہوتی ہے۔ چلو کے ذر سے لنگوٹ نہیں پھینکا جاتا۔ فرض نبھانے والے سرفروش ہوتے ہیں۔ گھوٹالے کا لیبل لگا دینا اور جن ہت یاچکا دائر کرنا تو اب ایک فیشن بن گیا ہے۔ دراصل یہ دباؤ کی راج نیتی ہے۔ یعنی انہیں بھی کچھ چاہیے۔ حضور! کس سے چھپا ہے؟ افسر کے اوپر افسر اور اس کے اوپر بھی بیٹھا ہے۔ سب ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں...... حضور جہاندیدہ ہیں۔ آفتاب کو چراغ دکھانے کی حماقت میں نہیں کرسکتا......‘‘

پھر وہ حلوے کی طشتری اٹھا کر پیش کرتے ہوئے بولا۔

’’اسے ضرور چکھیے۔ یہ اسپیشل ڈش ہے، پانچ سطحی شاہی حلوہ۔ ہر سطح میں الگ الگ میوہ۔ اس کا نسخہ خاں صاحب کو وراثت میں ملا ہے۔ جس نے بھی چکھا، وہ اس کا رسیا ہو گیا......‘‘

پھر اس نے پاس کھڑے خاں صاحب سے کہا۔

''خاں صاحب! کل ہی سب سامان منگوا لیجیے اور کم سے کم دو کیلو اسپیشل کا بھی اسپیشل حلوہ ہماری شہزادیوں کے لیے بھی بنائیے۔''

بڑا بابو کی چرب زبانی نے حلوے کا ذائقہ بڑھا دیا تھا۔ معمولی مٹھائی پر طبق لگا ہو تو عیب ڈھنک جاتا ہے اور چکھنے والا بھی بدمزا کہنے کی حماقت نہیں کرتا۔

ہاتھ دھوتے وقت بڑا بابو کندھے پر تولیہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ خلال پیش کر کے اس نے کہا

''ماننیہ منتری جی نے اپنی نگرانی میں انکوائری رپورٹ تیار کروائی ہے۔ حضور! چہل قدمی کے بعد ہی ملاحظہ کرنا چاہیں گے......''

چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے چودھویں کے چاند کو دیکھا۔ وہ مجھے کوثر کے چہرے کی طرح شگفتہ و دلکش لگا۔ میں نے سوچا۔ بھوکے کو بھی چاند، روٹی جیسا دکھائی دیتا ہوگا۔ مندر کی سیڑھیاں چڑھتے وقت احساس ہوا کہ پیدل چلنے سے جانگھ چڑھ گئے ہیں۔ دو تین خوش گوار ڈکار کے بعد میں نے سوچا۔ رخصت ہوتے وقت خانسامے کو سو روپے بخشش دوں گا اور بڑا بابو کی نظریں بچا کر ہریا کی جیب میں بھی پچاس روپے ڈال دوں گا۔ اس نے برے وقت میں بغیر کہے مدد کی تھی۔ دونوں خوش ہو جائیں گے......کوثر ناحق میرے کھانے پینے کی فکر کرتی ہوگی......

بس اسٹینڈ کے ایجنٹ کی طرح بڑا بابو فی الفور حساب بے باق کرنا چاہتا تھا۔ میری بے فکری سے خوف زدہ ہو کر اس نے پوچھا۔

''حضور! کاغذات لے کر آ جاؤں؟''

رات رانی کا پودا اپنی خوشبو اسپرے کر رہا تھا۔ چاندنی رات میں بیلا کی نیم خندہ کلیاں چھوٹے چھوٹے کھمانے جیسی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر اور دل و دماغ کو معطر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بڑا بابو ٹارچ جلائے میرے قدم بڑھانے کا منتظر تھا۔ بادل ناخواستہ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے کہا۔

''چلیے! چلتا ہوں......''

وہ چاندنی رات میں بھی ٹارچ جلا کر راستہ دکھاتا ہوا گائیڈ کی طرح چل رہا تھا۔

بڑا بابو فوراً سے پیشتر آ دھمکا۔ وہ ایک خوب صورت بریف کیس اور ایک گفٹ پیکٹ کو ٹیبل پر رکھ کر بولا۔

''حضور! متعلقہ کلرک کی بہن کی شادی ہے۔ وہ لمبی چھٹی پر ہے۔ حضور کو ذرہ برابر بھی زحمت نہ ہو اور مغز پاشی نہ کرنی پڑے اسی لیے انکوائری رپورٹ کی فائنل کاپی ٹائپ کروا کر حاکم رکھ گئے ہیں......''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ترش لہجے میں کہا۔

''ویری اسمارٹ! آپ کے حاکم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ میں دستخط ثبت کرنے آیا ہوں؟''

وہ میرے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''حضور! ایسی کوئی بات نہیں۔ حاکم نے ضروری کاغذات کی نقل بھی منسلک کروا دی ہے اور سخت ہدایت دے کر گئے ہیں کہ اگر ایک آدھ رد و بدل لاحق ہو جائے تو میں اس حصے کو فوراً ٹائپ کروا دوں......صرف اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ اس سے......''

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''واہ! بہت خوب......عنایت......شکریہ......''

پھر پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اور یہ کیا ہے؟''

''حضور! یہ ایک ربوٹ ہے۔ بے بی ٹوائے۔ میڈ ان انڈیا۔ یہ نغمے سنا کر گفٹ دیتا ہے۔ دلی کے پالیکا بازار میں حاکم کو یہ بے حد پسند آ گیا تھا......''

میں نے پھر قطع کلام کر کے پوچھا۔

''اسے کیوں لائے ہیں؟''

''امان پاؤں تو سچ کہوں......'' اس نے حاجت میں بند ملزم کی طرح وعدہ لینا چاہا۔

میری خاموشی طویل ہونے لگی تب اس نے کہا۔

''حاکم اکثر کچھ نہ کچھ لاتے اور بانٹتے ہی رہتی ہیں۔ لیکن اسے وہ خاص طور پر لائے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حضور کی تین شہزادیاں ہیں۔ یہ چھوٹی

شہزادی کے لیے ہے۔ گفٹ لینا دینا حاکم کی پرانی عادت ہے......حضور! مجھے یہ معلوم ہے، مذہب اسلام میں بھی تحفہ دینا لینا جائز ہے......''

وہ روبوٹ کو پیکٹ سے باہر نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''وقت کافی ہو چکا ہے۔ حضور نے لمبا سفر طے کیا اور کڑی دھوپ میں پیدل بھی چلے ہیں۔ یقیناً تھک گئے ہوں گے...... مالش، تھکان دور کرتی اور چمپی سے سکون مل جاتا ہے۔''

وہ کمرے سے فوراً نکل گیا۔

بڑا بابو کے جاتے ہی سب سے پہلے میں نے بریف کیس کھولا۔ انکوائری رپورٹ اوپر ہی رکھی تھی۔ وہ صفحہ مسکرا رہا تھا، جو فقط میرے دستخط کا منتظر تھا۔ میں نے غصہ دبا کر رپورٹ پڑھی اور منسلک کاغذات پر تحقیقی نگاہ ڈالی۔ انکوائری رپورٹ سلیقے سے تیار کروائی گئی تھی۔ مبینہ گھوٹا لے کے الزام کو حزب مخالف کی سازش ثابت کیا گیا تھا۔ اخبار میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ ایک مخملی ڈبے میں چاندی کا منقش قلم اور دوسرے میں نگینہ جڑے زیوروں کا ایک خوبصورت سیٹ تھا۔ ناک کی کیل میں جڑا ہیرے کا نگ جگمگایا اور تراشیدہ زیوروں سے نور پھوٹنے لگا۔ میں نے بریف کیس بند کر کے ربوٹ اٹھا لیا۔

ربوٹ کی شکل کالے دیو جیسی تھی۔ میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے زیر ناف ایک آلہ تھا، جسے چھوتے ہی وہ متحرک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے رنگ برنگی شعاعیں نکلنے لگیں۔ پھر لب ہلے اور مترنم آواز سنائی دی۔

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''
صدیوں سے لٹ رہا، پھر بھی ہرا بھرا ہے
ہم ہیں چیل کوئے اور یہ گھونسلہ ہمارا
گنگا بہہ رہی ہے اور تو پیاسا کھڑا ہے
''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

نغمہ ختم ہوتے ہی ربوٹ نے جیب میں دایاں ہاتھ ڈال کر نکالا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہزار کا نیا نوٹ تھا، جسے وہ پیش کر رہا تھا۔ نوٹ پکڑتے ہی اس نے فرشی سلام کیا اور فاتحانہ قہقہے لگا کر حسب سابق ساکت ہو گیا۔ میں نے نوٹ کی جانچ کی، وہ اصلی تھا۔ چہرے پر پھیلتی مسکان کو میں چھینک کی طرح روک نہیں سکا۔ نہ جانے کیوں میں تھوڑی تھوڑی دیر پر آلہ کو چھو دیتا۔ روبوٹ متحرک ہوتا اور طے شدہ عمل دہرا کر ساکت ہو جاتا۔ اچانک روبوٹ کے قہقہے میں پائل کی کھنک شامل ہو گئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ خوبصورت جوڑے میں بجی سنوری ایک کم سن آدی باسی حسینہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی اور آنکھوں میں مہمان نوازی کی چاہت تھی۔ میں گھبرا گیا، جیسے حمام میں کوئی اچانک گھس آیا ہو۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کون ہو تم؟''

''پھوسرکار!''

''اس وقت کیوں آئی ہو؟''

''مالس کرے لا......''

''مالش کی ضرورت تمہارے بڑا بابو کو ہے۔ نکلو کمرے سے۔ بھاگو......جلدی بھاگو......''

غیر متوقع پھٹکار سے وہ بدحواس ہو کر گرتی پڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

صبح ہی میں نے بڑا بابو کو رپورٹ کے علاوہ سبھی چیزیں لوٹا دیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف یا شکست کا نشان نہیں تھا۔

بقیہ تین دن بہت برے گزرے۔ بڑا بابو کا ہر جواب ''بیٹی نہ بیٹا'' جیسا ذومعنی ہوتا۔ میں نے کھانے پینے کے انتظام کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اب اس کی دلچسپی بھی مجھ میں نہیں رہ گئی تھی۔ چار بار بلانے پر ایک بار حاضر ہوتا۔ خاموشی اور لاعلمی سے وہ ہزار بلا ٹال جاتا۔

جگہ جگہ کی خاک چھان کر مشقت سے تیار کردہ مہر بند انکوائری رپورٹ کو بروقت محکمہ میں پیش کر کے میں کئی دنوں تک چوکنا رہا۔ چیمبر میں آنے والے

اسٹاف کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا۔ میں حیران تھا۔ کسی نے مجھ سے انکوائری کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔

عادتاً بیوی بچوں کو روداد سفر سناتے ہوئے میں نے دانستہ پچھو کا ذکر نہیں کیا۔ کراماتی ربوٹ کی کہانی سن کر الماس مچل گئی تب کوثر ٹھنڈی آہیں بھر کر بولی۔

''آپ بڑے بے درد انسان ہیں۔ ننھی سی جان کے لیے بھی نہیں سوچا۔ قیمت ادا کر کے تو ربوٹ لے سکتے تھے۔ میں اس میں دس دس کے نوٹ بھر دیتی...... اس وقت میرا دل بہت دکھتا ہے، جب آپا کے بچے ریموٹ سے ہوائی جہاز اڑاتے اور میرے بچے حسرت سے اڑتا ہوا جہاز دیکھتے ہیں۔ ہاتھ آیا ایک موقع نکل گیا۔ الماس، آپا کے بچوں کو ربوٹ دکھا کر اس کے دیے پیسے سے سب کو آئس کریم تو کھلا سکتی تھی......''

کوثر کے چہرے پر کرب نمایاں ہو گیا۔ پھر وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''بچپن کے سکھ اور جوانی کے عیش ہی تو بڑھاپے میں سکون بخشتے ہیں۔ لیکن میری بیٹیوں کی قسمت میں تو اماوس کی رات اور بھادو کی کڑکتی بجلیاں ہیں......''

تھوڑی دیر کی چپ کے بعد اس کا تجسس جاگ اٹھا تب وہ بولی۔

''ہاں! یہ نہیں بتایا، زیوروں کا سیٹ بھاری بھر کم تھا یا ہوا ہوائی؟...... میں نے انہیں دیکھا نہیں، پھر بھی یقین سے کہہ سکتی سیٹ وزنی اور جڑے ڈائمنڈ بھی اصلی ہوں گے۔ پھنسا ہوا آدمی جان چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ ناراض کر کے بڑی آفت کیوں مول لے گا؟ آپ نے ہی بتایا ہے، ہزار کے نوٹ اصلی تھے''

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔

''یہ سب جان کر کیا فائدہ؟''

قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔

''آپ کی جگہ اگر میں ہوتی تو گفٹ لے کر بھی اپنی رپورٹ پیش کرتی۔ موا بڑا بابو کیا بگاڑ لیتا؟...... آئندہ کے لیے اسے سبق بھی مل جاتا۔''

چولہے پر ابل کر گرے دودھ کی مہک ملتے ہی کوثر دوڑتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ بات آئی گئی اور پرانی ہو گئی۔

ہفتہ دس دنوں بعد ایک صبح معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے صدف نے سوال داغا۔

''پاپا آپ نے تو کہا تھا کہ سرکار کو صحیح انکوائری رپورٹ سونپی ہے۔ کئی سفید پوش بھی بے نقاب ہوں گے اور کچھ لوگوں کو سزا ضرور ملے گی؟......''

''ہاں...... کہا تو تھا......''

''لیکن پاپا......'' وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔

''بات کیا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''سب کو کلین چٹ مل گئی ہے...... وہ بھی آپ ہی کی رپورٹ پر......''

سرخی پر انگلی رکھ کر اس نے مجھے اخبار پکڑا دیا۔ پہلے صفحہ پر چار کالمی خبر شائع ہوئی تھی۔ مانیہ منتری جی نے پریس کانفرنس میں انکوائری رپورٹ کی نقل بھی تقسیم کروائی تھی۔ خبر پڑھ کر میں ششدر رہ گیا۔ قدرے توقف کے بعد شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے بڑا بابو والی رپورٹ کو ہی میرے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے، ورنہ......''

کوثر نے فوراً طنز کا گولہ پھینکا۔

''نکل گیا نہ اصول اور ایمانداری کا جنازہ؟ چہ...... چہ...... نہ خدا ملا نہ وصال صنم......''

''لیکن میں بھی چپ نہیں بیٹھوں گا......'' میرا لہجہ پرعزم تھا۔

''ہاں! مجھے معلوم ہے، جنگ جاری رہے گی......''

میں اخبار لیتا ہوا آنگن سے اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔

☆☆

اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے

فاریہ ارشد

وہ اب اس کو زور زور سے تھپڑ مار رہی تھی۔ پانوں چٹوا رہی تھی اور اس کے اندر عجیب سی سنسنی پھیلتی جا رہی تھی، تشدد اور ذلت کا ایسا لطف وہ برہم تھا مگر حیران

سیکس، مرد اور طوائف پر ایک اچھوتی کہانی

یہ ایک عریاں شام تھی جس کے برہنہ سینے پہ وہ رقصاں تھی اور رقص بھی ایسا کہ زت زت پہ وقت ٹھہر کر اس کے ناز و انداز پہ نچھاور ہونے لگا تھا۔ ڈھولک اور طبلے والے نئی سے نئی گت پیش کر رہے تھے۔ بھدے نقوش مگر سریلی آواز والی مغنیہ نے تان باندھی۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر، وہی مشکل نہ بن جائے

وہ ایسے سرمستی کے عالم میں ناچ رہی تھی کہ ہر طرف سے واہ واہ کا شور بلند ہونے لگا۔ انہی داد دینے والوں میں وہ بھوری آنکھوں اور مغرور تاثر والا نوجوان بھی تھا...... اتنے چھوٹے سے شہر میں ایسی باکمال رقاصہ وہ ٹھٹھکا۔ کبھی بند پنکھڑی کی طرح سمٹتی، کبھی مکمل کھلے پھول کی بے باک خوشبو کی طرح بکھرتی اور بجلی کی طرح کوندتی۔ یا پھر جیسی چھلکتی اور ایسا خمار کہ جہاں پاؤں دھر لی اسے میکدہ بنا دیتی۔ وہ داد دیے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے جانے کتنی ہوشرباؤں کے رقص دیکھ رکھے تھے۔ کتنے جلوؤں کا سامنا رہا تھا مگر وہ یوں کبھی متوجہ نہ ہو سکا تھا۔ بے نیازی اور سرمستی...... ہاں! شاید ان دو چیزوں نے اسے متوجہ کیا تھا۔ وہ محکمے کی کسی میٹنگ کے حوالے سے یہاں آیا تو اس کے شوق اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے رات میں ایک جاگیردار نے یہ اہتمام کر ڈالا۔ وہ پیتے پلاتے جلد ہی بوریت کا شکار ہو جاتا اور اپنے بیڈروم کی طرف بھاگتا مگر یہ پہلی بار تھی کہ وہ رک گیا تھا۔

مغنیہ ایک نئی ٹھمری چھیڑ چکی تھی جو کہ وہ کئی گلوکاروں کی آواز میں اس سے قبل سن چکا تھا جو راگ بھیروی میں کافی آہستہ لے میں گائی گئی تھی مگر یہاں مغنیہ نے ایسے تیز ردھم میں اسے گایا اور اتنا ہی تیز رقص...... وہ جھوم اٹھا۔

سانوریا نے کیسا جادو ڈارا رے
باجو بند کھل کھل جائے
سانوریا سانوریا، باجو بند......

ایسو نجر موری، مانے ناہیں بتیاں
پیار کرت موسے، بیتی ساری رتیاں
نیر نگ پیا تو ہے لاج نہ آوے
ہٹو چھوڑ و بیاں، لاگو نہ ہی چھتیاں

سانوریا......

باجو بند کھل کھل آجائے

''واااہ واہ!'' ...... وہ جام ہاتھ میں لیے بے اختیار داد کو اٹھا۔ سمٹا ہوا ریشمی تھان سا بدن کھلنے لگا۔

طبلے کی تھاپ، طنبورے کی لہک، ہارمونیم اور سارنگی کے لہرے اور اس نازنیں کا لچکتا بدن...... بے خود...... مغرور اٹھان والا۔ اس کی آہو چشمی، سرو قامتی اور بجلی کی سی لپک...... رات کے گھیرے پن میں اضافہ کرتا اس کے مجسم سراپے کا اسرار......

رات ناچ رہی تھی...... وقت ناچ رہا تھا...... ماحول رقص میں تھا...... زمیں رقصاں تھی...... آسماں ناچ رہا تھا...... ہوا ناچتی تھی...... بول ناچتے تھے...... دل ناچتا تھا...... دماغ ناچتا تھا...... وہ ناچتی تھی کہ جہاں ناچتا تھا...... وہ بے خود سا خود بھی ناچ اٹھا......

سرمستی کی کیفیت...... زاویہ درزاویہ...... قوس درقوس دائروں میں دائرے...... سمٹتے اور وا ہوتے ہوتے۔ وہ مغرور اٹھان والی جھوم رہی تھی۔ وہ بے زار تاثر والا جھوم رہا تھا۔

محفل تمام ہوتے ہی وہ اس کے کمرے میں موجود تھی۔ شمشیر وسناں والا طاؤس ورباب والی کے روبرو تھا۔

''کیا عجیب ہو تم۔'' وہ ابھی تک مدہوش تھا۔

''عورت ہوں اور اس پہ رقاصہ بھی۔'' وہ بانکپن سے مسکائی اور ایک غلط انداز نظر اس پہ ڈال کے پشواز سنبھالتی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ایسی نظر...... قیامت ہی توڑھا گئی۔

ملہار ابھی جاری تھا۔ کمرے کے باہر سے کوئی منچلا چلتے چلتے شعر گنگنا رہا تھا۔

رات کا خواب الٰہی توبہ
آپ سنیے گا تو شرمایئے گا

وہ مفتوح کرنے کو بے تاب تھا۔ مگر وہاں ایسی تمکنت ایسا فسوں کہ حسب نسب والا زچ ہونے لگا۔

''اجی صاحب! بازار بھرا پڑا ہے کوئی بھی اٹھا لایئے اور اپنی مقتل گاہ میں جا کل کیجیے۔ آپ کو کون روک سکتا ہے، 'باکرہ' گوشت کھایئے یا باسی۔ جیسا چاہیں پایئے۔ اور فکر مت کیجیے یہ تو بازار ہے جہاں عفت وعصمت ابدی نیند سوتی ہے۔ آپ کی دولت اور اس کی چمڑی...... بوچڑ خانے کی چمڑی......''

اس کے وجود سے خوفناک قہقہہ ابلا۔ وہ دم بخود سا اسے دیکھا کیا۔

''اتنی بڑی بڑی باتیں...... کہاں سے ہو تم اور یہاں کیسے پہنچیں؟'' وہ اس کی ذہانت سے مرعوب ہونے لگا۔

''یہاں موجود عورت سے ایسا نہیں پوچھتے...... کون اور کہاں بتا کے کیا ہوگا۔ ادھر تعلق ہٹا ادھر رابطے کٹ گئے۔ اب بس میں یہیں کی ہوں۔ نہیں مانوں گی تو معلق رہوں گی...... اور مجھے معلق نہیں ہونا۔ زمین چاہیے مجھے اپنے لیے۔''

''مجسم!'' وہ پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھتا آگے بڑھا۔

''مجھے تمہارا لمس چاہیے۔'' اس نے اسے بازوؤں سے تھامنا چاہا۔

وہ کسی بجلی کی سی تیزی سے مڑی۔ اس کے ہونٹ ایک غلیظ فقرہ اس کی طرف پھینکنے کے لیے مچل اٹھے۔ اور تب اس نے بنا کوئی لحاظ کیے اسے ایک انتہائی فحش اور بازاری گالی دی...... طوفانی انداز سے آگے بڑھی اور وہ جو دم بخود سا زمی سے کھڑا تھا، اسے بیڈ پہ دھکا دیا اور اس کے سینے پہ پاؤں رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

''میں اپنی مرضی سے چلتی ہوں صاحب! اور تم میری مرضی اٹھا نہ پاؤ گے۔''

وہ ہکا بکا سا اسے دیکھے گیا۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے نکلنا چاہتا تھا۔ انا سر اٹھانے لگی مگر کیا ہو گیا تھا اسے کہ اٹھنے کی خواہش نہیں

پاتا تھا۔ وہ اب اس کے اوپر لیٹی دونوں پاؤں اس کے چہرے پہ رکھے گویا رقصاں تھی۔ مہندی بھری پوریں اس کے لبوں اور آنکھوں پہ تھرکتی تھیں۔ وہ ایسے طاقت ور بازو رکھتا تھا کہ چاہتا تو اس ناگن کو گردن سے پکڑ کھڑکی سے باہر پھینکتا مگر اس نے محسوس کیا اس کی اپنی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور عجیب سا لطف اس کے جسم کو مسحور کر رہا تھا۔ وہ اٹھی اور اس کے سینے اور چہرے پہ تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ کمرے کے آس پاس کوئی گا رہا تھا۔

شام جانے لگے، میں بلاتی رہی
سیاں روٹھ گئے، میں مناتی رہی

اور گذرتی رات کے اس لمحے نے انہیں تحیر کے ایک نئے در پہ لا کھڑا کیا۔ مگر ستم یہ کہ گزرتی رات کا اگلا لمحہ ہوش کا تھا۔ مکمل عمل کے بعد ہوش آیا تو وہ بپھر اٹھا۔

''رنڈی کہیں کی!'' اس نے غصے سے زمین پہ تھوکا۔ وہی بے حس سرد اور بدمزا کیفیت والا حسبی نسبی انا کا مارا مرد۔

پولیس اور سیکیورٹی اس کے ایک اشارے پہ پہنچ کر اسے ساتھ لے جا چکی تھیں مگر اسے یاد آیا وہ اس کے لبوں پہ پاؤں رکھے اس کے اوپر جھول رہی تھی۔ راگ جاری تھا۔

رس کے بھرے تورے نین

انگوروں کی گچھاؤں جیسی لڑکیوں کو پاؤں تلے مسلنے والا حیرت کی اس چوٹی پہ جا بیٹھا تھا جسے آج اس نے پہلی بار سر کیا تھا۔ دونوں نرخ اور ہوس سے کہیں آگے جا کے حیرت کا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔ وہ ابھی بھی اسی منظر میں تھا۔

وہ اب اس کو زور زور سے تھپڑ مار رہی تھی۔ پاؤں چٹوا رہی تھی۔ اور اس کے اندر عجیب سی سنسنی پھیلتی جا رہی تھی...... تشدد اور ذلت کا ایسا لطف...... وہ برہم تھا مگر حیران تھا۔ جسم ابھی تک اسی سنسنی کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ حواس تھے کہ اسی منظر میں بار بار جانا چاہتے تھے۔ وہ بور ہو چکا تھا......

ایک جیسے کھیل کھیلتے...... ایک جیسا کردار اسے بے حس کر چکا تھا۔ وہ حسب نسب اور عہدے والا ایک طوائف زادی سے ذلت اور تشدد سہہ کر ایک نئے جہان جا پہنچا تھا...... نیا جہان...... نئی کیفیت۔

وہ...... اس کی ہم رقص جان چکی تھی کہ دوران رقص کون سا نرت کن اعضاء نے کب نبھانا ہے۔ زمین کے ساتھ کب لگنا ہے کب فضا میں اور کب آسمان کی بلندیوں کی طرف...... وہ مقام بدلنا جان چکی تھی۔

اور وہ جانے کب سے ایک ہی مقام پہ کھڑا تھا۔ ساکت جامد اور سرد۔ ایک رقص وہ تھا جو اس کا بدن مانگتا تھا اور وہ خوب ناچتی تھی مگر اس کے لیے اسے زمین چاہیے تھی۔ اور ایک رقص جو اس کا اپنا جسم مانگتا تھا...... آدمی کا جسم...... آدم کا جسم...... ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں سفر کرتا...... دائرہ در دائرہ ناچتا ایک مقام تو ساکت کرتا ہے۔ تحیر مر جاتا ہے اور بنا تحیر تو یہ دنیا کچھ بھی نہیں۔ وہ جسم کچھ بھی نہیں۔ بس صرف بے حس مردے کی قبر ہے اور اس نے بھی برسوں بعد نئے دائرے میں رقص کیا تھا۔ حسبی نسبی اور عزت سے تشدد اور ذلت کے دائرے تک کا رقص...... حیرت کے زندہ ہونے کا رقص۔ اس کا جی چاہا ابھی اٹھے اور بھاگ کے کسی رس نکالنے والی مشین میں اپنا پورا وجود گھسا دے۔ کس قدر عجب تھا کہ اس کا جسم اس سنسنی سے نکلنے کو تیار نہ تھا۔ پر تشدد مگر جادوئی لمحات اسے ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں پھینک چکے تھے۔ جسم چور تھا لیکن مزید تھکن مانگتا تھا...... اوہ...... چور تو کہیں اس کی اپنی بغل میں تھا۔

وہ اداس ہو گیا۔

جانے کب اس نے موبائل اٹھایا اور ایس ایچ او کا نمبر ملا کے بولا۔

''چھوڑ دو اسے۔''

☆☆

داغ دار لڑکیاں

ایم الیاس

ایک ابھرتے ہوئے کرکٹ کے کھلاڑی گرد گھومتی ہوئی کہانی جس میں معاشرے کا عکس نظر آئے گا۔کہ ہمارے ہاں کی لڑکیاں' عورتیں کیسی بے راہ روی کا شکار ہوتی جا رہی ہیں امریکا' یورپ اور ایشیا میں بھی پرستار لڑکیاں' عورتیں شہرت یافتہ اور دولت مند کھلاڑیوں سے متاثر ہوکر اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہیں کتنی نامور کھلاڑیوں کی ناجائز اولادیں ہیں۔ امریکا اور ہندوستان میں یہ کوئی معیوب بات نہیں رہی ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہ بے راہ روی عام ہوتی جا رہی ہے . جس طرح محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے اس طرح پرستاری اور عشق میں ہر بات جائز ہوگئی ہے سب کچھ عالمی میڈیا' موبائل انٹرنیٹ اور فلمیں ہیں لڑکیاں' عورتیں اور معاشرہ کہاں جا رہا ہے یہ ایک سوالیہ نشان ہے ایم الیاس نے اپنی اس طویل ترین کہانی میں تاریک گوشوں کو اجاگر کیا ہے ۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے ؟ مبالغہ آمیزی اور غلط ہے اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے . عریانیت' بے حجابی کے ملبوسات جس میں لڑکیا' عورتیں بے لباس نظر آتی ہیں' اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ ماں باپ' بھائی' شوہر اور بیٹیوں نے انہیں کھلی چھوٹ دے دی اور غیرت مرچکی ہے' شرم و حیا صرف ایک تصور رہ گیا ہے .

یہ گھناؤنی واقعات کی کہانی آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردے گی

دوسری اور آخری قسط

”وہ ایسی گوری چٹی ہے جیسی یورپی اور پنجابن ہوتی ہیں۔ غزالہ پر دھوکا ہوتا ہے چودھویں کے چاند کا۔۔۔ اگر اس کے بال سیاہ نہ ہوتے تو وہ انگریز عورت سمجھی جاتی۔۔۔ خیریات تھی سب کی عزت کی جس سے ہم کورٹ میں ٹینس کھیل رہے ہیں۔“ جمال نے کہا۔ ”کورٹ سے میری مراد ہے عدالت اور مقدمہ بازی ایک میچ ہے جو بالآخر دونوں ہار جائیں گے۔ عزت کی گیند ادھر سے ادھر ہوتی رہے گی۔ تماشائی واہ واہ کریں یا آہ آہ۔۔۔ تالیاں بجا بجا کر داد دیتے جائیں یا نعرے بازی کریں۔“

”مطلب کی بات کرو میاں! اور پھر چلتے بنو۔“ چچا نے بگڑ کر کہا۔ ”کرکٹ چھوڑ کر کیا ٹینس شروع کر دی ہے جو ایسی مثالیں دے رہے ہو؟“

”مطلب کی بات؟ یہ ہے چچا نجابت کہ جائداد ہے تقریباً“ تیس لاکھ مالیت کی۔ اصولاً“ میرا حصہ بنتا ہے پندرہ لاکھ۔۔۔ لیکن میں آپ کو کچھ رعایت دے سکتا ہوں اگر آپ بھی عاقبت اندیشی کا ثبوت دیں اور اس معاملے کو باہمی طور پر عدالت کے باہر طے کر لیں۔“

”بہت خوب میرے بچے۔۔۔ ذرا اس رعایت کی نوعیت بھی بیان کر دو۔“ چچا نے طنز سے کہا۔ ”مستحق اور حاجت مند تو ہم ہیں۔“

”ابھی میں جائداد کی مالیت فرض کیے لیتا ہوں۔ اس کا نصف آپ مجھے دے دیں اور مجھ سے تحریر لے لیں۔ سب جائداد آپ کی۔۔۔ مقدمہ ختم۔“

”یعنی۔۔۔ گویا دس لاکھ میں ہمیں بخش دو گے اور اس طرح ہماری عزت محفوظ رہے گی اور اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی؟“ نجابت علی خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور ان کے چہرے پر فکرمندی کی گھٹا سی چھا گئی۔ ”تم یہ بات سچ کہہ رہے ہو اور میں اس کا یقین کر لوں۔“

”بالکل۔۔۔ اس میں کوئی فریب نہیں ہے۔ آپ جو تحریر چاہے لکھوا لیں۔ بال اب آپ کے کورٹ میں ہے۔“ وہ پھر بے دھیانی میں ٹینس کی مثال دے بیٹھا۔

نجابت علی خان کچھ سوچتے اور اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے رہے جیسے اس کی بات کا یقین کرنے کے بارے میں غور کر رہے ہوں۔

”اچھا۔۔۔ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں دو منٹ میں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”چچی جان نے سیز فائر کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس مہارت سے فائدہ اٹھایا اور جمال کے ساتھ اس کے اگلے پچھلے ہوتوں سوتوں کو بھی سچے دل سے وہ بد دعائیں دیں جو جرم بے گناہی میں پھانسی پر چڑھایا جانے والا مجرم جھوٹے مدعی کو بھی نہیں دیتا ہو گا۔

جمال صرف مسکراتا رہا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا شاید وہ کالی موٹی بھینس رانی نظر آجائے جو بڑی فربہ تھی۔ وہاں ایک خاموشی میں سب کے جواب میں اور جواب جاہلاں باشد خموشی۔

موٹی بھینس کی جھلک کیا اس کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ وہ حیران تھا کہ جانے کیوں اسے دیکھنے کا تجسس کا اشتیاق کیوں ہو رہا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس دو برسوں میں وہ کتنی اور موٹی فربہ ہو گئی ہے۔ اس کے جسم میں کتنی چربی اور چڑھ گئی ہے۔ سیاہ جلد کتنی روغنی اور چمک دار ہو گئی ہے۔ کسی وجہ سے اسے شادی کرنی پڑی تو کیا وہ اس کے ساتھ سہاگ رات منا سکے گا؟ پلنگ ٹوٹ تو نہیں جائے گا؟ اس موٹی بھینس دلہن کا قرب اور اسے چومنا کس قدر سوہان روح ہو گا؟

وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ چچا نمودار ہوئے تو ان کے نظر آنے والے کاغذ کے کورے کرارے ٹکڑے کو پہچان کر جمال کے دل میں جشن کے شادیانے بج اٹھے۔ یہ چیک تھا۔ شاید دس لاکھ کا۔۔۔ اگر آٹھ یا سات کا بھی ہو گا تو جزاک اللہ۔۔۔ وہ گھر جا کر دو نفل شکرانے کے پڑھے گا۔

”یہ لو میاں شہزادے! بال اب تمہارے کورٹ میں ہے۔“ چچا نے اسے چیک تھما دیا۔ جمال نے چیک تھام کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی اور مایوسی سے کہا۔

”چچا جان۔۔۔! میں نے آپ سے دس لاکھ مالیت کی بات کی تھی۔ یہ تو پانچ لاکھ کا ہے۔“

”ہاں، یہ پیشگی ہے۔ یعنی بیعانہ۔۔۔“ نجابت علی خان نے جواب دیا۔ ”دس لاکھ مانگے تھے نا تم نے تو میں نے یہ قیمت منظور کی۔ اگر سودا منظور ہو تو شام کو آجانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”سودا کیا چچا جان۔۔۔؟“ جمال کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ”یہ کس چیز کی قیمت؟“

”یہ تمہاری۔۔۔ ایک ذلیل آدمی کی قیمت ہے۔“ نجابت علی خان نے کہا۔ ”منہ مانگی قیمت دے رہا ہوں تمہیں میاں! خاندانی آدمی ہوں۔ مول تول نہیں کرتا۔ شام تک چار دوستوں اور نکاح خواں کے ساتھ آجاؤ۔ نکاح کے بعد باقی ادائی ہو گی۔ بصورت دیگر صبح میں اس چیک کو کینسل کر دوں گا۔“

”میں نے کب کہا تھا کہ میں رانی سے نکاح کروں گا۔۔۔؟“ جمال نے فوراً“ ہی کہا۔

اگر چچا نہ ہوتے اور ان کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ دولت وغیرہ تو اس سے صاف صاف کہتا کہ یار! رانی عورت تو ہے۔ ایک بے حد موٹی اور کالی فربہ بھینس جو دس بارہ کلو دودھ دینے والی جیسی۔۔۔ اس میں عورت ہونے کے باوجود ایسی کوئی کشش نہیں ہے کہ وہ فطری حالت میں ہوتے ہوئے مرد سے ہم آغوشی کرے تو مرد کے بدن میں نہ تو سنسنی دوڑے گی اور نہ ہی خون کی واردات ہو گی۔ جذبات برف کی طرح سرد ہوں گے۔ وہ سراب ہی بنا رہے گا۔ یہ بات عورت کے لیے بڑی توہین آمیز ہو کہ مرد اسے ہاتھ نہ لگائے۔

”ہاں! تو تم اپنی کہہ چلے اور اب میری بھی تو سنو۔۔۔“ نجابت خان نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”آج کے بعد تم پر یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔۔۔ سمجھے برخوردار ناخلف۔۔۔ لہٰذا اب تم تشریف لے جا سکتے ہو۔“

کاغذ کا یہ پرزہ ایک جوتا تھا جو سسر نجابت علی خان نے اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

”اور ہاں۔۔۔ اگر قوت خرید ہے تو تم مجھے خرید کے دیکھو۔ یہی قیمت میں مانگتا ہوں باعزت فیملی کی۔۔۔ دس لاکھ تم دو تو مقدمے سے ہی نہیں تمہارے بازاری خون کے رشتے سے بھی دستبردار ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنی عزت بہرحال ہر قیمت پر جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔۔۔ یاد رکھنا جمال احمد میاں۔۔۔ ”بال اب میں نے تمہارے کورٹ میں پھینک دی ہے۔ چلو اپنا راستہ ناپو۔“

جمال نے ایسی ذلت کا عذاب پہلے کبھی نہیں جھیلا تھا۔ اس قدر اذیت ناک اور سوہان روح تھا کہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے وجود پر جیسے دہکتے انگارے رکھ دیے تھے۔ وہ ساری رات لحظہ بھر کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ اس نے چیک کو پرزہ پرزہ کر دیا تھا اور پھر ان پرزوں کو جلا کے راکھ کر دیا تھا مگر وہ پرزے اندھیرے میں چاروں طرف اندھیرے بن کر اڑ رہے تھے اور اس کی ہنسی اڑا رہے تھے۔

پھر اس کے کانوں میں ایک ہنسی گرم گرم سیسے کی طرح پگھلنے لگی۔۔۔ معدوم ہو گئی اپنی اوقات تمہیں۔۔۔؟ کیا ہو تم؟ محض ایک ذلیل، انتہائی گھٹیا اور ہیچ آدمی برائے فروخت جس کی کل قیمت دس لاکھ روپے مگر خریدار صرف ایک ہے۔ وہ تم کو خرید سکتا ہے مگر تم کنگال الرہاں۔۔۔ ایک لڑکی کا دل تو جیت سکتے ہو اور تم نے اسے اور اس کے جسم کو کھلونا بنا کر ہر طرح سے کھیلا اور کھیل سکتے ہو لیکن اسے سدا کے لیے حاصل نہیں کر سکتے۔ بے زر عشق ٹائیں ٹائیں فش۔۔۔ چناں چہ بولو میاں مٹھو من کہ مسمی جمال احمد ولد حکیم شرافت علی مرحوم خود کو بعوض دس لاکھ سکہ رائج الوقت، نصف موجل، نصف غیر موجل، مسماۃ رانی بنت حکیم نجابت علی خان کے نکاح میں دینا قبول کرتا ہوں۔

پہلے تو اسے خیال آیا کہ وہ ایک خنجر اور ٹیپ لے کر چچا کے گھر جائے۔ رانی چھت والے کمرے میں اکیلی سوتی تھی۔ وہ بھینس اس وقت گہری نیند میں ہو گی چھ سات برس پہلے رات کے بارہ بجے وہ چھت پر ایک مرتبان اٹھا کر نیچے چچا کے کہنے پر گیا تو رانی کمرے میں سو رہی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور چاندنی اس کے کمرے میں جھانک رہی تھی۔ اس کے کپڑے کرسی پر رکھے

تھے وہ گہری نیند میں غرق تھی۔ رانی کو فطری حالت میں دیکھ کر بھی اس کے بدن پر کوئی سنسنی دوڑی تھی اور دل میں انجانی خواہش نے جنم لیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ وہ آج اب چھت پر حلیہ بدل کر جائے۔ پہلے تو اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دے پھر اس کا لباس اور زیر جامے اتارنے کے لیے اشارہ کرے۔ خنجر دیکھ کر انکار تو نہیں کرے گی۔ اگر بالفرض انکار کیا تو خنجر سے اس کا لباس چاک کر دے گا۔ پھر خنجر کے زور پر وہ اس کے ساتھ ایسا فعل کرے گا جسے عورت پسند نہیں کرتی ہے۔ وہ جو اس کے لیے بڑا اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی کچھ فین لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ اس قبیح اور ذلیل اور شرمناک فعل کو کر چکا تھا۔ انتقاماً" نہیں... دنیا میں ہم جنس پرستی عام ہو رہی تھی اس لیے اس کی خواہش ہوئی تھی۔

پھر اسے یاد آیا کہ چچا اپنے گھر میں ایک بھرا پستول رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیا وہ رانی کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے تیار ہے؟ نہیں 'نہیں' نہیں... اس نے دیوانہ وار کمرے میں چکر لگانا شروع کیا تو اس پر ایک جنون سا سوار ہو گیا اور اپنے بال نوچتے ہوئے کہا۔ لات مار کے اس نے میز گرا دی اور بالآخر تھک کر بستر پر گر گیا۔ لعنت اس ٹھیکرے کی منگنی کے نام پر میری قیمت کے خریدار... رانی پر اور اس کے باپ پر جو دس لاکھ میں میری محبت کو نیشنلائز کرنا چاہتا ہے تاکہ فلمی فارمولے کے مطابق تو مجھے خود کو شراب میں غرق کر کے اپنے غم بھلا دینا چاہیے مگر یہ حرام شے بھی بلیک میں ملتی ہے اور جس فاقہ کش کو مرض عشق کی ہوا تک میسر نہ ہو۔ اسے ایمان ضرور قبر میں لے جانا چاہیے۔

قبر کا خیال آیا تو وہ بھونچکا گیا۔ اسے یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا اور نہ ہی اس گناہ عظیم کا احساس اور فکر ہوئی۔ اس نے کرکٹ میں شہرت کے بام عروج پر پہنچ کر سزا جزا کو بھلا دیا۔ یہ بھول گیا تھا کہ ایک دن تو اسے قبر میں جانا ہے۔ فین لڑکیوں عورتوں کے ساتھ اس نے کیا کچھ نہیں کیا... کلیوں کو پھول بنایا' دوشیزاؤں کو عورت... شادی شدہ اور بچوں والی عورتوں سے بھی منہ کالا کیا... ان کے ساتھ ہر وہ حرکت فعل اور قبیح حرکت کی جو ہر لحاظ سے اذیت ناک' ناشائستہ' نازیبا اور دردناک تھی۔ اب اس کو تاہی اور پچھتاوے سے وہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ گیا۔ خودکشی کے خیال نے اس کے لاشعور میں جگہ بنالی تھی مگر اسے علم نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ میں اتنی جلدی ہمت ہار گیا ہوں۔ نہیں... بندے ایک در بند کرتے ہیں تو خدا دس در کھولتا ہے۔ بس مجھے سکون اور اطمینان قلب کی ضرورت ہے... اور پھر سکون تو ایک گولی سے بھی مل جاتا ہے۔ وہ فوراً نیچے اتر گیا۔

اس نے ایک میڈیکل اسٹور سے سکون کی گولی مانگی تو دکان دار نے اسے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھا۔

"آپ نسخہ دکھائیں... بغیر نسخہ کے یہ گولیاں نہیں دی جاتی ہیں۔"

"میرے پاس تو نہیں ہے... دراصل مجھے سکون کی ضرورت ہے تاکہ اطمینان سے سو سکوں۔"

"خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھو اور گڑگڑا کر رب العزت سے دعا مانگو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"میں تمہارا خطبہ سننے نہیں آیا تھا۔ گولیاں دو گے یا نہیں؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"نہیں... ذرا اپنی صورت دیکھو۔ تم حرام موت مر گئے تو گناہ تو مجھے بھی ہو گا۔ لوگ نشے کے طور پر بھی یہ گولیاں کھاتے ہیں۔" جمال مایوس لوٹ گیا مگر واپس آ کے اس نے ہوش سنبھالے۔ اس کے بعد اس نے پہلی بار وضو کیا اور جانماز بچھا کر قبلہ رو ہو گیا۔ یہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا مگر عبادت کا نذرانہ عقیدت سے پیش کیا جائے تو خدا کسی بھی وقت شرف قبولیت سے انکار نہیں کرتا۔

جمال کو بڑا تعجب ہوا جب دعا مانگنے کے بعد اس کا دل واقعی ایک دم پرسکون ہو گیا۔

اس نے کوئی لمبی چوڑی دعا بھی نہیں مانگی تھی۔ صرف اتنا ہی کہا تھا... یہ یا خدا... میری مدد کرنا دنیا میں میرا کوئی مددگار نہیں۔" پھر وہ سو گیا اور صبح دن چڑھے تک گہری نیند سوتا رہا۔ کچھ دن سے اس نے معمول بنا لیا تھا کہ دروازہ باہر سے مقفل رکھتا تھا۔ خود کھڑکی کے راستے اندر جا کر کنڈی لگا لیتا تھا۔ اس نے تین مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا تھا اور اسے ڈاج کرنے کا یہ طریقہ موثر ثابت ہو رہا تھا۔ اسے کئی بار مالک مکان کے تحریری پیغامات ملے تھے جو اس نے دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دیے تھے۔ ان سب کا موضوع ایک ہی تھا مگر روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا اور اسے دہلا تا جانے لگا تھا۔

ایک روز وہ صبح ڈرتے ڈرتے ایس پی عبدالخالق کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری سر...!" اس نے شکست خوردہ انداز میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔ "ابھی تک میں کچھ نہیں کر سکا۔"

"تم کچھ کرو گے بھی نہیں۔ کیوں کہ تم کچھ کرنا نہیں چاہتے... مجھے اس کا اندازہ تھا۔" آج اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "کیوں کہ تم نے سوچ لیا تھا کہ زندگی پھولوں کی سیج ہے۔ ہنستے کھیلتے گزر جائے گی۔ چوکے چھکے مار کے 'وکٹیں اڑا کے اور مین آف دی میچ بن کر سب ملتا رہے گا۔ پیسا بھی اور غزالہ جیسی بے وقوف لڑکیاں بھی۔ اس سے زیادہ عیاشی کسی اور پیشے میں کہاں؟ چالیس برس سے پہلے ہی کہیں آدمی ریٹائر ہو جاتا ہے مگر اس سے پہلے ہی کسی بہت مال دار گھرانے کی لڑکی سے شادی کر کے مستقبل بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی اس سوچ سے مجھے اختلاف ہے۔" اس نے تکرار کی۔ "یہ غلط ہے۔"

"کیوں... مثالیں دوں میں؟ اپنی قومی ٹیم ہی کو دیکھ لو لیکن کان کھول کر سن لو۔ غزالہ کا باپ ان لڑکیوں کے ماں باپ کی طرح کرکٹ کا دیوانہ نہیں ہے... اس کی دولت..."

"لعنت ہے اس دولت پر۔" جمال بھڑک اٹھا۔ "آپ اپنے پاس رکھیں اپنی دولت... مجھے اس میں سے ایک پیسا بھی نہیں چاہیے۔"

"غزالہ کو تو چاہیے۔ اتنی بدنامی اور اتنا خطرہ مول لے کے میں نے جو کمایا ہے کیا وہ میں قبر میں لے جاؤں گا۔ وہ تو جہنم کے انگارے ہیں۔" وہ طنز سے مسکرایا۔ "ہر شخص اپنی اولاد کے سکھ کے لیے کماتا ہے اور انہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں کہ پانچ لاکھ بھی کر سکو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تمہارے دوست مالی اعتبار رکھتے ہیں اور نہ تمہیں اس قابل سمجھا جاتا ہے۔ میرا سب کچھ غزالہ کے لیے ہے۔ اس کے بھائی بہت کما رہے ہیں جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ دولت ان کے قدم چوم رہی ہے اور ایک دن وہ مجھ سے کئی گنا زیادہ کر لیں گے۔"

"میں بھی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "چپ نہیں بیٹھا ہوں۔"

"کب تک کوشش کرو گے آخر؟ میں غزالہ کو تمہاری کامیابی کے انتظار میں بٹھائے رکھوں؟ اس کی شادی کی عمر تو بہت پہلے ہو گئی تھی اور اسے رشتوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ ایک ایس پی کے لیے دامادوں کی مارکیٹ بہت بڑی ہے۔ بالکل اوپن... بزنس مین' ڈاکٹرز' پروفیسرز چھوڑو... میرے اپنے محکمے کے نوجوان انسپکٹر اور نئے اے ایس پی بہت ہیں جو مجھ سے زیادہ ترقی کر لیں گے۔ تم اپنی خاندانی حویلی کے لیے مقدمہ لڑتے لڑتے مزید قلاش ہو جاؤ گے... میں نے کہا تھا کہ کرکٹ نہیں تو تم بھی نہیں۔ اب کیا میں یہ برداشت کر سکتا ہوں کہ تمام عمر تم غزالہ پر بوجھ بنو۔ اسے میں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا اور وہ مجبور ہو گی۔ یہ بات میں ایک لڑکی کے باپ ہونے کے ناتے کہہ رہا ہوں۔"

"آپ مجھے ایک اور موقع دیں پلیز...!" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن اب میں تمہیں ڈیڈ لائن دے رہا

ہوں۔ اس سال کے ساتھ ہی تمہارا چانس ختم ہو جائے گا۔ تین مہینے سے زیادہ کا وقت ہے۔ تمہارے پاس... کہیں قدم جم جائیں تو مجھے بتا دینا۔ اور ہاں... اور ایک خوش فہمی کو دماغ سے نکال دینا... غزالہ عاقل وبالغ ہے۔ از رائے شرع اور قانوناً" وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے مگر ایسا نہیں ہو گا۔ تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ شرع اور قانون کا استعمال اس ملک میں کتنا غلط ہو رہا ہے۔ پھر میں ٹھہرا ایک پرانا پولیس مین... میں جانتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔"

غزالہ نے ہاتھ جوڑ کے اور اس کے گلے میں اپنی گوری گوری عریاں اور سڈول بانہیں حمائل کر کے اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ اور اس کے ہونٹوں میں اپنے لب دیر تک پیوست رکھنے اور پھر اس کے چوڑے چکلے سینے کو سیاہ گھنگھریالے بالوں میں مخروطی انگلیاں پھیرنے اور اس کے ہاتھوں کو تھامنے اور اپنے دھڑکتے سینے پر اس کے ہاتھ رکھتے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا تھا وہ اس کے باپ کو برداشت کرے اسی طرح جب وہ جذباتی کیفیت میں اس کی جنونی، وحشیانہ حرکت اور نازیبا فعل کو برداشت کر لیتی ہے۔ اس کا باپ جائز و ناجائز کچھ بھی کہے... آخر وہ بھی تو اس کی بعض ناجائز بات کو برداشت کر نہیں لیتی ہے۔ اس نے غزالہ کی اس بات کو یاد کرتے ہوئے وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ برداشت کرتے کرتے اس کے اعصاب کی ایسی کی تیسی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ تقدیر نے جو کچھ بھی کی وہ سب اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس نے کرکٹ سے دوری اور بے روزگاری کو بھی غزالہ کے لیے ہی تو برداشت کیا تھا مگر اب معاملات اس نہج پر پہنچ چکے تھے جہاں وہ غزالہ کی محبت کو برداشت کر رہا تھا۔ مایوسی کے صحرا میں باغیانہ خیالات کا بگولا جب کبھی بھی اٹھتا تھا وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دبا لیتا تھا یا طوفان کی طرف پیٹھ کر لیتا تھا لیکن طوفان کی شدت تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے قدم اکھڑنے لگے۔ اسے

اس طوفان نے نہ صرف تہس نہس بلکہ تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا کہ آخر غزالہ اس کی کمزوری کیوں بن گئی ہے؟ وہ غزالہ کے حسن سے ہی نہیں بلکہ اس کے توبہ شکن جسم سے بھی محبت کرتا تھا جو اس کی ایک بیوی کی طرح ملکیت بن چکا تھا۔ بعض فعل، باتیں اور حرکات جو بیوی پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی اجازت دیتی تھی اور دے سکتی تھی۔ غزالہ نے برداشت کر لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ شاید غزالہ پھر کبھی اس کی طرف نہ دیکھے اور محبت اور تعلقات ختم کر لے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس سے جانے کتنی بار کھیل چکا تھا اور ہر ملاقات میں کھیلتا تھا لیکن پھر بھی اس کا جی نہ بھرا تھا۔ بہت سے محبوب ہر طرح سے دل بھر کے کھیلنے کے بعد بے زار ہو کر کسی اور کو محبوبہ بنا لیتے تھے۔ وہ اس لیے بھی تو غزالہ مرمٹا ہوا تھا کہ اس کی اجلی رنگت، تناسب، نشیب و فراز اور رسیلا بدن ایسا تھا کہ اس کی پیاس بجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ طوطا چشم غزالہ کے معاملے میں ہرگز نہ تھا۔ غزالہ کے باپ کا نوٹس ملتے ہی جمال پر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

اب اسے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ چلتے چلتے اس بری طرح تھک گیا ہے کہ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا ہے اور پھر اسے اپنے سامنے زمین کا آخری کنارا بھی نظر آ رہا ہے۔ کتابوں میں ضرور لکھا ہے کہ زمین پر بھی آدمی وہیں پہنچتا ہو جہاں سے وہ چلا تھا تو پھر چلنے کی کیا ضرورت ہے؟

جمال کو بھی صاف محسوس ہوتا تھا اس کا نقطہ انجام ہی نقطہ آغاز ہو گا۔ وہ گھوم پھر کے اور جھک مار کے بھی وہیں پہنچے گا جہاں لوٹ کے جانا ہے جو اس کے اختیار میں تھا۔ غزالہ نے تو اس وقت بھی کہہ دیا تھا کہ تم کرکٹ نہیں چھوڑ سکتے تو میں اپنا گھر چھوڑ دیتی ہوں۔ یہ ایک جذباتی بات تھی اور وہ خود بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ پھر دونوں منہ بولے میاں بیوی ہی نہیں سچ مچ کے میاں بیوی سمجھنے لگے۔ نام کے میاں بیوی نہ تھے۔ منہ بولی بہن اور بھائی بھی تو ہوتے تھے۔ لیکن اس میں جو

جذبہ کار فرما ہوتا تھا وہ ان دونوں کو میلا اور داغ دار کر دیتا تھا۔ یہ رشتہ بہت کم ہوتا تھا اس میں کوئی پاکیزگی نہیں ہوتی تھی۔ چالاک لڑکے منہ بولی بہن بنا کر دل کے ہر ارمان پورے کر لیتے تھے۔ کیوں کہ یہ راستہ شارٹ کٹ ہوتا تھا منہ بولی بہن اس سے دل بہلا لیا جائے۔ یہ منہ بولی بہن کیوں کہ نوجوان اور ناپختہ ذہن کی ہوتی تھی اس لیے اپنے منہ بولے بھائی کو قدرے اور معمولی تذبذب سے حوالے کر دیا کرتی تھی کیوں کہ بھائی کی من مانیوں سے بڑا کیف محسوس کرتی تھیں۔ اس بہانے ان کے تمام ارمان پورے ہو جاتے تھے۔ کیوں کہ منہ بولے بھائی کونے کھدروں میں خوب جھنجھوڑتے تھے۔ حقیقت وہی تھی جو غزالہ کے باپ نے بتا دی تھی۔ اس جیسے کسی خبیث ایس پی کی بی بی انجمن کی طرح بھرا بھرا سینہ تان اور بے حجاب سا کر کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں کہہ سکتی تھی کہ۔

"سن لے وڈیا تھانے دارا نہ تو میرا پیو، ایں تے نہ میں تیری دھی..."

نہ جمال کے لیے سلطان راہی کی طرح بڑھک مار کے اور گنڈاسا لہرا کے لیے یہ کہنا ممکن تھا "میں ٹوٹے کردیاں گا۔"

وہ راتوں رات ہیرو کو اٹھوا کے حوالات پہنچا سکتا تھا اور غائب بھی کرا سکتا تھا۔ اس پر ہر قسم کے مقدمات بنواتا اور اسے جیل بھجوا کے بیٹی کو اپنی مرضی کے داماد کے ساتھ رخصت کرنا اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ باپ کی ایک حد تک بیٹیوں کی ضد پوری کرتے ہیں اس لیے جمال اب تک محفوظ تھا۔ اگر ایس پی عبدالخالق کو پتا چل جاتا کہ جمال اس کی بیٹی کی عزت سے کھیل چکا ہے اور کرکٹ کی طرح لمبی اننگ کھیل رہا ہے۔ آؤٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے تو پھر اس کی لاش کا بھی پتا نہیں چلتا۔

اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا بن کر لپکا کہ کیا میں اور غزالہ چھپ کر شادی کر لیں؟ پھر عدالت میں حاضر ہو کے بیان دے دیں۔ ہائی کورٹ سے تحفظ مانگ لیں اور پریس کلب میں صحافیوں کو پہلے سے بتا دیں کہ ایس پی عبدالخالق سے انہیں کس قسم کا خطرہ لاحق ہے۔ آئی جی اور وزیر اعلیٰ سندھ سے صدر تک سب کے نام اپیل کر کے قبل از مرگ واویلا کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں بشرطیکہ غزالہ مان جائے۔ ایس پی (نعوذ باللہ) کوئی خدا تو نہیں ہوتا اور اس شہر میں ایک سے ایک فرعون بے ساماں بیٹھا ہے۔ ایس پی کی پوزیشن کیا ہے۔ بس حملہ فوری شدید اور اچانک ہونا چاہیے کہ اسے اپنا دفاع بھی مشکل ہو جائے۔

اس حکمت عملی نے گھپ اندھیرے میں شعاع بن کر ایک نئی راہ دکھائی جیسے ہی غزالہ اس سے ملنے اور پوچھنے آئی تو اس نے غزالہ کو اپنی آغوش میں لے کر بے تحاشا چومنے لگا۔ پھر اس نے حد سے تجاوز کیا تو غزالہ نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے جمال! آج تمہارا موڈ بڑا خوش گوار ہے۔ جیسے تم جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئے ہو، پہلے بتاؤ۔ کیا بات ہے؟"

جمال نے اس کے ریشمی بالوں سے کھیلتے ہوئے اپنا آئیڈیا اس کے سامنے رکھ دیا۔ "کیا ہے؟ کیا خوشی اور حیرت کی بات نہیں۔" غزالہ ناگواری اور خاموشی سے سنتی رہی اور اس کا ہاتھ سراپا پر سے ہٹا کر ناگواری سے بولی۔

"مجھے تمہارا یہ فیصلہ دل کو نہیں لگا۔ یعنی تم کرکٹ ہی کھیلو گے؟" واٹ نانسنس۔"

"یار! تمہارا باپ تو پاگل ہے۔ اڈیٹ ہی ہے اور تم بھی پاگل ہو گئی ہو کیا؟ کرکٹ کھیلنا ایک خداداد صلاحیت ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھانا کفران نعمت ہے۔ شاہد آفریدی، جاوید میاں داد، وسیم اکرم، ٹنڈولکر، کوہلی اور تمام سپر اسٹار کروڑ پتی ہیں... ٹیسٹ کیپ ملتے ہی میرا شمار بھی کروڑ پتی کھلاڑیوں میں ہو گا۔ میں نے اتنے دن خوار ہونے کے بعد اور پھر میری جان تم نے بھی تو دیکھ لیا ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں تو کیوں نہ کرکٹ کھیلوں؟ یہ کوئی جرم ہے یا کوئی غیر اخلاقی بات ہے۔ سارا ملک کیا اس کے غبار میں مبتلا نہیں ہے!؟"

”وہ سب مجھے معلوم ہے... مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ تم پھر پہلے کی طرح کامیاب ہو جاؤ گے۔ وہی مقام حاصل کر لو گے؟“ وہ اس کے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”مجھے یقین ہے... بس کوشش کرنے کی شرط ہے۔ پریکٹس دس بارہ دن کرنے سے میں پھر فارم میں آجاؤں گا۔“

”اوکے... تم کوشش کرو۔ اس کے لیے بھی تین مہینے کافی ہوں گے یا نہیں؟ دیکھو اس کے اندر اندر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دینا۔“

”شیور... صرف ایک مہینے کی نیٹ پریکٹس میں میری فارم واپس آجائے گی۔ تم دیکھ لینا۔ صرف ایک میچ کسی ٹیم میں کھیلتے ہی ادارے مجھے خود بخود بلائیں گے۔ انہیں سخت ضرورت اچھے اور باصلاحیت کرکٹر... خصوصاً شاہد آفریدی کا نعم البدل... کراچی سے لے کر خیبر تک صرف میں ایک ہی جارحانہ کھیل کھیلنے اور ہر اوور میں کم سے کم چار چھکے مارنے والوں ہوں... میری جان غزالہ! میں احمق تھا کہ میں نے عزت شہرت اور دولت کی گولڈن ٹرائی چھوڑ دی تھی۔ (Triangle) یہ کوئی منشیات کے حوالے سے گولڈن ٹرائی نہیں تھی... کاش؟ آج یہ دن دیکھنا نہیں پڑتے... میں نے تین مہینے سے کرایہ تک ادا نہیں کیا۔“

”کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ڈیڈی کا رد عمل کیا ہوگا؟ یہ معلوم ہے نا...؟“

”معلوم ہے... مگر وہ اس بات کے پابند ہیں جو انہوں نے مجھ سے کہا۔ مگر تین مہینے سے پہلے وہ تمہاری شادی نہیں کریں گے؟“

”کیوں نہیں کر سکتے... جب تم بد عہدی کرو گے تو وہ بھی کسی معاہدے کے پابند نہیں ہوں گے۔“

”چلو ہم پہلے شادی کر لیتے ہیں تاکہ ہم منہ بولے میاں بیوی قانونی اور شرعی اور میاں بیوی ہو جائیں۔ لیکن ابھی اس کا اعلان نہیں کرتے ہیں۔ جب میں کامیاب ہو جاؤں اور وہ تمہاری شادی طے کرنے لگیں تو انہیں بتایا جا سکتا ہے۔ گویہ ایٹم بم دھماکا ہوگا۔ مکمل رازداری۔“

”دیکھو جمال...!“ غزالہ کا گداز بدن اس کے بازوؤں کے حصار میں کسمسایا۔ ”مجھے جتنا تمہارا خیال ہے اتنا ہی مجھے اپنے ڈیڈی کا بھی اور ان کی جو عزت ہے اس کا بھی... کرکٹ کے معاملے میں ان سے اختلاف کرنا ممکن ہے۔ ساری دنیا انہیں قائل کر سکتی ہے کہ یہ شادی غلط نہیں لیکن آج شادی کرنے کا کوئی جواز نہیں... تم پہلے اپنی پرانی پوزیشن تو حاصل کر لو۔ شادی کا کیا ہے وہ تو ایک گھنٹے میں بھی تو ہو جائے گی اور ڈیڈی کو بھی قبول کرنا پڑے گی۔ تین مہینے کے بعد میرے پاس دلیل ہوگی تمہاری کامیابی شہرت اور عزت کی جو آج نہیں ہے۔ آج تمہیں ڈیڈی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ جب تم بینک میں اے وی پی تھے تو تمہاری حیثیت بھی تو تھی۔“

”مگر اس وقت تو تم نے تجویز پیش کی تھی نا شادی کی؟“ جمال برہم ہو کر بولا۔

”اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم واقعی کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اپنی غلطی دل و جان سے تسلیم کرتی ہوں۔“ پھر غزالہ کے ہاتھوں نے اس کے گالوں کو بڑے پیار سے تھپ تھپایا۔ ”پھر ہم دونوں غیر قانونی اور غیر شرعی اور منہ بولے میاں بن گئے۔ سہاگ رات بھی منالی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ سہاگ رات منانے سے پہلے کیوں نہ منہ بولے بھائی بن جائیں۔ میں نے اس تجویز سے اس لیے اتفاق نہیں کیا تھا کہ جب ہم دونوں کے دلوں اور جسموں کا ملاپ ہو رہا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یار! یہ منہ بولے بھائی بہن کا رشتہ بھی خوب ہے۔ منہ بولے بھائی بہن بن جانے سے انہیں گھروں میں آمد و رفت اور ہر قسم کی آزادی مل جاتی ہے جس سے دونوں خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میری جان!“ جمال نے اس کے لب شیریں کی مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا لب شیریں تو کسی مٹھائی کی دکان میں

نصیب نہیں اور نہ ملتا ہے۔ تم صرف شیریں ہی شیریں ہو۔ صرف تمہارے لب ہی نہیں بلکہ انگ انگ سے شیرینی اہلتی ہے۔ اور سراپا شیریں اتنا ہے کہ جی نہیں بھرتا ہے۔ مگر نئے سال کے ساتھ ہی ہم ایک ہو جائیں گے۔ اس وعدے پر قائم رہنا میری شیریں۔“

غزالہ بستر اور اس کی آغوش سے نکل کر اس کرسی کی طرف بڑھی جس پر اس کا پرس اس کے لباس اور زیر جامے میں دبا ہوا تھا۔ اس نے اپنا پرس نکالا تو جمال نے اسے ایسی ناقدانہ نظروں سے دیکھا جیسے کسی میوزیم میں رکھی تلوار شوکیس میں رکھی ہوتی ہے۔ اس کے بال گردن تک بڑی نفاست سے ترشے ہوئے تھے اور اس کی پشت اور سراپا جمال کی طرف تھا۔ اس نے پرس سے نوٹ نکالے اور پھر پرس رکھنے کے لیے رکوع کے انداز میں جھکی تو ایسا زاویہ بنا کہ وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

غزالہ نے نوٹ سرہانے والی میز پر رکھ کر اس پر نوٹ بک رکھ دی اور اس کے پاس آکر بولی۔

”یہ رقم رکھ لو... تین مہینے کا بقایا کرایہ ادا کر دو اور ایک ماہ کا پیشگی کرایہ بھی ادا کر دو... کھانا کسی عام قسم کے اور فٹ پاتھ کی دکانوں پر کھانے کی ضرورت نہیں... تین ماہ تک اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ میں کھاتے رہنا۔ اچھا میں اب چلتی ہوں۔“

وہ کپڑے اور زیر جامے پہننے کی غرض سے کرسی کی طرف گھومی تو جمال اسے کیسے جانے دیتا۔ اس کی بانہہ پکڑ کے اسے بستر پر کھینچ لیا۔ گو اس نے ابھی جو ہیجان خیز نظارہ دیکھا تھا وہ اس نے پہلی بار نہیں دیکھا تھا اور نہ نیا تھا۔ لیکن غزالہ ہر ملاقات اور تنہائی میں نئی معلوم دیتی... پھر دونوں جذبات کی رو میں ان جانے راستے پر چل پڑے۔ وہ وحشی بن گیا۔ جب طوفان گزر گیا تو اس نے غزالہ کے چہرے کو دیکھا جس پر کرب اور درد سا تھا۔ اس کے چہرے پر جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے غزالہ...! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ کیا بات ہے؟ کیا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے؟“

”جمال...! آج تم نے تیسری مرتبہ یہ وحشیانہ اور اذیت ناک فعل کیا ہے۔ نازیبا... ناشائستہ... عورت کی فطرت سے ہٹ کر... تم نے غلط راستہ کیوں اختیار کیا... یہ زیب نہیں دیتا تھا... دیکھو شادی کے بعد تم پھر اس فعل کے مرتکب ہوئے تو تمہیں چھوڑ دوں گی۔“

جمال مسکرایا۔ ”دیکھو محبت اور جنگ میں ہر بات اور فعل جائز ہے... جائز ناجائز اور ناجائز' جائز... کل کے اخبار میں یہ خبر تھی کہ فیملی کورٹس میں بیس فیصد عورتوں لڑکیوں نے خلع کی جو درخواست دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے شوہر انہیں غیر فطری فعل پر مجبور کرتے ہیں... امریکہ یورپ میں جب یہ فعل عام ہو رہا ہے تو یہاں کیوں نہیں... جب کہ مغربی تہذیب کی تقلید کر رہے ہیں تو پھر تذبذب کیوں... میرا ایک دوست جو شوبزنس کی لڑکیوں عورتوں کے معاملات دولت مندوں سے طے کراتا ہے وہ کہتا ہے کہ ان کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کی ہر بات کو ماننا ہوگا... نہ صرف وہ بلکہ ٹی وی اور فلموں کی اداکارائیں اور لیڈی اینکرز بھی تیار ہو جاتی ہیں... اس لیے کہ منہ مانگی رقم مل جاتی ہے اس کے بغیر خریدار تیار نہیں ہوتے ہیں اور پھر ارے بارے ہو جاتے ہیں...“

”تم بہت بڑے بدمعاش ہو۔“ غزالہ نے اس کے منہ پر پیار سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ”جلدی سے درد کی گولی دو اور کافی بنا کر پلاؤ۔“

غزالہ نے اسے کچن کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے دل میں اعتراف کیا کہ جمال نے غلط نہیں کہا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ وڈیرے، جاگیردار اور رئیس اور دولت مندوں نے بھی لڑکے پال رکھے تھے۔ اس نے سوچا کہ امریکہ یورپ کی طرح یہاں بھی مردوں کو مردوں لڑکوں سے شادی کی اجازت ہو جانا چاہیے۔ حیرت کی بات تھی مرد کیوں عورت سے اس طرف لطف اٹھاتے ہیں؟

☆ ☆ ☆

اپنے چھوڑے ہوئے نقش قدم پر الٹے پاؤں جانا

آسان نہ تھا۔ جمال نے بہت سوچ کے ایک وسیلہ تلاش کیا اور رازداری کے ساتھ مختلف مراحل طے کرتا ہوا دوسرے بینک کے نائب صدر سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی پذیرائی بھی ہوئی۔

"ہم ضرور خوش آمدید کہیں گے لیکن یہ مسئلہ تمہارا کہ تم اپنی جگہ بنا سکتے ہو یا نہیں؟ مستقل ٹیم سے کسی کو ڈراپ کرنا آسان نہیں... کیوں کہ اس سے بینک کا امیج خراب ہوتا ہے..." اسپورٹس کے انچارج نائب صدر نے کہا۔

"سر...! میں آپ کی بات سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تم سے معذرت خواہ ہوں... تم نہیں سمجھتے' سمجھتے تو پہلا غلط فیصلہ ایسے وقت نہ کرتے؟ تم نے اپنی ٹیم کو اس بحران میں ڈال دیا تھا کہ کسی وجہ کے بغیر... ہر شخص جانتا ہے اس بات کو... اب کیا ضمانت ہے کہ تم قابل اعتماد ہو۔"

"مجھے آپ کی اس بات سے انکار یا بحث نہیں۔" اس نے ندامت سے کہا۔ "ایک غلطی تو کوئی دوبارہ نہیں کرتا ہے ٹھوکر کھانے کے بعد۔"

"مگر کچھ لوگ کرتے ہیں غلطی پر غلطی کرتے ہیں اور انہیں احساس نہیں ہوتا ٹھوکر کھانے کے باوجود... خدا کرے تم نہ کرو۔ دو ہفتے کے بعد ایک نمائشی میچ ہے۔ چھ ستمبر کے موقع پر جو یوم دفاع ہو گا۔ اس میں تمہاری فارم اور پرفارمنس دیکھیں گے' پھر فیصلہ کریں گے... ٹھیک ہے دوست!"

"نائب صدر نے خوش اخلاقی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ "گڈ لک۔"

"تھینک یو سر!" اس نے ایک عجیب سی خوشی محسوس کی۔ "کیا میں نیٹ پریکٹس کے لیے آ سکتا ہوں؟"

"تم کوچ سے مل لو۔" نائب صدر نے جواب دیا۔

"میں اس سے کہہ رہا ہوں۔"

کوچ حد درجہ خردماغ اور بدتمیز ثابت ہوا۔ جو باتیں نائب صدر نے شائستگی سے کی تھیں وہی اس نے جمال کے سامنے منہ پر بدتمیزی سے دہرائیں اور اسے خاصا بے عزت کرنے کے بعد ترس کھاتے ہوئے اجازت مرحمت فرما دی کہ... "اچھا آجانا۔ شام کو دیکھیں گے۔"

اس کا پس منظر تھا کہ سات آٹھ ماہ پیشتر جمال کی ٹیم نے اس کی ٹیم کو ایسی زبردست شکست دی تھی کہ اس کی ملازمت خطرے میں ہو گئی تھی دوسرا جمال کا دبدبہ اور شہرت ایسی تھی کہ دوسری ٹیموں کے کوچز اس سے حسد و جلن کرتے تھے اور پھر اسے غزالہ کے ساتھ دیکھتے تھے جو شعلہ مجسم تھی۔ اس لیے نیٹ پریکٹس کرنے والوں کا رویہ بھی کم جارحانہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جمال کا آجانا کسی کے جانے کی گھنٹی ہے۔ خطرے کی یہ گھنٹی سب ہی سن رہے تھے مگر وہ زیادہ پریشان تھے... جو ابھی نووارد اور کم عمر بھی تھے اور اپنی صلاحیت کے منوانے کی منزل پر رکے ہوئے تھے۔ یہاں بھی گندگی' غلاظت اور تعفن تھا۔ کیوں کہ کوچ کی نظر میں وہی منظور نظر تھا۔ جو اس کی ہر بات مانتا ہے۔ فلمی دنیا کیا' شوبزنس کیا' چرچ کیا اور کھیل کا میدان کیا۔ اس کوچ کی کمزوری نوجوان لڑکے تھے۔

ان سب نے ٹیم اسپرٹ کے انداز میں حکمت عملی اختیار کر لی اور جمال کو پریکٹس کا موقع یوں دیا کہ اپنا اور اس کا وقت ضائع کیا۔ کم زور ترین باؤلرز نے جو درحقیقت بیٹسمین تھے اسے فضول گیندیں کرائیں۔ وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا اور برداشت کرتا رہا۔ وہ پہلے ہی دن متحدہ محاذ کے خلاف اعلان جنگ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رات کے وقت کوچ سے ملنے اس کے فلیٹ پر گیا تو راہ داری میں اندھیرا تھا لیکن کوچ کے فلیٹ میں روشنی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے جو بیڈ روم تھا اس کی روشنی میں اس نے کوچ کو سولہ برس کے لڑکے کے ساتھ بستر میں بے لباس اور باہم پیوست دیکھا۔

اس نے دوسرے دن کچھ سینئر پلیئرز سے رابطہ کر کے شکایت کی جو اس کے ساتھی تھے مگر انہوں نے

آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا کہ جو ٹیم سے باہر ہو گیا وہ باہر ہو گیا۔ جو اندر ہے وہ اندر ہے۔ سب کا ساتھی ہے اور سب اس کے ساتھ ہیں۔

زیادہ خرابی اگلے دن ہوئی۔ جب ایک خاتون اسپورٹس رائٹر شہناز چوہدری نے جمال سے منسوب بیان اخبارات میں شائع کرا دیا۔

"جمال احمد کی کرکٹ میں واپسی یقیناً" ان کے پرانے حوالوں کے لیے باعث مسرت ہو گی۔ اسپورٹس افیئرز کے انچارج سے ملاقات کے بعد جمال احمد نے بتایا کہ نائب صدر کو یقین ہے کہ اس سال بھی ٹرافی انہی کے پاس رہے گی۔ انہوں نے گزشتہ برس ٹرافی حاصل کرنے میں جمال احمد کے تعاون کی تعریف کی جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

اس انٹرویو نے دونوں طرف آگ لگا دی۔ جمال احمد پہلے جس بینک کی طرف سے کھیلا تھا اس کے صدر نے دوسرے دن دوسرے بینک کے صدر کو فون کر کے کہا۔ "ویری گڈ! تو یہ تم تھے جس نے جمال کو فائنل کھیلنے نہیں دیا تھا کتنی رشوت دی تھی تم نے اسے ٹرافی اٹھانے کے لیے۔"

"یہ بکواس ہے۔ سراسر بہتان ہے۔" وہ بگڑ کر بولا "ہم کرکٹ کھیلتے ہیں۔ سٹہ نہیں۔"

"دس از ناٹ کرکٹ۔" پہلے صدر نے ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخ دیا۔

دوسرے دن بینک کے صدر نے نائب صدر کو طلب کر لیا اور تیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ بات آپ نے کہی تھی؟ کیا مطلب ہے آخر اس تعاون کا جو جمال احمد سے منسوب کیا گیا ہے؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اس الو کے پٹھے سے... وہ خود ہی آیا تھا میرے پاس ملازمت کے لیے اور میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ سوال... ہمارے پاس فی الحال کوئی جگہ نہیں ہے۔ یوں بھی ہم اس پر بھروسا کیسے کر سکتے ہیں۔"

"تو کیا یہ اسپورٹس رائٹر مس شہناز چوہدری نے کیا جھوٹ بولا ہے؟"

"جمال نے اس سے جو کچھ کہا وہ چھاپ دیا... کیا میں نوٹس دوں اخبار کو... یا پھر تردید پر اکتفا کروں؟"

"نوٹس کی خبر ضرور دو اور اس باسٹرڈ جمال سے کہو کہ اس کی صورت بھی نظر آئی مجھے کسی کرکٹ گراؤنڈ میں تو اسے شوٹ کر دوں گا۔ تمہیں معلوم ہے وہ کیا کہتے ہیں جو فائنل ہار گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رشوت دی تھی جمال کو... اور اس نے استعفیٰ ہمارے کہنے سے دیا تھا۔ کیا صرف ایک آدمی تھا ان کی ٹیم میں... اور ہم کیا سٹے باز ہیں؟"

جمال کی کسی نے نہ سنی۔ اسپورٹس کی انچارج نائب صدر نے گالیاں دے کر عملاً "باہر پھنکوا دیا۔ جمال سخت ذلت کے بعد مشتعل ہو کر اپنے پرانے بینک پہنچا اور کسی نہ کسی صورت بینک کے صدر کو چند منٹ کی ملاقات پر راضی کر لیا۔

"بولو..." اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "دو منٹ میں سب کچھ کہہ دو۔"

"سر! وہ میری مجبوری تھی غلطی تھی۔" جمال نے ندامت سے جواب دیا۔

"پھر میں کیا کروں؟" اس نے گھنٹی بجائی "تم جا سکتے ہو۔ بائی دے وے کتنی رقم ملی تھی تمہیں فائنل میں نہ کھیلنے کی۔ کیا وہ سب اڑا دی تم نے؟" جمال نے آخری کوشش کی وہ مس شہناز چوہدری اسپورٹس رائٹر اپنے بیان کی تردید کر دے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ کسی نے بڑی ہوشیاری سے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ جیسے کسی بات کا اس سے انتقام لیا گیا۔

ایڈیٹر نے بڑے معذرت خواہانہ لہجے میں اس سے کہا۔

"سوری مسٹر جمال احمد! وہ تو اسلام آباد چلی گئی ہے کل... وہاں سے لندن جانا ہے۔ ورلڈ ویمن کرکٹ میچز کی کوریج کے لیے۔"

"آپ تردید شائع کر دیں تاکہ جو میرے ساتھ گیم ہو رہا ہے وہ ختم تو ہو۔"

"میں کیسے تردید کر سکتا ہوں جو بات آپ نے ان

سے کہی تھی؟" ایڈیٹر بولا۔

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ یہ تردید تو آپ چھاپ سکتے ہیں۔"

"یہ تو مس شہناز چوہدری ہی بتا سکتی تھیں۔ ان کے واپس آنے کے بعد فیصلہ ہوگا۔"

جمال احمد ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایڈیٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"میں کیس کردوں گا اور ایک کروڑ کے ہرجانے کا دعوا بھی۔۔۔"

"ضرور کریں۔۔۔ آج کل تو فیشن ہے کیس کرنے کی دھمکی دینے کا۔ بڑے بڑے سیاست دان ہیں اور صحافی بھی ایک دوسرے پر الزامات لگاتے ہیں۔ تردید کرتے ہیں اور ہتک عزت کی بات کرتے ہیں اور ہتک عزت کا قانون بھی بس لطیفہ ہے۔"

مس شہناز چوہدری بھی اس کی فین رہی تھی اور اس سے کچھ عرصہ تعلقات بھی استوار رہے تھے۔ وہ تیس برس کی بڑی حسین و جمیل، پرکشش اور سیکسی عورت تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ کبھی سفید ساڑھی میں ہوتی تھی جس کا بلاؤز بغیر آستینوں کا ہوتا تھا۔ اس کا گریبان آگے پیچھے نیچی تراش کا ہوتا تھا جو زیر جامہ لگتا۔۔۔ فراز کے ابھار دلوں کو برماتے تھے۔ ساڑھی وہ کمر کے خم اور ناف سے نیچے باندھتی تھی۔ بلاؤز اور کمر کے درمیان بدن عریاں نظر آتا۔ بھرے بھرے کولہے اور سڈول پیر قیامت ڈھاتے تھے۔ عریاں بانہیں خنجروں کی طرح بے نیام ہوتی تھیں۔ صراحی دار گردن تھی۔ بال بڑی نفاست سے گردن تک ترشے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش میں بڑی دل کشی تھی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بھی بہت خوب صورت تھیں۔

ساڑھی کے علاوہ وہ کالے رنگ کی بغیر آستینوں کی جرسی پہنتی جو نہایت تنگ و چست اور نیچی تراش کے گریبان کی ہوتی تھی اور اسی رنگ کی جینز جو اس کے نشیب و فراز، عضو عضو، باریک سے باریک خدوخال، تناسب اور خطوط کو ابھار دیتی تھی۔ اس لباس میں وہ نہ صرف بے حجاب بلکہ بے لباس دکھائی دیتی تھی۔ یہ لباس عام اور فیشن ہو گیا تھا جو لڑکیوں عورتوں کے جسموں سے جونک کی طرح چمٹا ہوتا تھا۔

چوں کہ وہ اسپورٹس رائٹر تھی اور اخبار کی طرف ملک کے بڑے بڑے شہروں میں اسپورٹس کوریج اور انٹرویوز کے لیے جانا پڑتا تھا۔ وہ بہت مصروف رہتی تھی جس کے باعث زیادہ دن ان کے درمیان ہم بستری نہ رہ سکا تھا۔ وہ بڑی مہربان اور فیاض عورت تھی۔ جب کبھی بھی وہ اس کے فلیٹ پر جاتا تو اسے کوئی نہ کوئی نئی بلیو فلم دکھائی ضرور تھی۔ اس کی اجلی رنگت، مکھن جیسا بدن اور قامت کی آتش فشاں سے کم نہ تھی۔ اس نے اپنے فلیٹ کی ایک ڈپلی کیٹ چابی دی ہوئی تھی جو اس نے واپس کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی شہناز چوہدری کو یاد رہا تھا۔ اس نے آج اس کے فلیٹ کی چابی تلاش کی تو اسے اتفاق سے الماری کی دراز میں مل گئی۔ اسے شہناز پر بڑا غصہ آیا تھا۔ وہ اس سے مل کر دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یہ انٹرویو اس نے کس کی ایماء اور اشارے پر چھاپا ہے۔ اس نے ایڈیٹر کی باتوں سے اندازہ کرلیا تھا کہ شہناز چوہدری کراچی میں ہے۔ ایڈیٹر نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ شہر سے باہر ہے۔ اسے ڈپلی کیٹ چابی کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ گھنٹی بجتے ہی شہناز چوہدری نے چند لمحوں کے بعد دروازہ کھول دیا۔ وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی اور شب خوابی کے سیاہ جالی دار ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ اس نے شہناز چوہدری سے اس انٹرویو کے بارے میں پوچھا تو بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی۔ کسی بھی قیمت پر بتانے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ پھر جمال کو غصہ آگیا۔ اس نے اپنی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن جب وہ اسے غلاظت کے دلدل میں لے کر دھنس گیا تو اس کے غلط راستے پر سخت احتجاج کیا۔ اس کی کراہوں اور سسکیوں کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ اسے تہس نہس اور تاخت و تاراج کرکے چلا آیا۔

جمال کے ساتھ۔۔۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم

ہوئے والی بات ہو گئی۔ خود اس نے جو تردیدی بیان دیا اس کی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اس لیے کہ اصل تردیدی بیان کی جو ضرورت تھی وہ شہناز چوہدری کی۔۔۔ اس نے جو شہناز چوہدری کے ساتھ جو مذموم فعل اور حرکت کی تھی وہ شہناز چوہدری کے نزدیک ایک عورت ہونے کے ناتے ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ جمال نے رخصت ہوتے وقت اس سے کہا تھا کہ اس میں میرا نہیں بلکہ تمہاری گوری رنگت، مکھن جیسے رسیلے بدن اور قیامت خیز سراپا اور تناسب کا تھا۔ شہناز چوہدری نے اسے بڑی غلیظ گالیاں دیں اور دھمکی بھی دی تھی کہ اسے کسی دن جیل کی ہوا کھلاوے گی۔۔۔ جمال نے دوسرے دن ایک دوست کو ڈپلی کیٹ چابی دے کر بھیجی جو تھا اور باہر فوٹوگرافر اور بلیک میلر بھی تھا۔۔۔ اس کا وہ دوست شہناز چوہدری کے ہاں بھیجا تو وہ بے لباسی کی حالت میں سو رہی تھی۔ اس نے شہناز چودھری کو نیند کی حالت میں کلوروفارم سونگھا کر اپنے ارمان پورے کیے اور سیلفی بنائی اس کے ساتھ اور اس بات کا خیال رکھا کہ اس کی کوئی تصویر نہ آنے پائے۔ اس نے جمال کو ان تصویروں کا لفافہ دیتے وقت کہا تھا کہ یہ لمحات ساری زندگی ناقابل فراموش رہیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے اس سے کسی نہ کسی طرح تعلقات قائم ہو جائیں۔

جمال نے اسے کوریئر سروس سے تصویریں بھیج دیں۔ شہناز چوہدری ان تصویروں کو دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ اس کی تصویریں ہیں۔ تقریباً" بارہ عدد تصویریں ہر زاویے سے تھیں۔ چھ تصویریں تو نامناسب فعل کی تھیں۔ پھر شام کے وقت جمال احمد نے اسے فون کرکے کہا تھا کہ یہ تصویریں اس لیے بنائی گئی ہیں کہ تم نے میری ماں کو بڑی فحش اور ننگی گالیاں دیں۔ اگر تم نے پھر میرا کوئی انٹرویو اخبار میں کسی کی ایماء پر شائع کیا تو تمہاری یہ تصویریں میڈیا کو پہنچ جائیں گی۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ کرکٹ ایسوسی ایشن کے ایک اہل کار کا بیان آگیا۔

"جمال احمد کے خلاف رشوت لے کر حریف ٹیم کو ٹرائی دلوانے کے الزام کی تحقیقات کی جائیں گی۔"

یعنی اب تک تعاون کا لفظ استعمال ہو رہا تھا تو اسے اب رشوت میں بدل گیا۔ تحقیقات خاک ہونی تھیں۔ ایسوسی ایشن کے عہدے دار کی خوشنودی حاصل کرنے والے چمچے میدان میں خود پڑے اور انہوں نے گول مول الفاظ میں تصدیق کردی کہ الزام بے بنیاد بہرحال نہیں تھا۔ کیوں کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ آخر ایسا الزام آج تک کسی اور کے خلاف نہیں لگایا گیا۔

جمال کو نبرد آزما ہوتا رہا۔ آخر وہ کس کس سے لڑتا۔ اس کے خلاف سازش ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے شہناز چوہدری کو بے درد اور سفاکی اور وحشیانہ طور پر پامال کیا تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا اور اس بات کو اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ اسے کرکٹ سے باہر رکھنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ کرکٹ کی دنیا میں یہ پہلا سانحہ نہیں تھا۔ قومی کرکٹ ٹیم بہت سے ہیروز کو اس طرح سے بولڈ کردیا گیا تھا کہ وہ آؤٹ ہو گئے۔ بیان بازی، قانونی نوٹس، مظاہرے اور جلسے۔۔۔ سب بیوروکریسی کے لکھے کو نہیں بدل سکے تھے۔ یہ بات ایس پی عبدالحق نے بہت پہلے جمال کو سمجھادی تھی۔ صرف ایک ہفتہ قبل پہلے جمال نے جو خواب دیکھے تھے وہ سارے کے سارے چکنا چور ہو گئے تھے۔ تین مہینے تو ابھی بہت دور تھے۔ نیا سال آنے تک بہت کچھ ہونا باقی تھا جس کا جمال کو اندازہ نہ تھا۔ جب ستارے گردش میں ہوں تو آدمی کی کوشش کیا کرسکتی ہے۔ تقدیر مہربان تو پھر مچھر بھی پہلوان۔۔۔ قسمت خراب ہو تو سیر کو سوا سیر ملے کر لے لمبے ہاتھ۔۔۔

ایک روز اچانک اور غیر متوقع غزالہ رات کو اس کے فلیٹ پر ساری رات رکنے کے بہانے آئی۔ اس نے گھر والوں سے کہا کہ وہ ایک سہیلی کی مایوں میں جا رہی ہے۔ وہ دو ایک مرتبہ ایسی ہی دھول جھونک کر جمال کے پاس آ چکی تھی۔ اس رات بھی جمال بہت فکرمند اور پریشان تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کہیں سے

شراب کا بندوبست کرلے اور نشے میں ساری پریشانی بھول جائے۔ غزالہ بھی کسی شراب سے کم نہیں تھی۔ وہ اس شرط پر رکی تھی کہ جمال سابقہ اذیت ناک اور نامناسب فعل نہیں کرے گا۔ جمال نے غزالہ کی بات رکھ لی تھی۔ ورنہ اس کا جی کئی بار چاہا تھا کہ بدعہدی کرے۔ کیوں کہ غزالہ کے تناسب اور نشیب و فراز اور دل کشی اسے بہکاتی رہی تھی۔ وہ جیسے غلط راستے پر چلنے کا عادی ہونے لگا تھا۔ اس رات دونوں منہ بولے میاں بیوی نے خوب جشن منایا اور اس نے غزالہ سے دل بہت خوش کیا۔ اسے وہ وحشیانہ انداز سے جھنجھوڑتا رہا۔

اس کے پاس غزالہ کی رقم میں سے ابھی تین ہزار روپے باقی تھے۔ غزالہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ دو دن کے بعد اسے بیس ہزار کی رقم لا کر دے جائے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ غزالہ سے ملتا اور گردش حالات کی پیدا کی ہوئی صورت حال کے بارے کچھ سوچتے اور کوئی نیا لائحہ عمل مرتب کرتے۔ وہ غزالہ کو زیر دام لانے کی کوئی نئی ترکیب بناتا یا اپنے چچا اور عم زادے سے ملنے کے لیے کچھ کرتا..... بدبختی کے ترکش کے آخری تیر نے اس کا کام تمام کردیا۔

اچانک ایک صبح پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ تھانے پہنچ کے اسے علم ہوا کہ اس نے رانی کی بے حرمتی کی اور اس کی مزاحمت پر قتل کردیا۔ وجہ قتل واضح تھی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان جائداد کی مقدمے بازی جاری تھی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان خون کا رشتہ خون کی پیاس میں بدل چکا تھا۔ جمال نے حال ہی میں چچا کے گھر جا کر انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے تصفیہ نہ کیا تو ان کے حق میں برا ہوگا۔ وہ ان سے زبردستی پانچ لاکھ روپے کا ایک چیک بھی لکھوا کے لے گیا تھا جو اگلے روز انہوں نے کینسل کردیا۔ بینک کو لکھا ہوا خط ایک تحریری ثبوت تھا۔ چچا نے صاف لکھا تھا کہ ان کا ناہنجار گن پوائنٹ پر پانچ لاکھ کا چیک لے گیا تھا لہٰذا اسے منسوخ تصور کیا جائے۔ خط میں چیک کا نمبر بھی تھا اور تاریخ بھی درگزر سے کام لیتے ہوئے چچا نے اس وقت پولیس کو مطلع کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور اس خیال سے بھی کہ یہ چیک منسوخ کرایا جاسکتا ہے۔ خط میں چیک نمبر بھی تھا اور تاریخ بھی پولیس کے پاس مجرم کے علاوہ وجہ قتل بھی تھی اور اس کے خلاف واقعاتی شہادت بھی.....

پولیس کو دن رات اور رات کو دن کہلانے اور مجرم سے اپنی مرضی کا اقبال جرم کرانے کا جو فن آتا تھا وہ اس میں مہارت رکھتی تھی۔ اب جانے کتنے بے گناہوں کو تختہ دار پر چڑھا چکے تھے اور چڑھاتے رہتے تھے۔ ان کے سر پر بے گناہوں کا خون بھی تھا اور انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ مرنے کے بعد وہ خدا سے جواب دہ ہوں گے۔ انہیں نہ تو خوف خدا تھا اور نہ موت کا..... اس لیے کہ وہ خود کو خدا سمجھتے تھے۔

اگر کسی کیس میں کوئی مجرم ہاتھ لگ گیا اور وہ بے گناہ ہوا اور غلطی سے اس کی بیوی، بہن اور ماں بھی تھانے پہنچ کر فریاد کرتی کہ وہ بے گناہ ہے تو اس کی شامت آجاتی۔ ان کی اجتماعی بے حرمتی ہوتی اور غیر فطری فعل بھی کیا جاتا تھا ملزم کے سامنے..... وہ کہتا کہ یہ میری ماں ہے۔ اس کا تو کچھ خیال کرو؟ کالی بھیڑوں پر جوں تک نہیں رینگتی..... وہ ہنستے اور قہقہے لگاتے اور کہتے تھے کہ تمہاری ماں اس عمر میں بھی کیا چیز ہے۔ اس کے ساتھ جو فعل کیا وہ اسے اور ہم بھی فراموش نہیں کریں گے۔ پورا تھانہ اور اس کا عملہ اس کی ماں بہنوں اور بیوی سے ہر طرح سے دل بہلاتا تھا۔

جس تھانے میں اسے لے جایا گیا تھا اس میں ایک کمرا ایذا خانہ تھا۔ جس میں پولیس مجرم پر ہر قسم کا تشدد کرتی تھی۔ گو پولیس کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ ملزم پر تشدد کرے اور اسے ایذا پہنچا کر اقبال جرم پر مجبور کرے۔ اس کمرے میں ایک سولہ برس کا لڑکا لایا گیا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنی مالکن کے پرس سے ایک ہزار کی رقم نکال لی تھی۔ چوری کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ الزام غلط ہے۔ اس نے بیگم صاحبہ کو ان کے بیڈ روم میں ڈرائیور کے ساتھ ہم بستر دیکھا تھا۔ وہ دونوں بلیو فلم دیکھ کر اس کا کردار بنے ہوئے

تھے۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ غلطی سے ان کے بیڈ روم میں گھس گیا تھا۔ اس تھانے کا عملہ بارہ افراد پر تھا۔ پہلے ایس ایچ او صاحب نے اس معصوم لڑکے کو غیر فطری فعل کا نشانہ بنایا۔ پھر باقی محلے نے..... وہ غریب درد، تکلیف اور کرب ناک اذیت کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ پھر بھی اس پر رحم نہیں کھایا گیا۔ شام کو اس کی ماں آئی تو پھر سبھی اس لڑکے کے سامنے بے لباس کرکے اسے غیر فطری فعل کا نشانہ بنایا۔ وہ تیس برس کی گوری، بھرے بھرے جسم کی تھی۔ ہر لحاظ سے پرکشش تھی۔ خوب صورت تھی۔ اسے چھ ماہ کا حمل بھی تھا۔ وہ بھی بے ہوش ہوگئی۔ اس کا شوہر آیا تو اس سے کہا کہ اپنی زبان بند رکھے ورنہ تمہاری ماں کی بھی ایسی تیسی کردی جائے گی۔

صرف آلہ قتل کا مسئلہ تھا جس سے جمال نے رانی کو قتل کیا تھا۔ وہ کہیں سے بھی برآمد کیا جاسکتا تھا۔ پولیس نے اسے دو دن مہمان بنا کر رکھا۔ پھر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرکے مزید چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ لے لیا۔ اس لڑکے کو پانچ ہزار کی رقم لے کر رہا کردیا گیا۔ اس نے حوالات کے ایک قیدی سے دوسرے دن سنا کہ اس تھانے کے انسپکٹر کے گھر پر ڈکیتی کی واردات ہوئی تو اس کی جوان بیوی، ماں، ایک بارہ برس کے لڑکے اور دو جوان بہنوں کے ساتھ سات افراد نے بڑے شرمناک فعل ایک کمرے میں سب کے سامنے کیا۔ اس کی ماں اور بیٹیوں کی تصویریں بھی بنا کرلی گئیں۔ اس کے علاوہ تین لاکھ کی رقم اور چالیس تولے سونے کے زیورات بھی..... یہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔ نوماہ پیشتر انسپکٹر نے ایک ملازم کو جو بے گناہ تھا اس کے ساتھ بھی ایسا کیا تھا۔

جمال کو پورا یقین تھا کہ اس مشکل وقت میں غزالہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔ جب بھی وہ اپنے فلیٹ میں چشم تصور میں غزالہ کو دیکھتا اس کے قرب کی تمنا اور خواہش کرتا تو غزالہ آجاتی تھی اور کتنی ہی دیر تک وہ دونوں جذبات کی رو میں بستر کی زینت بنے رہتے اور وہ غزالہ سے کہتا تھا کہ دل کو دل سے کیسے تعلق اور راہ ہوتی ہے۔ لیکن آج اب غزالہ چشم تصور میں آئی اور نہ ہی تھانے میں اپنے باپ کی سفارش لے کر، وہ سرد آہ بھر کے رہ جاتا۔ اسے دکھ اس بات کا تھا کہ غزالہ نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جب کہ اسے امید تھی کہ وہ اس جہنم سے نجات دلا دے گی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اس کی ماں حیات ہوتی اور سگی بہن بھابھی یا خالہ بھی ہوتی اسے تھانے بلا کر برہنہ کرکے یہ کالی بھیڑیں درندوں کی طرح ٹوٹ پڑتے اور اجتماعی درندگی کرتے..... وکیل کی ضرورت کا مرحلہ ہنوز دور تھا۔ تفتیش کا جان لیوا عمل ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ وہ بہت چیخا چلایا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اگر پولیس اعتبار کرنے لگے تو عدالتوں کا سارا کام ہی ختم ہوجائے۔ جج اور مجسٹریٹ مکھیاں سارا دن ماریں اور اونگھتے رہیں۔ خوشی خوشی گھر جائیں اور بیوی سے گرم جوشی سے پیش آئیں۔

پولیس کا ریکارڈ مرغ کی ایک ٹانگ پر اڑ گیا۔ کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کی طرح ایک ہی رٹ ان کی ہوگئی تھی۔

"قتل کیسے کیا؟ کب کیا؟ ہر رات وہ بڑی باقاعدگی سے اسے ننگا کرکے الٹا لٹکاتے تھے اور تشدد کی سائنس کا نیا عملی تجربہ کرتے ہوئے یہی پوچھتے تھے۔ ڈرائنگ روم میں اس کے علاوہ بھی مہمان ہوتے تھے۔ کچھ اس سے پہلے اور کچھ بعد میں تفتیش کے عمل سے گزرے تو ان کا تڑپنا اور پھڑکنا دیکھ کے..... جیسے پولیس والے بولڈ سانگ آئیٹم کہتے تھے۔ جمال پر کپکپی طاری رہی تھی۔ اس کا سارا بدن سوج گیا تھا۔ ہر جگہ نیل تھے۔ شاید جانوروں کو بھی ایسا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا۔

وہ سیدھا نہیں چل سکتا تھا۔ اجابت کے لیے بیٹھتا تو چلاتا تھا اور کروٹ بھی لیتا تو ہائے ہائے کرتا تھا۔ وہ جو ایک بینک میں اے وی پی تھا۔ فاسٹ بولر بھی تھا اور چھکے مار بیٹسمین تھا۔ اس کے چھکوں نے دھوم مچادی تھی اور اسے شاہد آفریدی کا نعم البدل اور کرکٹ کا سپر اسٹار آل راؤنڈر جو ساری دنیا میں مقبول ہو رہا تھا اور شہرت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے فین میں لڑکیوں

عورتوں کی بڑی اکثریت تھی اور اسے سرفراز کرتی رہتی تھیں اور غزالہ کا چاہنے والا.... حوالات میں عام چوروں، جیب تراشوں اور لاوارثوں اور ناکردہ گناہوں کی سزا پانے والے بدبختوں کے درمیان ہی مر گیا تھا۔ جو بچا تھا وہ انہی کے جیسا ملزم تھا جسے نہ کوئی جانتا تھا نہ پہچانتا تھا۔ مستند قسم کے مجرم اس کے سامنے لائے گئے اور ان کے ورثا نے انہیں تفتیش سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ بیویوں اور ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے اپنے زیور بیچ کر اور ساری پونجی دے کے انہیں تشدد سے محفوظ رکھنے کے علاوہ گھر سے کھانا فراہم کرنے اور ملاقات کی سہولت حاصل کر لی۔ غزالہ جس نے منہ بولی بیوی بن کر اور پہلے دن سے اسے ہر طرح سے خوش کرتی چلی آئی اس سے اس قدر غافل اور بے فکر ہو گئی تھی۔ کہیں اس لیے تو نہیں اس نے متعدد بار ایسا فعل اور حرکتیں کرتا رہا تھا جو ایک عورت کے لیے ناپسندیدہ، ناگوار اور اذیت ناک ہوتا تھا۔

اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں دنیا کی عزت اور سلامتی ملزم کی ہم سے ہے۔

بہت سے ملزم تھانے دار نے ذاتی اختیار کی قیمت وصول کر کے چھوڑ دیے اور انہوں نے ملزم کے سامنے ہی انہیں کھلونا بنایا اور اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا یہ ملزم کی ماں، بہن، بیٹی اور بہو ہے۔ چنگیز خان اور ہلاکو اور فرعون کی روحیں خوش ہو جاتی تھیں کہ دنیا میں آج بھی ان کے جانشین موجود ہیں۔ ایک قیدی نے کہا کہ یہ شاید اپنی ماں، بہن اور بیٹی سے بھی ہم بستر ہوتے ہوں گے یا پھر کوئی اور ہوتا ہو گا۔ کیوں کہ اوپر والے کے نزدیک دیر ہے۔ اندھیر نہیں.... ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ حرام کی اولاد ہوتے ہیں۔ بہت سے تو کسی جج کی سفارش پر بچ گئے۔ اوپر کی سفارش بھی کام آجاتی تھی لیکن معمولی سفارش تو الٹی گلے پڑ جاتی تھی جو مجرم کسی قیمت پر چھوڑے نہیں جا سکتے تھے وہ پکا پرچا کاٹ کے عدالت بھیج دیے گئے اور وہاں سے جیل چلے گئے۔ ان کالی بھیڑوں میں جو شریف النفس اور نیک صفت تھے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ ان کی بدولت فرض اور انصاف اور اس محکمے اور قانون قائم تھا۔ یہ اپنی جیب سے بے گناہ مجرموں کی ہر طرح سے خدمت کرتے تھے اور ان کی عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیتے تھے۔

جمال کے علاوہ صرف ایک تھا وہ کچھ قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا اور اتنا ہی لاوارث بھی تھا۔ اس کی اللہ نے سنی اور بالآخر اسی کا نجات دہندہ فرشتہ اجل بنا اور اس کا جسم انسانی فلاح کے لیے میڈیکل سائنس کے طلبا کے سپرد کیا گیا۔ جب اس کے قتل پر پریس نے شور مچایا تو یہی کہا گیا کہ ملزم نے خودکشی کی۔ اس کے کسی ملاقاتی نے اسے منشیات لا کر دی تھی۔

"ہاں بھئی.... تو بھی تیار ہو جا.... ڈھیٹ ہڈی! دیکھ تو نے اگر اپنی کوئی بہن، نیبن یا بھابھی کو سفارش بن کر آنے کو کہا ہوتا تو ہم اسے تیرے ہی سامنے بے حجاب کر کے دیکھتے.... آج لڑکیاں عورتیں روز بہ روز بے حجاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کے لباس میں بھی باریک سے باریک خدوخال نظر آتے ہیں اور انہیں بڑا شوق ہے کہ وہ سویڈن، اٹلی اور امریکہ اور یورپ کی لڑکیوں عورتوں کی طرح زیر جامے میں باہر نکلیں۔ لیکن کیا کریں اس کی اجازت شاید ہی ملے لیکن چوں کہ ماحول بن رہا ہے لہٰذا اس کی اجازت مل جائے گی۔" تھانے دار نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اب تیری رخصتی ہے۔ اسپیشل فارمولا آزمائیں گے آج.... تو قبر میں جا کر بھی ہمیں یاد کرے گا...."

جمال خارش زدہ کتے کی طرح کانپنے لگا۔ اس بدنصیب کی موت جس تشدد اور ایذا سے دردناک ہوئی تھی وہ اس کے سامنے ہوئی تھی اسے آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ سن اب بھی موقع ہے۔ تیری کوئی کزن، منہ بولی بہن یا ماں یا بھابھی ہو تو کسی بہانے بلا لے تو پھر تیرے ساتھ دوستانہ سلوک اس شرط پر ہو گا کہ ہماری ہر بات مان لے اور محکمے کے عملے کو ہر طرح سے خوش کر دے اور ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ فطری حالت میں کیسے دکھائی دیتی ہے۔ کیا تجھے

اب بھی عقل نہیں آئی کہ یہاں کتنے لڑکی عورتیں ہمارے ایرانی ذوق کے معیار پر پورا اتریں۔"

اس نے سوچا بھی کہ کیا کتے کی موت مرنے سے بہتر نہیں کہ عزت کی موت مرے۔ اپنا سر آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر لہولہان کر لے۔ وہ دوسرے دن اس فیصلے پر عمل کرنا چاہتا تھا کہ اس روز اچانک تھانے میں افراتفری پھیل گئی۔ بڑی عجلت میں اسے حوالات سے نکال کے ایک گرم حمام میں پہنچایا گیا جہاں ایک مکروہ صورت لیڈی کانسٹیبل نے بڑی فحاشی کے ساتھ اس کے جسم کی مالش کی اور اسے دعوت دی کہ وہ جس راستے پر چلنا چاہے چل سکتا ہے۔ وہ اف نہیں کرے گی۔ لیکن اس کی دعوت کو رد کر کے اپنے جذبات کو قابو میں کر لیا۔ اس لیے کہ شاید اس میں کوئی چال نہ ہو۔ ورنہ اس کا عقبی سراپا ایسا پرکشش اور جاذبیت سے بھرا ہوا تھا کہ وہ پس و پیش نہ کرتا اس کی شیو بنائی گئی اور بال ترشوائے گئے۔ جسم پر نہ جانے کیا کچھ مل کے خوشبودار پوڈر تھوپا گیا اور اسے بار بار گلوکوز ملا ہوا دودھ پلایا گیا۔ ہر چار گھنٹے کے بعد اسے دو گولیاں دی گئیں جس سے درد کا احساس بھی ایسے ختم ہو گیا جیسے اس نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا ہو۔ شام کو ایک ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور اس کے کولہے پر دو انجکشن لگائے۔ رات کو اسے سونے کے لیے چارپائی دی گئی جس پر بستر اور کمبل تھا۔ ایک سولہ برس کی مہترانی کو کسی الزام میں حوالات بند کیا ہوا تھا اسے بے لباس کر کے اس کے ساتھ سلا دیا۔ وہ مہترانی ایسی تھی کہ اس کے انگ انگ میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ مہترانی سے کہا گیا تھا کہ وہ جس طرح اس کے ساتھ رات گزارے.... وہ اف نہ کرے۔

سونے سے پہلے اس نے چکن بریانی اور شامی کباب کھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا صبح مجھے پھانسی دے دی جائے گی؟" ڈیوٹی پر مامور کانسٹیبل بڑے زور کا قہقہہ مار کے ہنسا اور اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"اوئے پاگل دا پتر! تو جیل میں نہیں تھانے میں ہے۔ ایس پی صاحب کے سامنے پیش ہے تیری کیا تجھے خبر نہیں ہے؟"

"کون ایس پی....؟" جمال کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا "کیا نیا آیا ہے؟"

"اپنے ایس پی عبدالخالق صاحب اور کون؟ کیا تو انہیں نہیں جانتا؟"

وہ انجان رہا۔ ساری رات اس نوجوان مہترانی نے اسے ہر طرح خوش کیا۔ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ اس نے نشاط انگیز لمحات میں بتایا کہ تھانے دار اسے اور اس کی ماں سے بھی کھیلتا رہتا ہے۔ اس کا جرم یہ ہے کہ اس کی ماں بھی اس کی طرح خوب صورت اور بھرپور بدن کی ہے۔"

ایس پی عبدالخالق بڑے کروفر کے ساتھ آیا۔ جب جمال کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو خود جمال نے اس کے سامنے آشنائی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس کی نظر میں غیرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس اظہار سے کیا حاصل ہو گا؟

"کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی اس کے ساتھ....؟" ایس پی عبدالخالق نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"بالکل نہیں.... سر!" ایس ایچ او نے جواب دیا۔ "آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سرکاری مہمان خانے میں کتنا ہٹا کٹا نظر آ رہا ہے۔ کیوں بھئی ٹھیک ہے نا؟" جمال نے میکانکی انداز میں سر ہلا کے تائید کی۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا۔

"اور سر....! ان کا ایک غیر ملکی شاہی مہمان کی طرح ہر طرح سے خیال رکھا۔ کل ان کے حکم پر وہ جو چندا عورت ہے نا.... اس کا حسن جو مثل چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے جسے دیکھ کر مرد اس پر مرمٹتے ہیں اور راستہ بھول جاتے ہیں اور دل تھام لیتے ہیں اور نیندیں حرام ہو جاتی ہیں ایک ہفتہ تک غسل خانے میں ان کے جسم پر مالش مالش کرتی رہی، نہاتی بھی رہی ان کے ساتھ اور سرفراز بھی کرتی رہی.... پھر ایک سولہ برس کی دوشیزہ بھی ایک ہفتہ تک ہم بستر ہوتی اور ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتی رہی۔

سر! روزانہ صبح کے ناشتے میں حلوہ پوری‘ پراٹھے‘ مکھن‘ شہد اور چھ انڈوں کی آملیٹ۔۔۔ دوپہر میں چکن بریانی‘ مٹن بریانی اور مٹن قورمہ اور کڑاہی۔۔۔ رات کو چائنیز کھانے‘ چکن بروسٹ اور چکن تکے۔۔۔ اس کے علاوہ کولڈ ڈرنکس کے کریٹ پر کریٹ‘ وہ پانی کی جگہ پیتے تھے اور آئس کریم‘ فالودہ آئس کریم‘ کسٹرڈ اور پڈنگ بھی۔۔۔ یومیہ بل تین سے پانچ ہزار کا بنتا تھا جو یومیہ وصولی ہوتی ہے نا اس میں سے ادا کی جاتی تھی۔“

جمال نے پھر سر ہلا دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تھانے دار مبالغہ آمیزی کیوں کر رہا ہے۔ چندا نامی کی صورت دیکھ کر اسے تے آئی تھی۔ وہ شاید یہ بھی کہہ دیتا یا کہنے والا تھا کہ ان کی خاطر مدارت کے لیے اپنی بیوی اور بیٹی کو راتوں کو ہم بستر بناتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ آج ایس پی عبدالخالق کیوں آیا ہے اور یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ چند منٹ کے بعد وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلا جائے گا تو اسے پھر انہی کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا جن کے ساتھ وہ اتنے دنوں سے رہتا آیا تھا۔ ایک ایک گھڑی جو صدی سے کم نہ تھی۔

”سر۔۔۔! اگر مزید سوال و جواب کرنے ہوں تو حکم فرمائیں۔“ تھانے دار بولا۔

”نہیں۔۔۔ اس لیے کہ یہ بے قصور ہے اسے باعزت جانے دو۔“

ایس پی عبدالخالق اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ٹوپی سر پر جمائی۔ ڈنڈا بغل میں دبایا اور ایڑیاں کی کھٹا کھٹ والے سلیوٹ کا جواب دے کر جیپ میں جا بیٹھا۔

جمال اسی طرح بت بنا رہا۔

تھانے دار نے اس کے پاس آکر اس کی گردن ناپی اور بڑے استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”تو بڑا خوش قسمت ہے۔ پرسوں دن ایس پی عبدالخالق نے فون کر کے کہا تھا کہ تیرا ہر طرح سے خیال رکھا جائے۔ تھانے کی روایت کے مطابق اس پر عمل نہ کیا جائے۔ اس لیے کل چندا عورت نے غسل خانے میں تیرے سارے جسم پر مالش کی اپنے آپ کو ڈش کی طرح پیش کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تو نے غسل خانے میں اس کے ساتھ بڑا نامناسب فعل کیا۔ رات اس مہترانی کی لونڈیا سے سہاگ رات مناتا رہا۔ ایسی پرشباب چھوکری خواب میں بھی کہاں نصیب ہو گی۔۔۔ چل دفع ہو۔۔۔ کمینے۔“ اس نے ایک غلیظ گالی اگل دی۔

اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ”تھانے دار نے لپک کر ریسیور اٹھالیا اور اک دم اٹینشن ہو کر کہنے لگا۔

”ہیں جی۔۔۔ ہاں جی ابھی آگئے ہیں ایس پی صاحب آپ کون ہیں بیگم صاحبہ! اچھا‘ اچھا آپ گھر سے بول رہی ہیں۔ ملزم ابھی ہے جناب! بس اب جانے والا ہے۔ ایس پی صاحب نے کہہ دیا کہ جانے دو۔“

تھانے دار نے ریسیور پکڑ لیا۔ تھانے دار نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اوئے جمال حرام۔۔۔ ادھر مر۔۔۔“

جمال نے ریسیور تھام لیا۔ تھانے دار نے دانت پیس کر کہا۔ ”بول نا منہ سے۔۔۔“

”ہیلو جی۔۔۔“ جمال نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا جو ہر گز اس کی نہیں تھی۔

”جمال۔۔۔! تم جمال ہو‘ جمال احمد!“ آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے یقین نہیں آیا ہو کہ یہ آواز جمال کی ہے۔

”ہاں جی۔۔۔! آپ کون ہیں؟“ جمال صرف سولہ دن میں تابعداری سیکھ گیا تھا۔ ”حکم کریں۔“

”مجھے بہت افسوس ہے جمال! پانچ لاکھ حاصل کرنے کا کیا یہی طریقہ رہ گیا تھا۔ اس سے تو اچھا ہوتا کہ تم ڈاکا ڈالتے۔ میری ایک درخواست ہے۔“

”حکم کریں بیگم صاحبہ۔۔۔!“ جمال نے پھر سابقہ لہجے اور انداز میں جواب دیا۔

”دیکھو۔۔۔ اس لہجے میں بات مت کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی کے سامنے میرا نام لو یا میرے حوالے سے کوئی بھی بات کرو۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پر کوئی برا وقت آئے۔ سب سے اچھا ہے کہ تم اس شہر سے چلے جاؤ لیکن نہ جا سکو تو بھی بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ میری شادی ہو چکی ہے اور میرا شوہر بھی ایس پی ہے۔ اس کی پوسٹنگ اندرون سندھ ہے۔ مگر ڈیڈی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی یہاں آجائے۔ ایک اینڈ پر وہ آجاتا ہے مگر۔۔۔ اس میں وہ بات نہیں جو تم میں تھی۔ میں نے تمہارے جذبات کا خیال کیا اور ہر طرح سے متعدد بار خوش کیا جو ایک عورت کے ناتے زیب نہیں دیتا۔ اس لیے کہ تم سے محبت تھی۔ محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ میں نے تمہاری ہر بات ناجائز تھی۔ وہ مانی تھی۔“ بات ختم ہو جانے کے بعد وہ ریسیور تھامے کھڑا رہا۔

گھر جاتے وقت اسے تھانے دار کی باتیں اور کل کی بات یاد آئی۔ ایک تو اسے غسل خانے میں بے لباسی کی حالت میں دھکیل دیا۔ غسل خانے میں ایک مکروہ صورت پہلے ہی فطری حالت میں موجود تھی۔ کالی چڑیل اس سے بھی کہیں خوب صورت ہوگی۔ شاور کے نیچے دونوں کھڑے ہو گئے۔ پھر اس نے کہا کہ وہ مالش کرے گی تاکہ جسم کا درد ختم ہو جائے۔ پھر اس خوف ناک چڑیل نے پہلے تو اس کے چہرے اور ہونٹوں اور سارے جسم پر بے تحاشا بوسے ثبت کیے۔ اسے آغوش میں لے لیا۔ ایسی ایسی شرم ناک حرکتیں کیں کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر رات کو مہترانی کی بیٹی نے جو خوب صورت کم پرشباب زیادہ تھی ہر طرح سے خوش کیا تھا۔

زندگی اس کے لیے ایک بد دعا ہو گئی تھی اور وہ محض ایک تماشائے عبرت بن کے جینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تھانے سے نکل کے وہ بے مقصد پھرتا رہا تھا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تھا اس کے بٹوے میں تین ہزار سات سو کی رقم تھی۔ تھانے دار نے بٹوا واپس کیا تو اس میں بارہ سو روپے تھے۔ اگر وہ یہ رقم بھی نہ دیتا تو وہ کیا کرتا۔ گھر پر کچھ رقم موجود تھی۔ غزالہ آخری ملاقات پر اسے تیس ہزار دے گئی تھی کہ وہ فلیٹ کا بقایا کرایہ ادا کر دے۔ اس کے ذہن میں خلا تھا اور مستقبل اس کے لیے اتنا ہی بے وجود تھا جتنا اس کا ماضی۔۔۔ وہ جمال جو کسی رانی کا منگیتر تھا یا کسی غزالہ کو چاہتا تھا۔ ایک بھولی بسری داستان ہو گیا تھا۔ کرکٹ کا نام اس کے لیے اتنا ہی اجنبی تھا جتنا کسی اور کھیل کا نام۔۔۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ دوست نہیں تھی اور آشنا بھی نہیں تھا۔

ایک رات اور دو دن وہ کھائے پیے بغیر پھرتا رہا۔ دوسری رات آئی تو وہ سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ کسی اسپتال یا سڑک کے بیچ نہیں پڑا تھا بلکہ کسی گھر میں تھا۔ ایک آرام دہ بستر میں اور ایک خاصے پر تکلف کمرے میں۔۔۔ وہ بہت دیر تک یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ یہاں کیسے آیا تھا مگر یادداشت میں اگر کچھ تھا تو ایک آواز۔۔۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں۔۔۔ کبھی بھولے سے ادھر کا رخ نہ کرنا۔۔۔ اسے عذاب جہنم سے بدتر وہ سولہ دن بھی یاد تھے جو اس نے اس تھانے میں گزارے تھے اور اپنا نام بھی یاد تھا اور وہ مکروہ صورت عورت جو چڑیل سے بھی بدصورت اور خوف ناک تھی اور اسے کسی بری جونتی چاٹتی رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر حصے کو ٹے اور عضو عضو کو اپنے ہونٹوں اور زبان سے پیار کرتی رہی تھی۔ اس قدر کراہیت اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اور پھر وہ نوجوان بھرے بھرے بدن کی پرشباب لڑکی نے کیف نشاط میں اسے بتایا تھا کہ تھانے دار اسے اور اس کی ماں کو ایک ساتھ بستر کی زینت بناتا رہتا ہے۔ اس کا باپ اور ماں جیسے تاوان ادا کر رہے ہیں۔۔۔ اوپر والے کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں اس کی بہن بیٹی اور بیوی سے انسپکٹرز اور سب انسپکٹر بھی دل بہلاتے ہیں۔ جب تھانے دار کی اعلیٰ حکام سے رگ دبتی تو انہیں خوش کرنے کے لیے اسے طوائف بنا دیتے ہیں۔ وہ ہر طرح سے خوش کرنے کی عادی ہو گئی ہے۔ اسے علم تھا کہ اس نے رانی کا خون کیا تھا اور ایس پی عبدالخالق نے کمال مہارت سے کیس ختم کرا دیا تھا ورنہ تھانے دار اسے عدم آباد پہنچانے والا تھا۔

ایک بوڑھے چہرے کو اپنے مقابل پا کر وہ بری طرح چکرا گیا۔ اس کے ساتھ کوئی جسم آنے والا کوئی ڈاکٹر تھا۔

ڈاکٹر نے اس کا ہر طرح سے تفصیلی معائنہ کیا۔ پھر اسے ایک انجکشن لگایا اور پھر اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"بہت بہتر ہو اب تم... اچھا یہ بتاؤ کہ اب کیا نام ہے تمہارا... شاباش... جلدی سے بتاؤ۔"

"جمال احمد... آپ ہیں کون؟" اس نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟"

"سوچو... یاد کرو... ذہن پر زور دو۔ تم مل چکے ہو مجھ سے تم میرے آفس میں آئے تھے۔" اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ وہی وکیل ہیں۔" اس پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ "آپ ہی نے کہا تھا مجھ سے... اس حرام زادے کے گھر جاؤ صلح کرنے کے لیے... آپ ہی نے مشورہ دیا تھا کہ رانی کو مار ڈالو قتل کرو..."

وکیل نے بڑی مشکل سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور کہا۔

"ہوش میں آؤ جمال! تم نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ تم بے قصور ہو۔"

ڈاکٹر نے جو صحت مند اور توانا تھا اس نے جمال کو زبردستی بستر پر لٹا دیا۔

"اٹ از اے گڈ سائن... بہت حوصلہ افزا بات ہے۔ باتیں کریں ان سے پرانی باتیں یاد آتے ہی یہ نارمل ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر نے جاتے جاتے کہا۔

وکیل نے اسے پہلے پانی پلایا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"جمال! یہ میرا گھر ہے۔ میں تمہیں اٹھا کے لایا تھا۔ تم سڑک پر میری کار کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ کیا ہوا تھا آخر تمہیں... بولو۔"

"میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ جمال نے کسی ارادے کے بغیر اچانک کہہ دیا۔

اور وہ لمحہ تھا جب خودکشی کا لفظ پہلی بار اس کی زبان سے ادا ہوا تو خودکشی کا خیال اس کے ذہن میں جم گیا کسی چٹان کی طرح۔

وہ ایک ہفتہ وکیل کے گھر میں رہا۔ وکیل بڑا نیک دل اور شفیق شخص تھا اس کے باپ کی طرح... اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی شادی کر چکا تھا۔ بیٹیوں کی طرح بیٹے بھی اپنے گھر کے ہو گئے تھے اور اب اس کے ساتھ ایک ملازمہ تھی۔ جمال وہاں رہ سکتا تھا۔

"جب تک چاہو اسے اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہو۔ کسی بات کی فکر نہ کرو۔" وکیل نے بڑے خلوص اور محبت سے کہا تھا۔

ایک ہفتے میں بہت رویا تھا۔ اس نے وکیل کے سامنے اپنا دل چیر کے رکھ دیا تھا اور اس کے دل کا خون اشکوں میں ڈھل گیا تھا۔

وکیل نے اسے بہت تسلی دی تھی۔ اس کے زخموں پر محبت کا مرہم رکھا تھا۔ اور پھر بہت حوصلہ بھی دیا تھا کہ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا مگر جمال کے یقین میں کمی نہیں آئی تھی کہ ٹھیک کچھ نہیں ہو گا۔

جھوٹ ہے یہ سب 'دل بہلاوا ہے۔ خود فریبی ہے۔

وکیل نے اس سے اپنی فیس کا جو ایڈوانس لیا تھا وہ بھی اسے واپس کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے جیسے اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگا ہو۔ مگر ایک ہفتے بعد وہ وکیل کو بتائے بغیر اس گھر سے بھی رخصت ہو گیا۔ وہ اب بالکل صحت مند اور توانا تھا جسمانی طور پر... اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وکیل کے ہاں جو عمر رسیدہ 'ملازمہ وہ اچانک بیمار ہو گئی تو اس کی جگہ اس کی بہو ساس کی صحت یابی تک کام کرنے آنے لگی تھی۔ وکیل علی الصبح ہائی کورٹ چلا جاتا تھا۔ وہاں کوئی تین چار کیس وہ لڑ رہا تھا۔ اس عورت کی بہو نذیراں بڑی طرح دار' نوجوان اور پرکشش 'پرشباب گداز بدن کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر نشہ کرتا اور لڑکوں کو گھر لاتا ہے۔ وہ اعتراض کرتی ہے تو اسے مارتا پیٹتا ہے۔ اور اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ جن لڑکوں کو لاتا ہے انہیں خوش کر کے ان سے پیسے لے تاکہ وہ ہیروئن خرید سکے۔ اس کے شوہر نے اس کی عریاں تصویریں کھینچ رکھی تھیں۔ لڑکے نذیراں کی عریاں تصویر دیکھ

کر رقم خرچ کرنے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ دو تین مرتبہ اس کے سامنے بے لباس آ گئی تھی تاکہ جذبات کی رو میں بہہ جائے۔ جمال کا دل نہ صرف دنیا بلکہ عورت سے بھی اچاٹ ہو چکا تھا اس لیے اس کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ وہ ٹال گیا تھا۔ نذیراں نے اس سے کہا تھا وہ اسے ہر طرح سے خوش کرنے تیار ہے۔ وہ ایسی شعلہ بدن تھی کہ کوئی اور وقت ہوتا تو نذیراں کو مایوس نہ کرتا۔ وہ دل کے ہر ارمان پورے کرتا۔

اس کے دل و دماغ سے ذہن سے مایوسی کے جالے دور نہیں ہوئے تھے۔ خودکشی کرنے کا خیال بھی اپنی جگہ تھا جو ترغیب دیتا رہتا تھا۔ اور وہ ایک دن گلشن چورنگی پر کھڑا خلا میں گھور رہا تھا۔ یہ اس کے آشنا راستے تھے مگر وہ ان راستوں کے لیے اجنبی ہو گیا۔ آگے دائیں جانب موچی موڑ کے بعد وہ گھر تھا جس میں غزالہ رہتی تھی۔ وہ غزالہ جس نے اسے مہینوں ہر طرح سے جی بھر کے آلودہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ شرم ناک فعل بھی کیے تھے۔ وہ جب اس کی ان نازیبا حرکتوں پر خفا ہو جاتی تھی تو وہ کہتا تھا محبت اور جنگ میں جائز اور ناجائز نہیں دیکھا جاتا... میں کیا کروں۔ تم اس حالت میں ہوتی ہو تو دل اور جذبات اور خواہش اختیار اور قابو میں نہیں رہتی۔ وہ غزالہ کی شادی کے بارے میں سوچتا کہ اس کے شوہر کو کیسا داغ دار پھل ملا ہے۔ اس دنیا میں ایسا عام تھا کہ لڑکیاں شادی سے پہلے داغ دار ہوتی رہتی ہیں اور سہاگ کی راتوں کو یہ تاثر دیتی ہیں کہ اس کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا مرد ہے۔ وہ آج اب بھی دوشیزہ ہے۔ وہ غریب یقین کر لیتا تھا۔ وہ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایک نئی سفید کار میں غزالہ اس کی نظروں کے سامنے سے گزری تھی۔ اس نے جمال کو دیکھا بھی تھا۔ دیکھتے ہی ایک لمحے اس کی ہنسی رک گئی تھی۔ اس لمحے میں شاید غزالہ نے سارا ماضی دیکھ لیا تھا اور اس کے سامنے اس کی معیت میں گزرا ایک ایک لمحہ فلم کے مناظر کی طرح گھوم گیا تھا۔ ہنسی رک گئی تھی لیکن کار رکی نہیں تھی۔ اس کا حسین چہرہ ماند پڑ گیا اور آنکھوں میں سے وحشت جھانکنے لگی تھی۔

جمال فٹ پاتھ پر سے سڑک پر اترا تو ایک کار نے زبردست بریک لگائے مگر اس کے باوجود جمال کو معمولی سی ٹکر لگی۔ لیکن وہ دوسرے لمحے کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"اندھے ہو یا مرنا چاہتے ہو؟" کسی نے غرا کے کہا" کیا تمہاری محبوبہ نے انگوٹھا دکھا دیا؟"

"ہاں... مرنا چاہتا ہوں۔" جمال نے بے دلی سے کہا۔ "تم نے مارا کیوں نہیں؟"

"نہ جانے کیوں وہ شخص نیچے اتر آیا۔ جیسے وہ اس کے دو ایک ہاتھ رسید کرنا چاہتا ہو۔" ویری گڈ! کیا تم واقعی مرنا چاہتے ہو؟"

جمال نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کوئی اعتراض ہے آپ کو؟ آپ مجھے مرنے سے روکنے والے کون ہوتے ہیں؟"

"نہیں... یہ شوق خودکشی امریکہ اور یورپ میں زیادہ ہے۔ اچھا آؤ بیٹھو۔" وہ ہنس پڑا۔

جمال نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس نے برہمی انداز سے کہا۔ "مگر کیوں؟ کیا تم پولیس افسر ہو جو مجھے اندر کرنا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ تم مرنا چاہتے ہو... میں ایسے جوانوں کو قتل کر دیتا ہوں جو عشق میں ناکام اور جو محبوبہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور نامراد رہتے ہیں... یار! آج کی محبوبہ تو محبت میں پہلے اپنی دوشیزگی سونپ دیتی ہے۔ اس لیے کہ آج کل لڑکیاں بلیو فلمیں دیکھتی ہیں اور پھر یہ اسمارٹ موبائل اور ٹچ موبائل جو ہاتھ میں تھامے پھرتی ہیں۔ دس برس کی عمر سے لے کر اسی برس کی عورت بھی... اور پھر ایک نئی وبا پھوٹ پڑی ہے سیلفی کی... شاید تمہیں علم نہیں یا شاید ہو۔ یہ نوجوان' جواں سال ہی نہیں اور کنواری لڑکیاں بھی اپنی سیلفی بے لباس ہو کر ہر طرح سے' ہر زاویے سے' ہر رخ سے' اپنے نشیب و فراز اور عقبی نشیب و فراز' ایک ایک گوشے اور انگ انگ سیلفی بنا کر لطف اندوز ہوتی ہیں۔ اتفاق سے میرے پاس دو تین لڑکیوں

اور عورتوں کی سیلفی موجود ہیں۔ ان سے بلیک میل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب تو دس میں سے ایک آدھ ہی کنواری اور بے داغ لڑکی ہوگی۔ اب تو ان لڑکیوں عورتوں کو دیکھ رہے ہو نا جو روز بروز بے حجاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کا دل بڑا کرتا ہے کہ وہ فطری حالت میں سرعام نکل آئیں۔"

اس نے اپنی تقریر بند کر کے جمال کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اسے گاڑی میں بٹھالیا۔

اب جمال نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ نفاست سے ترشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی والا گورا چٹا اور صحت مند جوان تھا۔

"کیا ہوا تمہارے ساتھ بیوی اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ شاید اس لیے کہ تم جیب خرچ نہیں دیتے ہوگے اور ہر شام کسی ہار لی کیو' پیزا ہٹ یا پھر شاپنگ کے لیے نہیں لے جاتے ہوگے یا پھر تمہیں کینسر ہے.... ؟ بے روزگاری سے تنگ آگئے ہو.... کوئی دشمن ہر وقت تمہارے تعاقب میں رہتا ہے۔ بے وفا محبوبہ نے رقیب روسیاہ سے شادی رچالی؟ بس یہی اسباب ہو سکتے ہیں.... مگر بھائی! تمہارے مرنے سے کیا ہوگا؟ بیوی واپس آجائے گی یا محبوبہ چھوڑ دے گی رقیب کو اور تمہاری قبر پر رو رو کے جان دے دے گی۔ تمہاری کتنی سالیاں ہیں.... سالی آدھی جورو ہوتی ہے۔ تم نے اس پر ہاتھ صاف کیا ہوگا تو وہ امید سے ہو گئی ہوگی.... نوکری اگر نہیں ملی تو یار چوری کرو.... ڈاکے ڈالو.... ایسی کی تیسی کرو اس دنیا کی جس نے تمہاری ایسی تیسی کردی.... اگر مرنا ہے تو سب کو مار کے مارو.... تمہارے بعد وہ سب خوشی کے شادیانے کیوں بجائیں جو تمہارے دشمن تھے.... آج کل دوست اول تو ملتے نہیں اور ملیں تو مرنے والے کو کب تک یاد رکھتے ہیں۔ سوئم تک' چہلم تک اور اس کے بعد سے بھولنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی دوست کی بیوی اپنا سب کچھ تمہیں سونپنا چاہے تو اس سے کہہ دو کہ میں سراب ہوں۔ آئی ایم ساری.... تم کچھ بولو یار! ایسے کیا منہ میں مینڈک دبائے بیٹھے ہو کہ منہ کھولا تو وہ اچھل کر باہر نکل جائے گا۔ ویسے تم رہتے کہاں ہو؟"

"میں تھانے میں تھا جہاں میری خاطر مدارات سرکاری مہمان کی طرح ہوتی رہی تھی۔"

"اور اب.... کیا گھر جا رہے ہو....؟" اس نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

"گھر؟ پتا نہیں.... گھر ہے یا بس نہیں رہا ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"اچھا.... کام کرو گے؟ رہنے کو گھر بھی ملے گا.... پیسہ بھی ملے گا وقت ضرورت شباب بھی ذوق کی مطابق جس عمر کا.... شباب کے بغیر زندگی میں راتیں بڑی سونی سونی ہوتی ہیں۔ یہ جوانی کا چارہ ہوتا ہے۔ تم اچھے خاصے معقول اور اسمارٹ آدمی لگتے ہو۔"

اس نے گاڑی کو عائشہ منزل سے دائیں جانب ایک کوٹھی کے سامنے روک لیا۔ اس گھر میں وہ اکیلا رہتا تھا۔

اندر جا کر اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام بادشاہ ہے۔ میں صرف نام کا بادشاہ نہیں ہوں۔ حقیقت میں بڑے کمال کا بادشاہ آدمی ہوں۔ بادشاہ بننا آسان نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے فن ہے۔ اس فن میں مجھے بڑی مہارت حاصل ہے۔ میرے ساتھ بھی بڑا ظلم ہوا تھا۔ میرا باپ پرانے وقتوں کا اور پرانے خیالات رکھنے والا شریف اور وضع دار آدمی تھا جو آج اب بے وقوف سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بڑا پکا سیاسی آدمی تھا اور خاکسار بھی رہا تھا۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ حق گوئی اور بے باکی اور جرات نے اسے مروادیا۔ اپنے پرائے سب اس کے مخالف ہو گئے۔ کسی کے خلاف درخواست کمشنر کو.... کمشنر کے خلاف درخواست گورنر کو.... کبھی وفاقی محتسب کے پاس' کبھی عدالت عالیہ میں.... فلاں رشوت لیتا ہے.... فلاں محلے میں یہ غلط دھندا کرتا ہے.... ایک آنٹی ہے اس نے قحبہ خانہ کھول رکھا ہے جہاں منہ کالا کرنے نہ صرف اعلیٰ پولیس افسران بلکہ دوست بھی آتے ہیں.... فائلیں بغل میں دبائے پھرتا تھا.... فلاں نے یہ دھاندلی کی ہے.... دفتر والوں نے اسے زبردستی رخصت پر بھیج دیا تھا۔ کوئی کام تھا نہیں.... مگر لوگ کب تک برداشت کرتے۔ ایک ایس ایچ او بڑا جلاد قسم کا آگیا۔ اس نے پہلے خبردار کیا کہ باجا بجادوں گا۔ بڑے میاں نے کھٹ سے درخواست آئی جی کو بھیج دی کہ نیا ایس ایچ او مجھے آنکھیں دکھاتا ہے۔ ایس ایچ او نے تو کچھ نہیں کہا۔ سی آئی والوں سے کہہ دیا اور وہ زندہ اٹھا کے لے گئے۔ مردہ چھوڑ گئے۔ ایک بہن بس سے کالج آتی جاتی تھی۔ بس کنڈکٹر نے پھنسالیا اور پہلے شادی کی پھر اسے دبئی لے گیا۔ پھر آٹھ ماہ بعد اکیلا لوٹ آیا۔ ماں نے پہلے پوچھا اور پھر اس کے خلاف شکایت کی۔ اس نے الٹا ماں کو مجرم بنادیا کہ تم نے میری بیوی کو زبردستی گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ حالاں کہ وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ میں اسے لینے آیا ہوں۔ کیس ہم پر بنا کیوں کہ پیسہ اس کے پاس تھا۔ اس کی بیوی کو برآمد کرنے کے لیے پولیس پارٹی نے ہمارے گھر پر چھاپہ مارا اور میری دوسری بہن کو پکڑ کر لے گئے کہ یہی ہے وہ جسے بڑھیا نے حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ تین دن بعد مدعی یعنی بس کنڈکٹر آیا تو اس نے کہا کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دیا گیا۔ مگر تین دن میں کیا ہو گیا؟ یہ کہانی کسی کو سنانے والی نہیں ہے۔ گھر واپس آکر میری دوسری بہن نے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑکا اور خود کو آگ لگالی۔ اس کے مرنے کے بعد میری ماں پاگل ہو گئی اور پاگل خانے ہی میں مرگئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میری پرورش شاہ جی نے کی۔ وہ ابا کے ساتھی اور دوست تھے مگر ان میں ایک خاص بات تھی۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل سکتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شرافت پر ناز کرنے کا زمانہ گیا اور اب نام ہے بدمعاشی کا میں تو انہوں نے کہا کہ بسم اللہ.... ہم یہ بھی کرسکتے ہیں۔ انہوں نے جینا اور دنیا کے نشیب و فراز اور اسرار و رموز سکھائے.... تم دیکھ رہے ہو یہ ٹھاٹ باٹ.... یہ سب شاہ جی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ شاہ جی میرے استاد تھے اور باپ کی جگہ تھے۔ دنیا ان کی بڑی عزت کرتی تھی مگر وہ اندر سے کیا تھے یہ میں جانتا ہوں۔ دنیا تو میری عزت بھی بہت کرتی ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"تم نے جینا کیسے سیکھا تھا؟ یہ بھی تو ایک گر ہوتا ہے؟" جمال نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب دینا تو بہت مشکل بلکہ ناممکن سا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے جتنے دشمن تھے ان سب کا خانہ خراب ہوا۔ وہ ایس ایچ او ڈی ایس پی بن چکا تھا تو اس کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی۔ وہ بچ تو گیا مگر ایک گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی گھسی کہ آج تک وہ مفلوج پڑا ہوا ہے۔ تھانے میں تین افراد تھے جن کی وجہ سے میری چھوٹی بہن نے خودکشی کی تھی۔ اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ ان کی لاشیں ایک برس کے وقفے میں مختلف مقامات پر ملیں۔ اخباروں میں بھی آیا تھا۔ انہیں قاتل نے مار کر آگ لگادی تھی اور لاشیں جل کر کوئلہ ہو گئی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کے شناختی جو ان کی جیب میں تھے محفوظ رہے۔ اس سے پہچان ممکن ہوئی۔"

"اور وہ بس کنڈکٹر....؟" جمال نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا وہ خبیث زندہ ہے؟"

"اس کی ایک بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ٹھیک ٹھاک شوہر تھا اس کا.... لیکن وہ پھنس گئی ایک امیر زادے کے ساتھ جو ہیرو ٹائپ تھا اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے شادی کا جھانسا دیا تو وہ عورت جو بے وقوف تھی اس نے شوہر کو چھوڑ دیا۔ عاشق اسے جدہ لے گیا۔ جب آٹھ مہینے بعد واپس آیا تو اکیلا آیا۔ اس نے کچھ نامناسب تصویریں اس کے بھائی کو بھیج دیں اور یہ بھی بتادیا کہ بہن کہاں ہے۔ بھائی سیدھا جدہ گیا تو اس نے بہن کو ایک امیر زادے کی آغوش میں دیکھا تو بہن کو قتل کر دیا۔ وہیں اس کی گردن ماردی گئی۔"

"وہ امیر زادے کیا تم تھے....؟" جمال نے اشتیاق سے پوچھا۔

بادشاہ ہنسنے لگا۔ "میرا باپ تو بہت غریب آدمی تھا اور یہ سب تمہیں میں نے پہلے اس لیے بتادیا ہے کہ تم خود کو اجنبی محسوس نہ کرو۔ ہم تو ایک ہی راستے کے

مسافر ہیں۔ میں آگے ہوں اور تم میرے پیچھے پیچھے آ سکتے ہو لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کو خود کشی پر مجبور کرنے والا کون تھا؟"

"میں خود..." جمال نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک بار نہیں میں کئی بار خود کشی کر چکا تھا۔ میں بے وقوف آدمی تھا۔ بے وقوف ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے۔ وہ جان دے سکتا ہے۔ جان لے نہیں سکتا۔"

"غلط... یہ تم جیسے جذباتی احمق ہی ہوتے ہیں۔ جن کا استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کوئی مذہب کے نام پر ان کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔ حیات جاودانی اور شہادت کی ترغیب دے کر آگے کر دیتا ہے کہ جاؤ فلاں کافر ہے۔ اس کے ناپاک وجود کو ختم کر دو۔ کبھی تم جیسے وطن کے دشمن کے خلاف سر سے کفن باندھ کے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ تو کبھی قومیت کے نام پر... اگر ہم عقل سے کام لے سکتے تو کسی کے آلہ کار نہ بنتے یہ سوچتے کہ سب ہی مسلمان ہیں اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ کوئی مسلمان غدار کیسے ہو سکتا ہے اور کافر کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ایک خدا اور ایک رسول کا کلمہ پڑھتا ہو۔ خود کو پاکستانی سمجھتا ہو۔ پاکستان ورلڈ کپ بھی جیتے تو کراچی سے خیبر تک سب مارے خوشی کے پاگل ہو جاتے ہیں اور جتنی مٹھائی کراچی اور لاہور جیسے شہروں میں تقسیم ہوتی ہے اتنی ہی فائرنگ خوشی کے اظہار کے لیے علاقہ غیر میں ہوتی ہے۔ رمضان اور عید، حج اور محرم سب کے لیے ایک ساتھ آتے ہیں۔ سب کے نماز کے اوقات بھی ایک ہیں۔ قرآن سب کا ایک ہے اور آخرت پر ایمان ایک ہے تو کافر کون ہے؟ مگر احمق اور جذباتی نوجوان نفرتوں کے جہنم کی آگ میں کودتے جا رہے ہیں اور انہیں اس جہنم میں دھکیلنے والے نام بھی کما رہے ہیں اور مال بھی... انہیں یہی دنیا جنت لگتی ہے۔ جس میں ان کے لیے سب کچھ ہے۔ کار، کوٹھی، کیش، کرسی اور کمائی۔" وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔

"پانچ کاف...!" جمال نے مسکرا کے کہا۔ "آپ نے ان کا اجتماع خوب کیا؟"

"ہاں... سکھوں کے بھی پانچ کاف مشہور ہیں۔ کنگھی، کرچھا، کرپان، کڑا اور کیس... اب ہم نے اپنے پانچ کاف بنا لیے ہیں۔ چلو... کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے اور پیٹ میں چوہوں کی رنڈ ریس شروع ہو گئی ہے۔ اب باری ہے تمہاری... میں نے تو سچ سچ بتا دیا اس لیے کہ میں بادشاہ ہوں۔ رعایا میں کسی سے ڈرتا نہیں... اس لیے اپنے بارے میں سچ بتایا ہے۔ بادشاہ کی ان باتوں نے جمال کو بری طرح جھنجوڑ دیا تھا۔ یہ سب کسی برقی جھٹکے کی طرح تھا جو ذہنی عدم توازن کے مریض کے دماغ کو بھی درست کر دیتا ہے۔ شاید بادشاہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو عین ان کی خواہش کی تکمیل ہوگی۔ جو میرے وجود سے کینسر کے پھوڑے کی طرح نفرت کرتے ہیں۔ مجھے واقعی ان سب کی ایسی کی تیسی کر دینی چاہیے۔ جنہوں نے مجھ سے میرا حق چھینا۔ میرا گھر چھینا اور میری محبت چھینی... ان کے ساتھ جو حرکت اور فعل بھی کیا جائے وہ بجا ہے۔

بادشاہ نے اس کی کہانی بڑے غور اور دھیان سے سن کر اتفاق کیا۔

"لعنت بھیجو غزالہ پر... یہ محبت خاک تھی کہ اس نے ایک بار میں تم سے مل کر پوچھا تک نہیں کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ... اس نے اپنے طور پر ہی اسے سچ مان لیا۔ آخر کیوں؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس نے تمہیں اچھی طرح پہچانا نہیں تھا اس نے... ورنہ ساری دنیا سے کہتی اور وہ نہ مانتی صاف کہتی کہ میرا جمال ہرگز ایسا نہیں ہے۔ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ فرض کرو تم سے کوئی آکر کہتا تمہاری غزالہ نے تو ایک صنعت کار کے بیٹے سے شادی رچالی جس نے اسے مرسڈیز گفٹ کی تھی۔ کیا تم مان لیتے؟ کیا غزالہ ایسی تھی کہ کوئی ایک مرسڈیز کار کے تحفے میں دے کر اس کا دل اور جسم جیت لے اور جسم کے خزانے لوٹتا رہے اور وہ خود سپردگی اور والہانہ پن سے اس پر فیاضی سے مہربان ہوتی رہے؟"

"جمال کے دل کو اس کی بات لگی۔ بادشاہ نے سچے کی بات کہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

"غزالہ کے بارے میں ایسی فضول بات کہنے والے کو میں تھپڑ دے مارتا کیوں کہ یقین کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔"

"لیکن اس نے یقین کر لیا تھا۔ اس کے خیال میں تم یقیناً ایسے تھے کہ پانچ لاکھ گن پوائنٹ پر لو اور جائداد کے لیے ایک بے گناہ لڑکی کو قتل کر دو۔ یہ کتنی احمقانہ بات ہے۔ تم کیا اتنے احمق ہو؟ جو عقل سے پیدل ہو گا وہ بھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ کیوں کہ گن پوائنٹ پر لیا ہوا چیک تو کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ یا تو تم اس وقت اپنے چچا کو ٹوائلٹ میں بند کر کے جاتے سیدھے بینک اور کیش وصول کر لیتے۔ چیک تم نے شام کو لیا تھا اور اس وقت کیش نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی لڑکی کا یقین کر لینا جو ہر ملاقات میں ہر طرح سے تمہیں اپنا وجود سونپتی رہی ہو۔"

"شاید اسے یہ سب معلوم نہ ہو... کہ چیک میں نے کب لیا اور کس وقت۔" اس نے غزالہ کا کمزور سا دفاع کیا۔

"وہ باہر سے یا گھر سے فون پر بات کر لیتی جیسے کہ اس نے بعد میں کی تھی۔" اور تمہاری وضاحت نے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

جمال کے ذہن میں غزالہ کا وہ چہرہ یاد آیا جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ خوب صورت، تر و تازہ، ہنستا مسکراتا ہوا۔ کتنی خوب صورت نئی کار تھی۔ وہ شاید اس کے اے ایس پی شوہر کی ہوگی جو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کتنی مطمئن اور خوش تھی جیسے وہ اس کے ساتھ باہم پیوست ہو جانے کے بعد ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر جائز ناجائز بات پر چہرہ کیسا سرخ ہو جاتا تھا جیسے سہاگ کی پہلی رات کی دلہن ہو اور اپنا سب کچھ کھو کر اور نثار ہو کر سونپ کر بہت کچھ پا لیا ہو۔ اپنی دوشیزگی کے صلے میں اسے عورت بننا نصیب ہوا ہو۔ کلی سے پھول بننے پر ناز کر رہی ہو... اور اس نے جمال کو کیسے دیکھا تھا جیسے وہ چوراہے پر کھڑا ہوا کوئی عام، آوارہ گرد، پاگل یا فقیر ہو... ہیرونچی یا اٹھائی گیرا... بادشاہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ غزالہ نے اسے بھلا دیا تھا۔ اسے صرف بہانے کی تلاش ہوگی۔ گزشتہ برس جب ان کی محبت کا آغاز ہوا تھا وہ اس کی منہ بولی اور سچ مچ کی بیوی کی طرح پیش آتی رہی۔ وحشیانہ پن اور جذبات کے طوفان میں غزالہ کو محبت اور جنگ کے میدان کی طرح ناجائز حرکت اور فعل پر اتر آتا تھا تو وہ احتجاج ضرور کرتی اور وہ اس سے کہتا کہ اس میں میرا نہیں تمہارے سراپا اور تناسب کا قصور ہے۔ پھر اب آج وہ سب یاد آیا تھا۔ بادشاہ نے کہا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ جو فعل کیے اس پر نادم، پچھتاوا اور شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ عورت اس کی مستحق بھی تھی۔ اس کی ناکامیوں اور بدنامیوں کے بعد اس کی محبت اور اس کے عہد وفا کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی گئی تھیں۔ اس پر قائم ہونے والے مقدمات کے آخری جھٹکے نے اس دیوار کو گرا دیا تھا شاید اس نے تسلیم کر لیا کہ اب اس بدنام زمانہ، ناکارہ اور لاوارث شخص کے ساتھ اس کے لیے تمام عمر کا پیمان رفاقت ممکن نہیں رہا۔ اور تم نے اتنی فین لڑکیوں عورتوں سے جو فائدہ اٹھایا اور انہیں ہر طرح سے آلودہ کیا میں تمہیں اس پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ لڑکیاں عورتیں اسی قابل ہوتی ہیں کہ انہیں دوشیزہ سے عورت بنا دو، کلی سے پھول اور وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی کنواری نہیں رہ پاتی ہیں۔ آج یہ لڑکیاں عورتیں کیسی بے حجاب اور بے نیام تلوار کی طرح بر سر عام نظر آتی ہیں۔

واپسی میں بادشاہ نے اس سے دریافت کیا۔ "اس وقت تم کہاں رہتے تھے جب تمہیں پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت فلیٹوں کی قطار کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ جمال نے ایک فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں اس گلابی رنگ کی عمارت میں دوسری منزل پر ایک فلیٹ میں..."

"فلیٹ میں جو تمہارا سامان تھا وہ کہاں گیا؟ کیا پولیس اسے اپنے باپ کا مال سمجھ کر لے گئی۔ جیسا کہ

اس کی عادت ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم... کیوں کہ میں لوٹ کر گیا ہی نہیں... نہ اس کی نوبت آئی۔"

"سامان کیا تھا... کچھ تو ہو گا؟ آدمی اس کے بغیر رہنے سے رہا۔"

"ہاں... جب جینک نے فلیٹ خالی کرالیا تھا اور کار واپس لے لی تھی۔ فرنیچر، ٹی وی اور فریج میرے تھے۔ میں ساتھ لے گیا تھا۔"

"اچھا چلو معلوم کرتے ہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ مالک مکان کہاں رہتا تھا؟ کیا کرایہ نامہ تھا؟"

"ہاں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ "وہ ساتھ والے فلیٹ میں رہتا ہے۔"

جمال کے پاس کوئی چابی نہیں تھی۔ بادشاہ نے جمال کو پیچھے رہنے کا مشورہ دیا اور مالک مکان کے فلیٹ کا دروازہ زور سے بجادیا۔

"اس فلیٹ کی چابی ہے تمہارے پاس؟" بادشاہ نے مالک مکان کو گھورتے ہوئے بڑے دبنگ لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں ہے...؟" اس نے بادشاہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "مگر ہو کون پوچھنے والے؟"

"اس فلیٹ میں جو کرایہ دار تھا جمال احمد...؟" اس نے مالک مکان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو پکڑا گیا قتل کے الزام میں... پولیس سے پتا کرو۔ میرا وقت کیوں خراب کرنے آئے ہو؟" مالک مکان اندر واپس جانے لگا۔ بادشاہ نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ "آخر اتنی جلدی کیا ہے... قتل کے الزام میں تم بھی پکڑے جاسکتے ہو۔ صرف الزام عائد کرنے سے کوئی قاتل نہیں بن جاتا۔"

"فلیٹ میں نے کسی اور کو کرائے پر اٹھا دیا۔" مالک مکان نے سرسری لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" بادشاہ نے کہا۔ "یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے؟ جمال کب گرفتار ہوا تھا؟"

"اسے... ایک مہینہ ہو گیا۔" مالک مکان نے جواب دیا۔ "وہ شاید جیل کی ہوا کھا رہا ہو گا؟"

"کرائے نامے کی رو سے تم ایک مہینے کا نوٹس دینے کے پابند تھے۔"

"نوٹس میں کہاں دیتا...؟ کیا اسے میں تھانے یا جیل بھیجتا؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"تم مانتے ہو کہ تم نے نوٹس نہیں دیا تھا۔ آج اگر جمال واپس آگیا تو معلوم ہے کیا ہو گا؟ تم اندر ہو جاؤ گے چچا! تم نے غیر قانونی طور پر اس کے فلیٹ میں داخل ہوئے اور سارا سامان اٹھا لیا۔ یہ ڈکیتی کہلائے گی۔ تمہارے ساتھ وہ بھی دھر لیے جائیں گے۔ جو اس وقت جمال کے فلیٹ میں موجود ہیں۔"

مالک مکان کا چہرہ فق ہو گیا اور آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ کون ہو اور کس لیے دھمکیاں دے رہے ہو؟"

"میں وکیل ہوں جمال کا... جمال کے ساتھ ابھی پولیس کو بلا کر لے آؤں گا۔ ہم دروازہ توڑ کے اندر گھس جائیں گے۔ معلوم اگر جمال آگیا تو 'تو کیا ہو گا؟ بہت برا اس لیے ہو گا کہ جمال ابھی تک اس فلیٹ کا کرایہ دار ہے اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ کوئی اندر گھس کر کنڈی لگالے تو دروازہ توڑ دے اور پھر جو اندر ہو اسے اندر کرادے... اندر ہونے کا مطلب جانتے ہو اور پولیس کو بھی...؟"

"میری بات سنیں..." وہ گڑگڑایا۔ "چابی ہے میرے پاس... لیکن..."

بادشاہ نے اوپر سے آواز دی جمال کو... جو زینے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ "جمال آجاؤ... اوپر آجاؤ۔"

مالک مکان کا خیال تھا کہ وکیل جھوٹ بول رہا ہے لیکن جب اس نے جیسے ہی جمال کو دیکھا اس پر جیسے دل کا دورہ پڑ گیا۔ بادشاہ نہ صرف بہت ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ کمال کا تھا۔ اس نے مالک مکان کو اعتراف جرم پر مجبور کر دیا تھا۔

"دیکھو بھائی...! میں مانتا ہوں۔ غلطی ہوئی مجھ سے..." مالک مکان کے پسینے آگئے۔

"غلطی تو سبھی کرتے ہیں... لیکن یہ سنگین جرم ہے اور ناقابل ضمانت۔"

"اچھا تو جرم کیا میں نے؟ معافی کی صورت ہے کوئی؟" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"ہاں... ہرجانہ دے دو..." بادشاہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "ایڈوانس واپس کردو۔ جتنا سامان اٹھایا ہے اس کی قیمت ادا کردو۔" پھر وہ جمال کی طرف گھوما "جمال! فہرست ہے سامان کی...؟"

"ابھی... اس وقت تو نہیں ہے میں ابھی دو ایک منٹ میں بنادوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم فہرست کل لے کر آئیں گے... جو ذہنی تکلیف اور اذیت ہوئی ہے میرے موکل کو... یہ خود اس کا اندازہ کرسکتے ہو؟ مالک مکان ہاتھ جوڑنے لگا۔ "سر! دیکھیں... میں غریب آدمی ہوں۔ رحم کریں۔ بال بچے دار ہوں۔"

"دو فلیٹ ہیں تمہارے۔ ایک فلیٹ کی مالیت دس بارہ لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ شہر میں اور کتنی جائیداد ہو گی؟ تم کرتے ہو کیا؟"

"میں کسٹم میں ملازمت کرتا ہوں۔" اس نے بتایا "عام قسم کا ملازم ہوں۔"

"پھر یہ جائیداد کیسے بنالی...؟ کسٹم کا چپراسی بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ خیر! ابھی ہم اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ جمال یار! ابھی بنادو۔ بزرگ لوگ کہتے ہیں کہ آج کا کام کل پر مت ڈالو... آج کا زمانہ ایسا ہے کہ باپ پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے کل کہیں یہ بھاگ گیا پھر؟ پھر ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔"

مالک مکان انہیں اندر لے گیا۔ طویل مذاکرات، بک بک اور سودے بازی کے بعد پچاس ہزار پر فیصلہ ہوا، دس ہزار ایڈوانس اور بیس ہزار ہرجانہ... نوے ہزار کا چیک فوراً" مالک مکان نے پیش کیا۔ کپڑوں کا ایک سوٹ کیس جس میں کاغذات بھی تھے۔ وہ اپنے فلیٹ میں جو کسی رئیس کی طرح آراستہ تھا کسی رئیس زادے کی طرح رہ رہا تھا۔ تمام کمروں میں اے سی تھا۔

کسٹم کا جو ملازم ٹھہرا...

"چچا...! ایک بات اچھی طرح جان لیں کہ چیک کا باؤنس ہونا سنگین جرم ہے... دوسری بات یہ ہے کہ اگر چیک کل کیش نہ ہوا تو ایک جرم اور... پھر ہم پولیس کے ساتھ آئیں گے اور فوٹو گرافر کو بھی لائیں گے تاکہ ہتھکڑی لگی تصویر میڈیا کو دے دیں۔"

"چیک کیش ہو جائے گا... نہ ہو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

باہر آکر بادشاہ نے اسے چیک تھمادیا اور خوش دلی سے بولا۔

"یہ لو بیٹا...! اسے کہتے ہیں دنیا داری... سیدھی انگلیوں سے اب گھی نہیں نکلتا۔ پرانا سامان تمہارے کس کام آتا؟ نئے کی قیمت دلوادی تمہیں۔"

"واقعی آپ کمال کے بادشاہ وقت ہیں۔" جمال نے چیک کو جیب میں رکھ لیا۔

"ابھی دیکھتے جاؤ... یہ تو پہلی قسط ہے۔" بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" جمال کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ "کیا چیک کیش ہونے کے بعد اسے بلیک میل کرو گے؟"

"کر تو سکتے ہیں۔ کیوں کہ کرایہ نامہ ہے تمہارے پاس اور اس چیک سے کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ رقم کس سلسلے میں دی گئی ہے... بے وقوف آدمی بدحواس نہ ہوتا تو تم سے نوٹس وصول کراتا یا لکھواتا کہ میں نے فلیٹ خالی کردیا ہے۔ وہ بدحواس اس لیے ہوا تھا کہ میں نے سامنے والا بیڈ روم کا دروازہ قدرے کھلا دیکھا تھا۔ ایک جواں سال اور خوب صورت اور پرشباب گداز بدن کی عورت جو گوری تھی وہ کالے رنگ کی جال دار نائٹی میں ملبوس تھی۔ وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی نائٹی نکال کر شلوار قمیص پہن رہی تھی۔ یہ عورت اس کی داشتہ ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی اور بچے کہیں اور رہتے ہیں... حرام کی جو آمدنی ہوتی ہے اس میں آدمی کو حرام اور بدکاری ہی سوجھتی ہے... بہرکیف میں بلیک میلنگ کے چکر میں نہیں

پڑتا۔ ابھی تو مجرم نمبر ایک کو سزا ملی ہے۔ مجرم نمبر دو باقی ہے۔"

"دوسرا مجرم کون ہے؟" جمال نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔ "میں سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"یار! وہ جو تمہارے فلیٹ میں گھسا بیٹھا ہے۔" بادشاہ نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا تھا کہ جمال ہاتھ پر ہاتھ مارے۔ پھر اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ جو عورت اس مالک مکان کے بیڈ روم میں دیکھی اس فلیٹ میں اس کے شاید ماں باپ یا سرپرست ہوں۔"

رات کو بادشاہ نے اس کے سوٹ کیس میں سے نکلنے والی تصویروں کا معائنہ کیا اور تبصرہ کیا۔

☼ ☼ ☼

"تو یہ محترمہ ہیں ایس پی عبدالخالق کی لڑکی... بڑی فنتوش ہے۔ لاکھوں میں تو ایک ہے۔"

"بڑی دغاباز اور مکار نکلی غزالہ... میرا تو خون کھول رہا ہے؟" وہ تیدہ لہجے میں بولا۔

"مفت میں خون مت جلاؤ بیٹے... !تم نے اپنے کھیل کے عروج کے زمانے میں فین لڑکیوں کو کلی سے پھول ' دوشیزہ سے عورت بنایا ... اور شادی شدہ عورتوں کی خودپردگی اور ان کے پرشباب گداز بدن سے بھی کرکٹ کی طرح کھیلتے رہے... ساتھ ساتھ غزالہ بھی سہاگ راتیں مناتی' منہ بولی بیوی بنی ہر طرح سے خوش کرتی رہی ... اور کیا چاہیے میرے دوست! میرے یار! وہ اپنے آپ کو محبت میں پامال کرتی رہی امریکہ یورپ میں اور وہاں سے جو بلیو فلمیں آتی ہیں۔ ان میں لڑکیوں عورتوں کے ساتھ ناجائز حرکتیں پیش کی جاتی ہیں اور نائٹ کلبوں میں بھی جو شو ہوتے ہیں اس میں ایک عورت کتیا سے بھی بدتر فعل خوشی خوشی پیش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے معاشرے میں لڑکیاں عورتیں تجربات کو بڑی اہمیت دیتی ہیں... یہ جو سیلفی سے لی ہوئی جذباتی' رومانی اور ہیجانی تصویریں غزالہ کی پانچ سے دس ہزار ماہانہ دے سکتی ہے تمہیں جرمانہ' ہرجانہ... یا یکمشت لاکھ دو لاکھ بھی... کیوں کہ اس کا باپ لاکھوں کی رشوت لا کر گھر میں رکھتا ہے اور پھر اس کا شوہر بھی لاتا ہوگا... آخر تمہاری زندگی کس کی وجہ سے برباد ہوئی۔ آج تم ٹیسٹ کرکٹ میں ہوتے۔ دنیا میں ٹینس' فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑی کروڑپتی سے کم نہیں ہیں۔ تم اس کی وجہ سے اے وی پی نہیں رہے۔ ایک قاتل اور حوالات میں سولہ دن جوتے کھاتے رہے اور تمہارا کیریئر اس سے پہلے تباہ کر دیا گیا۔ اس تھانے دار نے تمہاری رہائی سے قبل ایک چڑیل کو غسل خانے میں تمہارے ساتھ بند کر دیا اور پھر رات ایک مہترانی تمہیں ہر طرح سے سرفراز کرتی رہی۔ آج تمہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ گھوم رہی ہے نئی ہنڈا اکارڈ میں... تم ان تصویروں کی بدولت اسے ہر طرح سے نشانہ بنا سکتے ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو میرے خیال میں ناجائز' جائز ہوگا۔"

جمال رات بھر جیسے اذیت ناک کرب کے انگاروں پر لوٹتا رہا۔ بادشاہ کی باتوں نے اس کے وجود میں انتقام کی آگ بھری دی تھی۔ اس کے تصور میں وہ گھومتا جہاں پہلے غزالہ رہتی تھی۔ اسے جمال کا خیال تک نہ تھا۔ الو کی پٹھی مجھے حوالات بھیج کے خود نکاح پڑھوا لیا۔ وہی میری تباہی کی ذمہ دار ہے۔ وہ جس عالی شان گھر میں رہتی ہے اس کی خواب گاہ میں اپنے شوہر کے ساتھ آلودہ جسم کے ساتھ لپٹ کے سوتی ہے۔ اسے جمال کا خیال تک نہ آتا ہوگا لیکن جب وہ شوہر کی آغوش میں ہوتی ہے یہ خیال تو کسی ناگ کی طرح ڈستا ہوگا کہ جمال نے اسے کیا ناجائز استعمال کیا ہوگا۔ وہ اس خیال اور تصور کو ذہن سے کیسے جھٹک سکتی ہے۔

صبح ناشتے کے بعد بادشاہ نے اس سے کہا۔

"پہلے تو ہم چل کر چیک کیش کراتے ہیں۔ اس نیک کام میں تاخیر نہ کریں۔ اس مالک مکان کا کوئی بھروسا نہیں... کیوں کہ راشی ہے اور حرام کماتا اور کھاتا ہے۔ ساٹھ برس کی عمر ہونے والی ہے پھر بھی داشتہ رکھی ہوئی ہے۔ رات مجھے یاد آیا کہ اس کی داشتہ ماڈل ہے۔ وہ پہلے ٹی وی کمرشل میں آتی تھی۔ چیک

کیش ہونے کے بعد پھر تمہیں ایک تماشا دکھاتے ہیں۔ دولت کمانی ہے تو ہماری شاگردی اختیار کرو۔ اس نوے ہزار سے نو لاکھ بنا سکتے ہو۔ تم کہتے ہو کہ پیسے کو پیسا کھینچتا ہے اور پیسا نوکری کر کے نہیں ملتا۔ وہ تو تن خواہ ہوتی ہے۔ صرف تن خواہ لے تو انسپکٹر جنرل آف پولیس کو بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتے۔ تن خواہ تو بھتا ہوتی ہے جو یہ لوگ حکومت سے وصول کرتے ہیں۔ یہ ڈپٹی کمشنر اور انکم ٹیکس... ایکسائز والے' پی ڈبلیو ڈی اور محکمہ انہار۔ یہ کہتے ہیں کہ کچھ کالی بھیڑیں ہیں... لیکن میں کہتا ہوں کہ کچھ سفید بھیڑیں ہیں۔ باقی سب کالی ہیں۔ دولت سیدھے ہاتھ سے نہیں آتی... یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

جمال نے اس کے لیکچر کو غور سے سنا۔ اسے انکار نہیں تھا اور دوسرا تماشا دیکھنے چلا گیا۔ اس لیے بھی کہ وہ خود بھی تو حالات کے ہاتھوں تماشا بنا ہوا تھا۔ بادشاہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"اس لفافے کو ایک طرح سے اس طرح پہنچانا ہے جیسے یہ ایک نہایت پیغام ہے۔" بادشاہ نے تاکیدی انداز میں کہا۔

"کہاں دینا ہے؟" جمال نے اس لفافہ کو جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"گلشن میں ہی ایک گھر ہے۔" بادشاہ نے جواب دیا۔ "وہ ہزار گز کے رقبے پر بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک گنجا ہاکی کا کھلاڑی رہتا ہے۔ لال رنگ کی اسپورٹس کار میں بڑے کروفر سے گھومتا ہے۔ ٹویوٹا اسپرنٹر میں... کمینہ جب ہاکی کھیلتا تو سوکھا مریل اور قلاش تھا۔ اس کی ایک بڑی بہن جو خوب صورت کم بڑی جنسی کشش رکھتی ہے۔ اوپر کے حلقے میں بڑی مقبول ہے اور بے حد پسند کی جاتی ہے۔ اور پھر اس کا لباس... خیر آج ہر عورت اور لڑکی ایسا لباس پہنتی ہے کہ وہ بے لباس ہی دکھائی دے۔ اس کی سفارش پر حسب روایت اسے کسٹم والوں نے نوکری دی اور اس نے سابقہ قومی خدمات کے بدلے قوم سے معاوضہ وصول کرنا شروع کیا۔ اپنی بہن کی سفارش کی بدولت اس نے بہت کچھ پالیا اور پا رہا ہے۔"

"یار بادشاہو... !مجھ غریب کو پھنسا مت دینا۔" وہ بولا "سولہ دن حوالات کے اور اس چڑیل عورت نے غسل خانے میں مجھے جو ایک نوزائیدہ بچے کی طرح نہلایا تھا میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا... ہر مرتبہ نوجوان مہترانی ہم بستر ہونے سے رہی۔"

"حد ہوگئی جمال صاحب... تمہیں تو اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونا چاہیے کہ جیسے بشیر ساربان امریکی صدر جانسن کے راستے میں اونٹ لیے کھڑا تھا اور صدر محترم نے رک کر اس سے ہاتھ ملایا اور اسے باعزت طور پر امریکہ بلا لیا... یاد ہوگا نا... بس ایسے ہی تمہاری لاٹری نکل آئی کہ تم میری گاڑی سے ٹکرا گئے اور میں نے تمہیں اپنے ساتھ بٹھا لیا دوست بنا کے... ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے کہ تمہاری جیب میں نوے ہزار ہیں۔ کیا میں نے کوئی حصہ یا کمیشن مانگا ہے اس میں سے... اگر تم پکڑے جاتے تو پکڑے جاتے۔"

جمال شرمندہ ہو گیا اور اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور وہ ندامت سے بولا۔

"آئی ایم ساری یار بادشاہ سلامت... !کیا ہے اس لفافہ میں؟"

"بم نہیں ہے..." بادشاہ نے کہا۔ "کچھ تصویریں ہیں اور ایک خط ہے۔ خاتون کو دینا ہے اور لوٹ آنا... اس وقت وہ اکیلی ہوگی۔" جب وہ گاڑی سے اترنے لگا تو بادشاہ نے اسے روک کر کہا۔ "اگر وہ مہمان ہونا چاہیں تو اس کی اجازت ہے۔"

جمال نے لفافہ لے لیا اور اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ ایک ملازمہ نے اسے نشست گاہ میں بٹھا دیا جو دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ اس نے خود کو اس کی مالکن کا کزن ظاہر کیا تھا۔ اس کی مالکن واش روم میں تھی اور نہا رہی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی تھی۔ اس عورت کے آنے سے پہلے اس نے لفافہ کھول لیا اور تصویروں کو دیکھا تو اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کل چھ عدد تصویریں تھیں۔ ہر زاویے سے ہر تناسب'

حصے اور گوشوں اور نشیب و فراز کی.... بدن پر ایک دھجی تک نہ تھی۔ اس نے جلدی جلدی خط پڑھا۔ اس میں نیگیٹوز کے بدلے پانچ لاکھ مطالبہ کیا گیا تھا۔ عورت کے آنے سے پہلے ہی وہ موقع دیکھ کر نشست گاہ سے باہر نکل آیا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ لفافہ اس نے پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

"کیا ہوا....؟" بادشاہ نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اسے دبوچا تو مارا ہو۔"

"نہیں.... وہ اتنی بد اخلاق تو نہیں تھی۔ اس نے مجھے چوما تھا۔" جمال نے بات بنائی۔

"پھر کیا کہا....؟" بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا اس نے کہا کہ تم رک جاؤ رات بھر....؟"

"کہہ رہی تھی کہ بادشاہ سلامت سے کہنا کہ میں خود بات کروں گی ان سے.... چند دن میں....." بادشاہ نے حسب عادت قہقہہ مارا اور پھر چٹاخ سے ہاتھ مارا اور مسکرا کے بولا۔

"تم خوامخواہ ڈر رہے تھے تم.... جب اس نے تمہیں چوما تھا تو فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ وہ بڑی گرم جوش اور سیکسی عورت ہے.... وہ تم پر اس طرح مہربان ہو جاتی جس طرح غزالہ ہوتی رہی اور تمہیں ہر بات کی اجازت دیتی۔ خیر اس خوشی میں کہ اس نے تمہیں جی بھر کے چوما میری طرف سے شان دار ڈنر.... شیرٹن کلال قلعہ یا سی ویو۔"

"نہیں میری طرف سے.... تم نے مجھے نوے ہزار دلوائے ہیں آخر...." جمال نے کہا۔

"نوے ہزار نہیں.... ایک لاکھ کہو۔" بادشاہ نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جمال نے اپنے فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ اٹھارہ انیس برس کے ایک نوجوان نے دروازہ کھولا تو جمال اک دم سیدھا گھس گیا۔ نوجوان نے چلا کر کہا۔ "اے مسٹر! کون ہو تم....؟" پھر اس نے آگے بڑھ کر راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔

جمال نے اسے غیر محسوس انداز سے ایک طرف دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا۔ پھر اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"پہلے تم میری بات کا جواب دو کہ تم کون ہو اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟"

اسے ایک عورت کی ہذیانی چیخ سنائی دی۔ پھر دوسرے لمحے ایک نسبتاً عمر رسیدہ شخص سامنے والے کمرے سے نمودار ہوا۔ اس وقت تک جمال، بادشاہ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایک تپائی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ چکا تھا اور اس کا دیا ہوا ریوالور نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی وہ سب خوف سے ساکت ہو گئے تھے۔

"آخر میرے فلیٹ میں کیسے گھسے تم لوگ؟ میں گولی بھی مار سکتا ہوں۔" اس نے دیوار کو انگلیوں پر نچایا۔

"یہ فلیٹ! ہم نے کرائے پر لیا ہوا ہے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"بکواس بند کرو.... تم جھوٹ بول رہے ہو۔" جمال بگڑ گیا۔ "مجھے کرایہ نامہ دکھاؤ۔"

"کرایہ نامہ.... ابھی بنا نہیں۔" عمر رسیدہ شخص نے سامنے آکر کہا۔ "ہم نے بیس ہزار ایڈوانس دیا ہے۔ تین ہزار ماہانہ کرایہ پر لیا ہے۔ مالک مکان کو بلا کر پوچھ لیں۔"

"ایسی کی تیسی مالک مکان کی۔" جمال نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ دیکھو کرایہ نامہ اور یہ آخری رسید ہے۔"

بوڑھے نے فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اٹھا کے انہیں غور سے پڑھا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے.... اس نے چال بازی کی ہے۔" اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"میرا سامان کہاں ہے؟" جمال نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔

وہ عورت جو دروازے میں کھڑی تھی جس کا سینہ خوف سے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کمرے میں آ گئی۔

"بیٹا....! سامان تو کچھ بھی نہیں تھا۔ فلیٹ بالکل خالی پڑا تھا۔ میری بات کا یقین کرو۔"

"بہت خوب۔" جمال معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ "اڑوس پڑوس اور اس بلڈنگ میں رہنے والے لوگ جانتے ہیں اور ان سب کو معلوم ہے کہ میرے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ ٹی وی، فریج، ڈی وی ڈی، صوفے اور کارپٹ.... واشنگ مشین اور اوون.... تم لوگ ڈاکو ہیں۔ تالا توڑ کے اندر گھسے ہو اور میرا سارا قیمتی سامان بھی بغیر ڈکار لیے ہضم کر چکے ہو۔"

ٹھیک اس وقت بادشاہ نے دروازہ بجایا تو جمال نے کہا۔

"اندر آجائیں وکیل صاحب....!"

دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ وہ اندر کی طرف دروازہ کھولتا ہوا گھس آیا اور کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا سین ہے؟ یہ سب لوگ تم سے کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وکیل صاحب! آپ پولیس کو بلا لائیں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے گھر کرائے پر لیا ہے۔ ان کے پاس کرایہ نامہ وغیرہ کچھ نہیں ہے اور میرا سارا سامان غائب ہے۔" بوڑھا اک دم سے دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"نہ.... نہ پہلے میری بات سن لو بیٹا! پولیس کو بلانے کی ضرورت نہیں۔"

"بیٹا نہیں ہوں میں تمہارا.... میرے باپ ہوتے تو اس گھر کا تالا توڑ کے اندر نہیں آسکتے تھے۔ تم سب بدمعاش اور ڈاکو ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا گروہ ہے پورا.... نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی شامل ہیں اس میں۔ تالا توڑ کے گھس جاتے ہو جہاں موقع ملے۔"

بہت رونے پیٹنے کے بعد بڑے میاں نے کانپتے ہاتھوں سے پچاس ہزار کا چیک کاٹا اور جمال کو پیش کیا۔ "ہماری غلطی کو معاف کر دو بیٹا! ہم شریف لوگ ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا مالک مکان چکر باز ہے۔"

"ٹھیک ہے چچا....!" جمال نے چیک کو غور سے پڑھا۔ "اس چیک میں کوئی چکر تو نہیں ہے نا؟ بوگس چیک بہت سنگین جرم ہے۔"

"اگر تمہیں شک ہے تو میں کیش دے دوں گا.... دو گھنٹے کے بعد میری دکان پر آجاؤ۔" اس نے دکان کا پتا بتایا۔

"واقعی غلطی تمہاری نہیں ہے۔" جمال نے کہا۔ "تم چاہو تو مالک مکان سے اپنا نقصان پورا کر لینا۔ اگر ہمت ہے؟ پولیس سے بھی مدد لے سکتے ہو۔" آدھے گھنٹے کے بعد جمال کے نوے ہزار ایک لاکھ چالیس ہزار میں بدل چکے تھے۔ وہ بہت خوش تھا اور پر اعتماد.... اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ آج تک وہ بلاوجہ خوار ہوا۔ مانگنے سے دنیا میں کچھ نہیں ملتا۔ بقول....

اے گدا گر خدا کا نام نہ لے
اس سے انسان کا دل نہیں ہلتا
یہ ہے وہ نام جس کی برکت سے
اکثر اوقات کچھ نہیں ملتا

تصویروں والا لفافہ ابھی تک اس کی جیب میں تھا اور وہ بادشاہ کے سامنے خود کو مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنے محسن کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا جس نے اسے جینے کی نئی راہ دکھائی تھی اور زندہ رہ کر کامیابی حاصل کرنا سکھایا تھا۔ جمال نے اس کے اعتماد کو مجروح کیا تھا۔ وہ عجیب سے دوراہے پر آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں دلائل کی ایک عجیب سی کش مکش جاری تھی۔

اس کے وجود میں جتنی نیکی تھی وہ کہتی تھی کہ کسی شریف عورت کو بلیک میل کرنا بدترین اخلاقی اور قانونی جرم ہے اور کسی مجرم کے عزائم پورے کرنے میں معاونت بھی جرم ہے۔ لیکن اس کے مجرمانہ منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دینا کوئی جرم نہیں۔ دھوکے باز کو دھوکا دینا جائز ہے۔ پھر اک دم سے اسے خیال آیا کہ یہ عورت کون سی پاک باز اور آبرو یافتہ ہے۔ اسے یاد آیا کہ وہ کمرشل میں آتی ہے۔ جو لڑکی عورت بھی شوبزنس میں آتی ہے وہ داغ دار ہوتی ہے۔

راتیں کالی کرتی ہے۔۔۔ اس کی تصویریں ایسی تھیں کہ اس کی نیت میں فتور آنے لگا۔ اس کا بدن، سراپا، تناسب اور نشیب و فراز ایسے تھے کہ اس کے ساتھ ہر ارمان پورا کرنا جائز تھا۔ یہ جو شوبزنس کی ہی نہیں بلکہ اور لڑکیاں عورتیں جو جو کھلے گریبان جن میں خربوزے دھڑکتے تھے۔ پھر وہ کولھوں، رانوں اور باریک سے باریک خدوخال کی نمائش کرتی تھی اب معیوب بات نہیں رہی تھی۔ اب وہ ان تصویروں سے بلیک میل کرکے دل کا ہر ارمان پورا کرنا چاہتا تھا۔ شوبزنس کی فن کارائیں کالی راتوں میں ہر بات اس لیے مان لیتی تھیں کہ انہیں منہ مانگی رقم ملتی تھی۔ اب تو اس کے پاس بڑی رقم موجود ہے۔ وہ کسی فائیو اسٹارز ہوٹل میں کمرا بک کرکے غزالہ کو فون کرے گا اور ان تصویروں کا حوالہ دے گا تو وہ آکر اسے خوش کرنے سے انکار نہیں کرے گی۔ پھر وہ غزالہ کے ساتھ ہر فعل اور حرکت کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ کیوں کہ غزالہ نے اسے دھوکا دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ ابھی اسے نیکی بدی کے چکر میں نہ پڑھنا چاہیے۔ ان دونوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے جلد بازی نہ کرے۔ رات کو شیرٹن کے جگمگاتے ماحول میں بادشاہ نے اس کا تعارف دو لڑکیوں سے کرایا۔

”یہ مس شیریں ہیں۔ ان کے ہونٹ جتنے شیریں ہیں وہ سراپا شیریں ہیں۔ بہت جلد ڈاکٹر بن جائیں گے۔ یہ فی الحال میرے دل کا علاج کررہی ہیں اور خود بھی غالباً اسی مرض میں مبتلا ہیں۔“

شیریں نے شرما کے کہا۔ ”شٹ اپ۔۔۔“ شرم نے اس کا چہرہ اتنا دل کش بنا دیا کہ بادشاہ نے چوم لیا۔ کیوں کہ یہاں اس وقت ان کے سوا یہاں کوئی نہ تھا۔

”یہ محترمہ بھی اسی کشتی میں سوار ہیں۔ دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔ اگر تم دکھی انسان ہو تو یہ تمہاری ہر خدمت کرسکتی ہیں۔“

”میں تو بہت دکھی انسان ہوں۔ جمال نے رونی آواز اور صورت بنا کر کہا۔ ”بلکہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں میرا نام آنا چاہیے اس لیے کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ دکھی انسان کوئی نہیں ہے۔“

دوسری لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ جمال اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرلیا اور چوم بھی لیا۔ بادشاہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کا نام مہناز تھا مگر وہ ہنی کہلاتی تھی۔ شیریں کے مقابلے میں وہ بہت شوخ اور تیز طرار تھی۔ دونوں کی صورتیں میک اپ، ہیر اسٹائل اور تنگ و چست اور بے حجاب اور عریاں کردینے والا لباس سے بڑی سیکسی لگ رہی تھیں اور قدرے قابل قبول ہوگئی تھیں۔ اگر انہیں صبح جاگنے کے بعد اور منہ دھونے سے پہلے دیکھا جاتا تو وہ بد صورت نظر آتیں۔ جسم میں دل کشی تھی۔ ڈنر کے دوران جمال نے اسے میز کے نیچے سے تین بار اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

اس نے چلا کر کہا۔ ”ڈیئر! دیکھو۔۔۔ اس میز کے نیچے گدھا گھس گیا ہے۔ مجھے لاتیں مار رہا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں گدھا۔۔۔“

شیریں نے گھبرا کے اس کا چہرہ دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔ ”یہ کیا حرکت کررہی ہو؟“

جمال نے ہنس کر کہا۔ ”کچھ نہیں۔۔۔ میرا پیار کا نام یہی ہے۔ انہیں تو اصل نام تو ابھی تک بتایا نہیں تھا میں نے۔۔۔ بائی دے شیریں! آپ میرے کان دیکھیے۔۔۔ کیا گدھے جیسے نہیں ہیں؟“

وہ ہوٹل میں رہتی تھیں اور انہیں جلدی بھی جانا تھا۔ ڈنر کے بعد رخصت ہونے لگیں تو وہ انہیں رخصت کرنے کار پارکنگ پر آئے تھے۔ بادشاہ نے شیریں کو اور جمال نے ہنی کو ملگجے اندھیرے میں خوب چوما اور ہاتھ بھٹکتے رہے تھے۔ انہوں نے واجبی سا احتجاج کیا۔ پھر جب وہ لباس، بال اور حلیہ درست کرنے لگیں۔ ہنی نے سرگوشی سے آہستگی سے کہا تھا۔

”تم بڑے جذباتی ہو لگتا ہے کہ بوسہ لینا اور چومنا انگریزی فلموں کو دیکھ کر سیکھا ہے۔ تم نے تو میری ہڈی پسلی ایک کردی۔“

پھر بادشاہ نے اگلے ہفتے کا پروگرام طے کیا تو وہ طے پا گیا تو پھر دونوں جذباتی ہوگئے اور ہائی روف گاڑی کے عقب میں وہ دونوں جوڑے ہوگئے۔ کچھ شرمانے کی اداکاری کی تھی اور بہانے بھی کیے تھے جو سب جھوٹے تھے۔ بادشاہ اور جمال بھی اس کھیل کے ماہر تھے۔ انہوں نے ان کی ایک چلنے نہیں دی۔ انہیں پھر اپنے بال اور لباس کی شکنیں درست کرنا پڑی تھیں۔

”میں ریسٹ ہاؤس بک کرواؤں گا۔ کل چودھویں کی رات ہے۔ ہم کلری جھیل میں کشتی رانی کریں گے۔ صبح مچھلی پکڑیں گے۔۔۔ اور فرائی کریں گے۔ زبردست پکنک ہوگی۔ تازہ مچھلی کی بات ہی اور ہوتی ہے۔“

شیریں نے ہنی کی طرف اور ہنی نے شیریں کی طرف دیکھا۔ بالآخر اعتراف کرلیا تھا کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔۔۔ وہ چاہتی تھیں کہ انہیں پھر دبوچ لیا جائے۔ چوں کہ اس وقت ہائی روف کا مالک اور اس کی بیوی بچے آرہے تھے اس لیے وہ دونوں چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ میں آگئے۔ بادشاہ نے کافی منگوالی جمال نے کہا۔

”یار! یہ ہنی گو سانولی ہے مگر بڑی نمکین اور گرم جوش ہے۔ اگر تنہائی ہوتی تو ہاتھوں کو زحمت دینا نہیں پڑتی۔ تلوار میان سے خود بخود نکل آتی۔۔۔ بڑی پیاسی لگ رہی تھی۔“

”چیں کیا شک۔۔۔؟“ بادشاہ ہنس پڑا۔ ”اگر تنہائی میں بوس و کنار ہوتا تو یہ مہربانی ہوجاتی اور بڑی فیاضی سے پیش آتی۔ یہ بھی تگڑی آسامی ہے۔ اس کا باپ بہت بڑا زمین دار ہے۔ دوسری کا امپورٹر یعنی اسمگلر۔۔۔ دونوں ایک ایک لاکھ اپنے سمیت فوراً دے دیں گی۔“

”آپ نے تو بتایا تھا کہ یہ دونوں ابھی پڑھ رہی ہیں؟ کیا مچھلی کی طرح پھسل پڑیں گی؟ طالبہ جو ہیں۔“

”ایک لاکھ کیسے دیں گی یہ؟ کیا تمہارے پاس ان کی بے لباسی کی حالت کی تصویریں ہیں جن سے بلیک میل کروگے؟“

”اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ بھئی ان دونوں کو مجھے بے لباس بنانے کا شوق نہیں جنون ہے۔ وہ میرے سامنے دونوں ہی ہر حالت میں آجاتی ہیں صرف اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آپس میں بڑی متحد اور بے تکلف ہیں۔ مجھ سے بھی۔۔۔ تم نے ان دونوں کا زیور دیکھا؟ امی ٹیشن جیولری نہیں تھی وہ مسٹر جمال! اصلی ہیروں کے نیکلس اور ٹاپس تھے۔“

”واقعی۔۔۔؟“ جمال بھونچکا رہ گیا۔ اس پر چند ساعتوں تک سکتہ سا طاری رہا۔ ”اصلی ہیرے؟“

بادشاہ نے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور کافی کا گھونٹ لینے کے بعد بولا۔

”ایک کے پاس ہنڈا سوک ہے۔ دوسری کے پاس ری کنڈیشنڈ کرولا۔۔۔ ان کی مالیت لاکھوں سے زیادہ ہے۔“ کیوں نہ ان سے ٹرانسفر لیٹر لے لیں کہ گاڑی ہمیں بیچ دی ہے۔ ان کے کروڑ پتی ابا میاں دوسری دلوا دیں گے۔“

”کیا وہ ان سے نہیں پوچھیں گے کہ گاڑیاں کہاں گئیں؟ وہ کوئی کھلونا گاڑیاں تو ہیں نہیں۔۔۔؟“

”ان کے باپ کے لیے یہ گاڑیاں کھلونے کی مالیت سے بھی کم ہیں۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شہر میں روزانہ بارہ پندرہ گاڑیاں چھین جانا معمول کی بات ہے جس کی رپورٹ ہی نہیں لکھوائی جائے گی تو وہ برآمد کیسے ہوگی۔ ہم رسید بھی لے لیں گے اور کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔ اگر برا وقت آیا تو ہم رسید دکھا دیں گے اور ٹرانسفر لیٹر کہ خواتین نے ہمیں گاڑی فروخت کی ہے۔ ان کے ابا ہی ان سے دریافت کریں کہ پیسے کیا ہوئے؟“

”یار بادشاہ! تم واقعی بادشاہ فراڈ ہو۔“ جمال ہنس پڑا ”بلکہ ایک نمبر حرامی ہو۔“

”تھینک یو۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ایک نمبر کے مہا حرامی ہو جاؤ۔ تم میں اس کی صلاحیت ہے۔ تم ایسے ہینڈسم اور اسمارٹ لڑکیوں عورتوں میں لذتیت گدگداتی ہوگی اور تصور میں وہ تمہیں باہم پیوست محسوس کرتی ہوں گی۔ باتیں اچھی کرلیتے ہو۔ چٹپٹے دار اور میٹھی۔۔۔ یہ لڑکیاں عورتیں تو باتوں کے جال میں ہی

پھنستی ہیں۔ عیش کرو اور کیش بھی وصول کرو۔ اس شہر میں ایسی لڑکیوں بیگمات کی کوئی کمی نہیں جو تم جیسے لڑکوں سے عیش کرتی ہیں اور کیش بھی دیتی ہوں۔ تم دو دھاری تلوار ہو۔۔۔“

پھر اس نے چٹاخ سے ہاتھ مارا اور پوچھا۔ ”تمہاری فین لڑکیاں بیگمات بقول تمہارے عروج کے دنوں کیا ناجائز خواہش بھی پوری کرتی تھیں؟“

”ہاں۔۔۔“ جمال نے سر ہلا دیا ”میں نے تمہیں بتایا تھا نا؟ کیا یہ حرکت اور فعل عورت پسند کرتی تھی؟“

”اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ۔۔۔ وہ بڑی محتاط ہوتی تھیں کہ کہیں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔۔۔ میں بھی اس لیے کہ کہیں وہ کسی اور کا پاپ میرے سر نہ تھوپ دیں۔۔۔ پھر بھی کتنی کلیاں پھول بن گئیں اور دوشیزائیں عورت۔۔۔ یہ طوفان اچانک آنے سے ہوا تھا۔ وہ لڑکیاں یونیورسٹی اور کالج کی طالبات اور عورتیں جو گھریلو‘ دفاتر میں کام کرنے والی ہوتی تھیں نشہ کرتی تھیں۔ نشے کی حالت میں ہر فعل‘ حرکت اور ناجائز بات اور اذیت برداشت کرلیتی تھیں۔ ان کا تعلق آسودہ حال گھرانوں سے ہوتا تھا۔“

جمال نے پھر سوچا کہ تصویریں بادشاہ کو دے کر اس سے معافی مانگ لے۔ ایک تو اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس کی نیت میں اس لیے فتور تھا کہ یہ عورت نامناسب فعل کے لیے نہایت موزوں تھی۔ غزالہ کی طرح۔ اس لیے تو وہ کبھی کبھی غزالہ کے ساتھ ناجائز حرکت کر جاتا تھا۔ وہ عورت شاید ان تصویروں کے باعث اس کی ہر بات مان سکتی تھی لیکن وہ کسی ان جانے ڈر سے بھاگ آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ عورت بھی نشہ کرتی ہوگی۔ کیوں کہ وہ ہاکی پلیئر کسٹم میں ملازمت کرتا ہے۔ کوئی ہیروئن لے جانے والا دھر لیا جاتا ہے تو شاید وہ اس میں کچھ ہیروئن پار کرکے لے آتا ہوگا۔ اسے نشے کے عادی بنا دیا ہوگا تاکہ۔ تاب رزا اور نامناسب ارمان پورے کرے۔ اس نے اس معاملے کو صبح پر چھوڑ دیا لیکن اس عورت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ غزالہ اور دوسری لڑکیوں عورتوں کا خلا پورا کردے گی۔

”کہیں وہ پستول اصلی تو نہیں تھا جو تم نے مجھے دیا تھا؟“ جمال نے پوچھا۔

”نہیں یار! اصلی پستول چل جائے تو بندہ مرجاتا ہے۔“ بادشاہ نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔ ”کھلونا پستول سے کیس نہیں بنتا ہے۔ گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ شہر کے لوگ اتنے ڈرے ہوئے ہیں کہ نقلی پستول کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ اسے اصلی سمجھ کے اپنی جان بچاتے ہیں۔ ہاں یاد آیا ایک بات پوچھنی تھی مجھے تم سے۔۔۔“

”کون سی بات بادشاہ سلامت؟“ جمال نے ہنس کر تجسس سے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ پولیس نے تمہارا پکا چالان پیش کیا اور عدالت سے چودہ دن کا ریمانڈ لیا۔ پھر ایک ایس پی کے کہنے پر کیسے چھوڑ دیا؟“

”پولیس سیاہ سفید کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ بہن کو بھی بیوی بنا دیتے ہیں۔“

بادشاہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس نے پراسرار سے لہجے میں کہا۔

”یار جمال! یہ معاملہ کچھ گڑبڑ اور دال میں کالا ہے۔ وہ پابند تھے تمہیں دوسری بار مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کے۔۔۔ اگر ایف آئی آر کاٹی گئی تھی۔“

”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایف آئی آر کاٹی نہیں گئی تھی؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میرا تو خیال ہے کہ ریمانڈ بھی نہیں لیا گیا بلکہ ایک ڈراما ضرور کیا گیا تمہارے ساتھ۔۔۔ خیر کل معلوم کریں گے۔“

”تم پولیس کو بھی بلیک میل کرو گے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ بلیک میل ہوجائے گی؟“

”نہیں‘ کسی اخبار کے کرائم رپورٹر کو بھیج دیں گے ایس پی صاحب کے پاس۔۔۔ وہ ان سے اچھی طرح سے نمٹ لے گا۔“

”کیا تم کسی ایسے اخباری رپورٹر کو جانتے ہو جو وہ

کرائم رپورٹر بھی ہو؟“

”میں خود کیا کم ہوں کسی اخباری رپورٹر کے نمائندے سے۔“ بادشاہ ہنس پڑا۔ ”دیکھو گے میرا کارڈ۔۔۔؟“

”کیا کہا۔۔۔؟“ جمال بھونچکا ہوگیا۔ ”پریس کارڈ بھی ہے تمہارے پاس؟“

”اپنے وطن میں سب کچھ پیارے۔۔۔ پوسٹ کارڈ‘ راشن کارڈ‘ کریڈٹ کارڈ۔۔۔ پریس کارڈ اور سب سے بڑا ہوتا ہے ٹرمپ کارڈ۔۔۔ جو بازی جتواتا ہے۔ لہٰذا ٹرمپ کارڈ اپنے ہاتھ میں رکھا کرو۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بل تم دو گے یا میں دوں گا؟“

”میں دوں گا یار!“ جمال نے ایک لاکھ چالیس ہزار کے غرور میں ہزار کا نوٹ ایسے نکالا جیسے کوئی کاروالا فقیر کو خیرات دینے ایک روپے کا نوٹ نکالتا ہے۔“

بادشاہ کسی کام سے رخصت ہوگیا تھا۔ اس کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ جمال اپنی کمائی بینک میں رکھوانے گیا تھا۔ لنچ پر ان کی ملاقات طارق روڈ کے ایک چینی ریسٹورنٹ میں طے تھی۔ جب جمال وہاں پہنچا تو میز پر مزید دو لڑکیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”یہ شمی ہیں۔ پورا نام شمیم آرا۔ سوشل ورکر ہیں۔ صحافی ہیں‘ شاعرہ ہیں اور قاتل ہیں۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”ڈاکے بھی ڈالتی ہیں۔“

”کیا بک رہے ہو؟“ شمی بڑے زور سے ہنسی اور اپنی سرمگیں پلکیں جھپکائیں۔

”بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔۔۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔“ بادشاہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”ڈاکا آپ نے میرے دل پر ڈالا ہے اور چرا لیا ہے۔ قتل آپ نے مجھے کیا؟“ شمی نے بھی اٹھلا کے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”شٹ اپ۔“

”میں ان کا تعارف کرادوں تاکہ اجنبیت نہ رہے۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”یہ دوست ہیں ان کی ظاہر ہے ضمانت بھی یہی ہوں گی ورنہ دوستی کیسے ہوتی؟ شمی ڈارلنگ! یہ میرا پارٹنر ہے۔ بابر۔۔۔ تم انہیں بڑے پیار سے شہنشاہ بابر کہہ کر پکارو گی۔“

شمی کا چہرہ حیا سے اتنا سندر ہوگیا کہ جمال نے دل تھام لیا۔ اگر وہ گھر میں ہوتے تو وہ شمی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتا اور بادشاہ کی پروا کیے بغیر اسے چوم چوم کر نڈھال کردیتا۔

”آپ کا اکثر ذکر خیر ہوتا تھا۔“ شمی نے لجاتے ہوئے کہا۔ ”بادشاہ! بہت تعریف کرتا تھا آپ کی؟“

جمال پھر بھونچکا سا ہوگیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ بادشاہ نے اسے آنکھ ماری۔ ”تعریف بھی تمہاری کم نہیں کرتے تھے۔“

”اور شمی ان کی تعریف کرتی تھی۔“ بادشاہ نے اس کی سہیلی کی طرف دیکھا۔ ”دیدار آج ہوا مس شمی! برا مت مانیے گا اگر میں پٹڑی بدل لوں۔ اپنے حق میں تم نے اچھا نہیں کیا۔ اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے ان سے ملوا کے۔۔۔ کہتے ہیں ناکہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔“

شمی ہنسنے لگی اور اس نے بادشاہ کو شوخ نظروں سے دیکھا تو ان میں بڑی دزدیدگی تھی۔

”گل کو میں نے بتا دیا تھا کہ تم خطرناک آدمی ہو۔۔۔ کیا میں نے غلط کہا تھا؟“

”صرف گل۔۔۔!“ اب جمال نے سکوت کو توڑا۔ ”گل داودی۔۔۔ گل یاسمین۔۔۔ گل دان۔۔۔ گلبرگ۔۔۔“

گل مسکرائی تو اس کے گداز اور شیریں لبوں پر تبسم کی پتیاں بکھرنے لگیں۔

”گلنار نام ہے جی میرا پورا نام۔۔۔“ اس کی آواز میں بڑا ترنم سا تھا۔

جمال نے سوچا کہ اس سے کہے کہ تمہارے یہ شیریں ہونٹ گل سے بھی کہیں نرم و نازک اور لطیف اور شہد آگیں ہیں۔ کاش! یہ ملاقات تنہائی میں ہوتی تو میں تمہیں اور گلنار کردیتا اپنے ان ہونٹوں سے اور پھر اپنے ہونٹ بھی تمہارے انگ انگ سے گلنار ہو جاتے۔

اب تو فیشن تھا بے حجابی اور عریاں لباس میں نظر آنے کا۔۔۔ جرسی کا گریبان نیچی تراش کا اور خطرناک

تک کھلا ہوا تھا۔ اس نے دوپٹے کا تکلف قطعی نہیں کیا ہوا تھا۔ کالے رنگ کا پاجامہ اتنا تنگ و چست تھا جیسے وہ جونک بن گیا ہو۔ اس کے کولھے اور سڈول رانیں اور پنڈلیاں... بے لباس لگ رہی تھیں۔ اس کی اجلی رنگت، سینے کے فراز اور سڈول بانہوں کو قیامت بنا رہی تھیں۔ کھانے کے دوران اس کی نگاہیں نشیب و فراز پر چپکی رہیں۔ وہ میز کی ڈش سے کہیں بڑی لذیذ لگتی تھی۔ شمی بھی کم پرکشش اور دل کش اور شعلہ بدن نہیں تھی۔ لنچ کرنے جو جوڑے آرہے تھے۔ لڑکیاں عورتیں بھی بے حجابی کی حالت میں، یہ مفت کی ایسی تفریح تھی کہ بلیے بوائے میگزین بھی خرید کر ان کی جیسی تصویریں ان میں نہیں پاتا تھا۔ اب دنیا بہت آگے جا چکی تھی۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر، موبائل اور ٹی وی بھی ان لڑکیوں عورتوں کو جو بر سرِعام نظر آتی تھیں دیکھ کر شرما جاتے تھے۔ شمی اور گلنار کے تراشیدہ پیکر کا قرب بڑا حسین اور سنگین بنا ہوا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد بادشاہ نے پڈنگ کا دوبارہ آرڈر دینے کے بعد اس سے کہا۔

”مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم الو کے پٹھے ہو۔“

”بادشاہ سلامت نے ٹھیک فرمایا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ ہاں تو عالی پناہ! کیا خبر لائے ہیں؟“

”بڑی سنسنی خیز، چونکا دینے اور ناقابلِ یقین خبر ہے کہ وہ الو کی پٹھی تو زندہ ہے... تمہاری منگیتر...“

جمال اس طرح اچھل پڑا جیسے بادشاہ نے بجلی کا جھٹکا دیا ہو۔ اگر وہ کسی راکٹ پر ہوتا تو سیدھا چھت پھاڑ کے نکل جاتا۔

”کون رانی... ؟ کالی بھینس... کہیں تم نے کسی بھتنی کو تو نہیں دیکھا؟“

”بے وقوف آدمی... اس کا قتل ہوا ہی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی رپورٹ درج ہے کسی تھانے میں۔ تم بلاوجہ جوتے کھاتے رہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ جمال کا خون گرم ہونے لگا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

”ہو سکتا ہے... ہو سکتا ہے بیٹے! اس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا... کیا کالجوں اور یونی ورسٹی کی طالبات نشہ نہیں کر رہی ہیں؟ اس نشے کی لت نے مردوں اور اپنے محبوبوں کے ہر ناجائز فعل کا کیا عادی نہیں بنا دیا ہے! تم خود نے اپنی پرستار لڑکیوں عورتوں سے ناجائز ذوق پورا نہیں کیا... غزالہ نے بھی یہ فعل برداشت کیا۔ دنیا کتنی پاپی اور بدکار ہو رہی ہے۔“ بادشاہ نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ ”تصدیق کرنا چاہو تو تھانے چلے جاؤ۔ وہ تمہیں پہچاننے سے بھی صاف انکار کر دیں گے۔ غزالہ کے باپ نے کہا تھا کہ اس لونڈے کے دماغ سے عشق کا بھوت اتارنا ہے۔ شاید اسے اس بات کا شک ہو گیا کہ بیٹی محبت میں شاید اپنا سب کچھ نہ کھو چکی ہو۔ نوجوانی کا کیا بھروسا وہ اندھی اور جنونی ہوتی ہے۔ غزالہ کے باپ کو دہرا فائدہ حاصل ہوا۔ غزالہ تم سے بدظن ہو گئی۔ تم اسے منہ بولی بیوی بنا کر نامناسب اور ناجائز فعل کا ارتکاب کرتے رہے۔ آخر وہ کب تک یہ اذیت برداشت کرتی۔ تم ایک گھٹیا آدمی ثابت ہوئے۔ اس کی توقع سے کہیں زیادہ ذلیل آدمی... اس کی فطرت کا ردِعمل فطری سی بات تھی۔“

”کیا یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ میں بے گناہ تھا؟“ جمال نے تکرار کی۔

”نہیں... اگر علم ہوتا تو پھر نوبت ہی نہ آتی۔“ بادشاہ نے سر ہلایا ”اسے تو وہی معلوم ہے جو اسے بتایا گیا۔ اس کے باپ نے کہا کہ تھانے فون کر کے پوچھ لو۔ جس دن ریمانڈ کا ڈراما رچایا گیا تھا وہ عدالت میں موجود تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ تمہیں ہتھکڑی سمیت مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا مجرموں کے کٹہرے میں...“

جمال کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ یہ نفرت کی بادِ سموم ہی تھی جس نے غزالہ کی محبت کے گلشن کو خس و خاشاک کا ڈھیر کر دیا تھا۔ قصوروار غزالہ نہیں تھی بلکہ اس کا باپ تھا۔ قصوروار ہمیشہ کوئی اور ہوتا ہے سزا کسی اور کو ملتی ہے۔ اس جھوٹ کی آگ

اب جمال کے دل کو جلا رہی تھی۔ سازش غزالہ کے عیار اور مکار باپ نے کی تھی۔ رسوا محبت ہو گئی تھی۔ وہ جانتا ہو گا کہ زور زبردستی وہ غزالہ کو روک نہیں سکے گا۔ اگر اس نے سرکشی اختیار کرتے ہوئے جمال سے شادی کر لی تو بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ بیٹی یا بہن کے معاملے میں ہر شخص مجبور ہوتا ہے۔ وہ داماد یا بہنوئی کو جیل بھجوا دے گا تو انگارے بیٹی یا بہن کی زندگی میں بکھیرتا ہے۔ اسے پھانسی چڑھوا دے تو بیوہ بہن یا بیٹی کو کرتا ہے۔ ایس پی جہاں دیدہ اور چالاک آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹرمپ کارڈ کیا ہوتا ہے اور اسے کب استعمال کرنے سے بازی کیسے جیتی جا سکتی ہے۔ اس نے پورا گیم کھیلا۔ جمال سے کرکٹ چھڑوا دی۔ گھر چھڑوا دیا۔ وہ اکیلا اور لاوارث رہ گیا۔ ایس پی نے ہر جگہ اس کے لیے ملازمت کے دروازے بند کرا دیے۔ اس کی واپسی کو ناممکن بنا دیا۔ اس کے خلاف بیانات شائع کرائے اور کرکٹ کی دنیا سے جلاوطن کر دیا۔ وہ اس کے جذبات سے کھیلتا رہا اور اسے آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز سے کھیلتا رہا۔ منافقانہ شفقت کے ساتھ... تم یہ کر سکتے ہو تم وہ کر سکتے ہو۔ کچھ کر کے دکھاؤ۔ اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن اس کی بیٹی اپنا سب کچھ اسے سونپ کر کے داغ دار ہوتی رہے۔ ٹرمپ کارڈ اس کے ہاتھ میں رہا تھا... اور وہ ایک ایک کر کے پتے پھینکتا رہا تھا اور جمال بازی ہار گیا تھا۔ شاید وہ زندگی کی بازی ہار جاتا۔ ایس پی کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ جذباتی گدھا صرف ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے رو دے گا نہیں... خودکشی کر لے گا۔ خس کم جہاں پاک... نہو المطلوب...!

اس لیے خودکشی نہیں کی تھی کہ غزالہ جس دن فین بن کر اس کی زندگی میں آئی وہ منہ بولی بیوی بن رہی۔ وہ اس سے جارحانہ انداز سے کھیلتا رہا۔ ہر وہ فعل اور حرکت بھی کی جو ایک عورت کے ساتھ نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایس پی یہاں اندھیرے میں تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ وہ کسی خود فریبی کا شکار رہا۔

جمال ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ غصے اور نفرت سے کانپنے لگا۔

”میں اس کمینے، حرامی اور فرعون کو قتل کر دوں گا۔“ جمال نے دانت اور مٹھیاں بھینچ لیں۔

”ویری گڈ...“ بادشاہ نے مسکرا کے کہا۔ ”میں تمہارا ہر قدم پر ساتھ دوں گا میرے یار! ہم مل کر اسے وحشیانہ انداز سے قتل کر دیں گے۔ ابھی تو بیٹھو۔ ابھی تمہارا سر گرم ہو رہا ہے۔ اس پر عقل کی برف ڈالو۔“

”میں اس سور اور ذلیل کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔“ جمال بیٹھ گیا۔

”کسے... ؟ غزالہ کو؟ بالکل ٹھیک تم نے بڑا دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے۔“

”غزالہ... ؟ غزالہ کا کیا قصور ہے اس میں... ؟“ جمال نے برہمی سے بولا ”دھوکا تو اسے بھی دیا گیا۔ اگر اسے معلوم ہوتا یہ سب جھوٹ ہے۔“

”تم اس لیے اسے دوش نہیں دے رہے ہو اور دینا نہیں چاہتے ہو کہ وہ ایک برس تک تمہاری منہ بولی بیوی بنی رہی۔ ہر ملاقات میں وہ بڑی فیاضی سے مہربان ہو جاتی تھی۔ کئی راتیں کئی بہانوں سے تمہارے فلیٹ میں رہی۔ تم نے محبت اور جنگ میں ہر ناجائز کو جائز سمجھ کر ہر فعل اور حرکت کو جائز قرار دیا مگر پھر بھی وہ تم سے ہم بستر ہوتی رہی... یار! تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اسے معصوم نہ سمجھو۔ اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔ وہ ایک بار تو تم سے مل لیتی یا فون ہی کر لیتی۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ جمال نے کہا۔ ”مگر باپ نے تو اسے ریمانڈ کارڈ دکھا دیا تھا... کیا وہ مجسٹریٹ جعلی تھا؟“

”مجھے کیا معلوم... مجھ پر وحی تو نہیں آتی ہے اور نہ آئی ہے اصلی بھی ہو تو اسے کہاں پتا چلتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کی فائل ہے۔ نہ وہ مجرم کو جانتا ہے اور پہچانتا ہے۔ پیش کار نے کوئی فائل رکھی اس کے سامنے اور اس نے پتا نہیں کیا لکھا۔ پولیس نے کہا۔“

برخوردار چلو... تمہارا چودہ دن کا ریمانڈ ہو گیا۔ ہم تمہاری خبر لیں گے... اس وقت کوئی وکیل ہی کہاں تھا تمہارا...؟"

"وکیل...؟" وہ تند لہجے میں بولا "وکیل نے بعد میں مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"بعد میں اس نے اس لیے تمہیں سمجھایا تھا کہ بیٹھ جا کے تصفیہ کر لو۔ یہ لائن بھی ایس پی نے وکیل کو دی ہوگی۔ وہ تمہارے جائداد والے کیس کی وکالت کر رہا تھا۔ قتل کے کیس میں تمہارا وکیل نہیں تھا۔ ایس پی نے تمہارا ہمدرد بن کر کہا ہوگا کہ اس خر دماغ لڑکے کو سمجھاؤ... مقدمے بازی میں کیا ملے گا... چچا سے ایسے ہی جو مل جائے وہ وصول کرے۔ وکیل کی بقیہ فیس بھی ایس پی نے ہی دی ہوگی۔ باقی فیس اسے نہ جانے کب ملتی۔ اس فیس سے زیادہ وکیل کی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فوراً مل گئی تو اس نے بھی کہا ہوگا کہ جاؤ میاں نقد لے لو... ادھار پر لعنت۔"

مگر یار! وہ آدمی بہت اچھا، نیک اور مخلص بھی ہے۔ اس نے دوسرے دن ہی میری آدھی فیس واپس کر دی۔ میں اس کے گھر میں کئی ہفتہ رہا۔ میں شاید وہیں رہتا اگر اس کی دیرینہ ملازمہ کی بہو مجھ سے تعلقات استوار کرنے پر تل گئی تھی کہ اس کا شوہر نشہ کرتا اور لڑکوں کو گھر لا کر اس کے سامنے نامناسب فعل کرتا اور اسے بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے کسی فعل اور حرکت سے انکار نہ کرے۔ ویسے وہ بڑی پرکشش اور جاذبیت سے بھری ہوئی تھی دو مرتبہ میرے سامنے فطری حالت میں آ گئی تھی کہ میں پھسل پڑوں... لیکن میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا اور میں بے حد دکھی اور نالاں بھی تھا کسی بھی لڑکی عورت سے تعلقات استوار کر دی۔ میں اس لیے گھر چھوڑ دیا سدا کے لیے بہک اور پھسل کر غلاظت کے دلدل میں گر جاؤں... لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس نے رانی کیس کے بارے میں خاموشی اختیار کر رکھی۔ اسے تو علم ہوگا کہ میرے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوا تھا۔"

"مقدمہ کہاں درج ہوا تھا میرے یار! پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ... قتل کے کیس کا تمہارے چچا کو بھی علم نہیں ہوگا۔ بے شک پوچھ لو اس سے جا کے... وکیل نے تمہاری حالت پر ترس کھا کے تمہیں پیسے دے دیے۔ اسے ایس پی سے یقیناً فیس ملی ہوگی۔ وہ تمہیں چچا کے گھر نہ بھیجتا تو تم پر قتل کا کیس بھی نہ بنتا۔" بادشاہ نے کہا۔ "تم ذلیل و خوار نہ ہوتے اور خود کشی کا سوچتے۔"

"وکیل کو کیا معلوم کہ ایس پی نے شیطانی منصوبہ بنا رکھا تھا۔" جمال نے تلخی سے کہا۔ "اگر اسے علم ہوتا تو وہ مجھے بھولے سے بھی جانے نہیں دیتا۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو... اب ایک تو تمہیں نمٹنا ہے غزالہ اور اس کے باپ سے... اس کے بعد چاچا حکیم جی سے... غزالہ اور اس کے باپ کی ایسی تیسی تم کر سکتے ہو ان تصویروں سے... غزالہ سے فون پر بات کرو اور ان تصویروں کا حوالہ دو اور اسے ملنے کے لیے کسی ہوٹل کا کمرا بک کر کے بلاؤ... پھر اس کے جو فعل اور حرکت کرنا اور ماضی میں کرتے رہے ہو کرو۔ اس کمینی کی کیا مجال کہ انکار کر دے۔"

"تصویریں...." جمال نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر رونی سی چھا گئی۔

"ہاں... پانچ لاکھ کا جوتا مارنا چاہتے تھے نا تم؟ وہ تصویریں نہ صرف جذباتی بلکہ ہیجانی... سیلفی ہیں نیم عریاں حالت کی۔ وہ تمہاری گود میں بیٹھ کر تم چوم رہی ہو... وہ کوئی اداکارہ نہیں ہے ایک ایس پی کی بیٹی ہے۔ بڑی آسانی سے تمہیں پانچ لاکھ کی رقم مل جائے گی۔ اگر یہ تصویریں کسی فلمی کی ہوتیں تو تمہیں پانچ روپے بھی نہیں ملتے بلکہ پانچ جوتے کھانے پڑتے...."

"میں جانتا ہوں کہ وہ کمینہ... فرعون... حرامی جو اپنے دفتر میں بے گناہ لڑکیوں سے کھیلتا ہے۔ وہ مجھے کسی اور کیس میں پھنسا دے گا۔"

"بادشاہ...! تم یہ بات بھول رہے ہو کہ وہ کالی بھیڑ ہے۔"

"مانے گا کیسے نہیں... اس کا باپ بھی مانے گا... کہنا کہ اچھا میں غزالہ سے سودا کرتا ہوں۔ تمہاری

ملازمت تمہارے کرکٹ کے کیریئر اور تمہاری عزت کی قیمت کیا پانچ لاکھ بھی نہیں تھی؟ تمہاری جگہ میں ہوتا پچاس لاکھ مانگتا اور پچیس لاکھ لازمی وصول کر لیتا، مال حرام سے خزانے بھرے ہوئے ہیں اس کے... جتنا لوٹ سکتے ہو لوٹو... دشمن سے رعایت کیسی؟ تباہ کر دو۔ تباہ کر دو، غارت کر دو، تہس نہس اور تاخت و تاراج کر دو اسے... جیسے اس نے تمہیں تباہ کیا تھا۔ وہ تصویریں جعلی نہیں ہیں... ایک ٹرمپ کارڈ ہے تمہارے پاس...

"بادشاہ سلامت ٹھیک فرماتے ہیں۔" جمال نے اپنا سر کھجاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا کہ میں غزالہ کو بلا کر اس کے ساتھ جو فعل اور حرکت کروں وہ اف نہیں کرے گی۔ میرے اشاروں پر کٹھ پتلی بن جائے گی۔"

"یہ تمہی اور گلنار کیوں پھنسی ہوئی ہیں؟ اس لیے کہ میرے ہاتھ میں ٹرمپ کارڈ ہے... میں تمہیں ان کے بارے میں ایک ایسی بات بتاؤں پردہ اٹھاؤں اور ایک راز بتاؤں کہ تم بھونچکے ہو جاؤ گے۔ دولت مند اور اعلیٰ لوگوں کا ایک کلب ہے جس کے ممبر صرف تیس ہیں۔ اس کلب کا ہر شخص ممبر نہیں بن سکتا۔ اس کی پہلی شرط ہے کہ وہ بے انتہا دولت مند ہو... یہ سیکس کلب کہلاتا ہے... اس میں ساٹھ سے اسی برس کی دس بوڑھی عورتیں، پانچ جواں سال شادی شدہ عورتیں اور پانچ نوجوان دوشیزائیں جو اب دوشیزائیں نہیں رہی تھیں۔ دس مرد ممبر ہیں... ان کا اجلاس ہر دو مہینے میں ایک بار کے ڈی اے اسکیم نمبر کی ایک کوٹھی جو کچھ ہزار رقبہ پر بنی ہوئی ہے اس میں ہوتا ہے۔ اجلاس کیا ہوتا ہے جسمانی تسکین ہوتی ہے۔ اگر بوڑھی عورت کسی جوان کو، کوئی بوڑھا مرد کسی نوجوان لڑکی کو آغوش میں لینا چاہے تو انکار کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ سبھی بے لباس جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک بہت بڑے ہال میں سبھی باہم پیوست ہوتے ہیں۔ من مانیاں کرتے ہیں۔ ہر فعل اور حرکت کی عام اجازت ہوتی ہے۔ سبھی حیوانوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔"

"کیا...؟" جمال بھونچکا سا ہو گیا۔ "ان بوڑھی عورتوں کو کس لیے ممبر بنا گیا؟ وہ تو سرد اور بے کشش ہوتی ہوں گی۔"

"یہ بوڑھی عورتیں بڑی پرکشش ہوتی ہیں۔ یہ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو پھانس کر اپنے جسم پر ایسے لوشنز کی مالش کرواتی ہیں کہ ان کا جسم ستار کے تاروں کی طرح کسا کسا اور روغنی ہوتا ہے۔ تناسب کسی بھی نوجوان لڑکی کی طرح ہوتے ہیں۔ چہرے، ہونٹ اور بانہیں اور نشیب و فراز اور انگ انگ میں بجلی بھری ہوتی ہے۔ نوجوان اور جواں مرد انہیں لڑکیوں اور جواں سال عورتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ مرد کی خوش کرنے کا فن جانتی ہیں۔ جو ایک مرد ان سے ہم آغوش ہو جاتا ہے پھر وہ کسی لڑکی جوان عورت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا... تم کیا سمجھتے ہو ہمارے ملک کو... ایسے کلب اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں ہیں۔ میں تمہیں کسی دن لیے چلوں گا۔ اس دن کے آنے میں کچھ دن باقی ہیں۔ وہاں تم اجتماعی طور پر بے لباس ہونے میں شرماؤ گے تو نہیں...؟"

"جب عورتیں، لڑکیاں اور بوڑھیاں نہیں شرماتی ہیں تو میں کیوں شرماؤں گا۔"

"ویری گڈ... میں تمہیں وہاں لے جا کر دبئی کے بزنس مین کی حیثیت سے متعارف کراؤں گا۔ کیوں کہ کروڑ پتی ہونا اولین شرط ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" جمال نے سر ہلایا۔ "پہلے میں چچا سے مل آؤں تاکہ لکھ پتی تو بن جاؤں۔"

"ضرور ملو... بلکہ پہلی فرصت میں ہر قیمت پر ملنا چاہیے۔ لیکن ایک بات یاد رکھو۔ وہ بھی تمہارا دشمن ہے اور اس کے خلاف ٹرمپ کارڈ ہے رانی عرف کالی بھینس... پہلے غزالہ والی بازی کھیلو۔ کیوں کہ ہم ساری عمر بلیک میلر نہیں رہیں گے۔ میں نے بہت کچھ جمع کر لیا ہے۔ جب تمہارے پاس بھی پچیس تیس لاکھ ہو جائے گا تو ہم مل کے بزنس کریں گے کنسٹرکشن کا یا امپورٹ ایکسپورٹ کا... چند برسوں

کے بعد ہم اسٹاک ایکس چینج کے ممبر نہ ہوں تو میرا نام بدل دینا۔ بادشاہ کے معنی ہیں مالک سلطنت.... اور یہ جتنے سیٹھ ساہو کار صنعت کار اور مال دار تمہیں آس پاس نظر آتے ہیں نا... یہ کیسے کامیاب ہوئے۔ اگر سچ معلوم کرنے کا طریقہ ہوتا تو تمہیں پتا چل جاتا کہ کبھی یہ بھی ہماری طرح ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ شرافت اور ایمان داری کی سیڑھی پر قدم قدم بڑھتے ہوئے اتنے اوپر نہیں پہنچے۔ ایک وقت تھا جب مواقع تھے تو بہت سے محنت کر کے کامیاب ہوئے۔ آج ان کی مثالیں دینا عبث ہے۔ ایک دن ہم انہی جیسے ہوں گے۔ اور ہم جدھر جائیں گے لوگ ہمیں جھک جھک کے سلام کریں گے۔ ایس پی ڈی پی تو ہماری جیب میں ہوں گے۔ ہماری سیکورٹی پر مامور ہوں گے۔ راستہ تو ایک ہی ہے بیٹے...! آگے تمہاری ہمت اور ذہانت کہ تم اس پر کہاں تک جاتے ہو۔ تجارت کی منزل تک‘ نعمت و حرفت کی منزل تک یا سیاست میں بام عروج تک.... میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم ایک دن سلیکٹر بھی بن سکتے ہو اور انہی کی جگہ لے سکتے ہو جنہوں نے تمہیں کرکٹ سے باہر کیا تھا... فین لڑکیاں عورتیں تمہیں ہر طرح سے خوش کریں گی اور اس طرح ٹی وی‘ شوبزنس کی ماڈل گرلز اور اداکارائیں۔ وہ تمہاری کس بات سے انکار نہیں کریں گی۔ کیوں کہ یہ طوائفیں ہوتی ہیں۔ ان کی مثال کتیاؤں کی سی....“

”میں سب سے بدلہ لوں گا... انتقام میں کسی لڑکی عورت کو ہر طرح سے پامال اور تاخت و تاراج کروں گا۔“

بادشاہ نے اس کا کندھا بڑے پیار سے تھپ تھپایا اور پھر بولا تو اس کے لہجے میں بدمزگی تھی۔

”یار! یہ لفظ استعمال مت کیا کرو یہ کہو کہ میں انصاف حاصل کروں گا.... اپنا حق ہر قیمت پر لوں گا۔“

جمال کے دماغ میں کنفیوژن تھا۔ بادشاہ کی باتیں اس کی سمجھ میں بھی آ رہی تھیں اور نہیں بھی.... اس کی نظریں ان چاروں لڑکیوں کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے تھے جن سے وہ مل چکا تھا... سمی اور شیریں....

ہنی اور گل.... انہیں جھنجھوڑ چکا تھا۔ بادشاہ نے بتایا تھا کہ ہنی اور گل سیکس پارٹی میں آتی ہیں۔ وہاں جو عورتیں اور مرد باہم پیوست ہوتے ہیں وہ کسی کمرے میں نہیں بلکہ اس ہال میں۔ یہ جیسے انسان نہیں حیوان ہوں.... اس کے پاس غزالہ کی تصویریں بھی تھیں۔ یہ جو سیلفی کی وبا کسی لعنت کے طور پر پھیلی ہوئی تھی اس نے لڑکیوں عورتوں کو بگاڑ دیا اور بگاڑ رہی تھی۔ بادشاہ کے پاس جو موبائل تھا اس میں پانچ سات لڑکیوں کی سیلفی تھیں جو انہوں نے ہر زاویے اور رخ سے اپنے جسمانی نشیب و فراز‘ تناسب اور ہر گوشے کی بنائی ہوئی تھیں۔ بادشاہ نے اپنے ٹی وی پر یہ تصویر دکھائی تھیں۔ تیس انچ کے ٹی وی کی اسکرین پر ان کے کلوز اپ اس نے حیرانی سے دیکھا تھا۔ یہ فطری حالت کا سیلفی بنانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا... غزالہ کی بھی چند ایک تصویریں سیلفی تھیں جن میں وہ بے لباس تھی اور ہر زاویے سے پوز دیے تھے۔ اس نے سیلفی کی تصویریں ایک غیر معروف علاقے کی دکان سے بنا دیے تھے۔ اس روز غزالہ اپنا موبائل بھول گئی تھی۔ غزالہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس کی ہم آغوشی‘ رومانی مناظر اور بے لباس کی سیلفی اس نے بنا کر رکھ لی ہیں۔ اگر وہ اسے بتاتا تو وہ یہ تصویریں لے جاتی۔ وہ راتوں کو ان تصویروں سے حظ اٹھاتا تھا بادشاہ کے نزدیک یہ سب ٹرمپ کارڈ تھے۔ نہ جانے کتنی بازیاں بادشاہ جیت چکا تھا اور جیتتا رہتا تھا اور وہ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ اس کی ہر بات ماننے پر مجبور تھیں۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں ٹرمپ کارڈ ہوتے تھے۔ اب جمال بھی اس کے ساتھ شامل ہو کر جیسے اس کا وزیر اعظم بن گیا۔ بادشاہ نے اس کے ہاتھ میں ٹرمپ کارڈ تھما دیے تھے کہ تم ان سے ہر بازی جیت سکتے ہو اور امور سلطنت چلا سکتے ہو.... محبت کی بازی.... عزت کی بازی.... قصوروار غزالہ نہیں تھی.... قصوروار کوئی لڑکی نہیں تھی جس نے محبت کے نام پر ٹرمپ کارڈ محبت کرنے والوں کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔ اب وہ انہیں کیش کرا رہے

عزت دار بننے کے لیے... کامیابی کی منزلیں سر کرنے کے لیے.... ایک لڑکی جب اپنی ماں سے کہتی کہ میں ماڈل‘ ٹی وی اداکارہ‘ اینکر‘ کمرشل میں آنے کے لیے قسمت آزمائی کرنے جا رہی ہوں تو ماں پہلے تو اسے بے لباسی کی حالت میں ناقدانہ نظروں سے دیکھتی اور کہتی کہ کامیابی اسی وقت تمہارے قدم چومے گی جب تم متعلقہ مردوں کو چومنے دو گی۔ ان کی ہر بات مانو گی اور کسی بات سے انکار نہیں کرو گی۔ کیوں کہ اس لائن میں منزل اور کیش جبھی ملتا ہے جب خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دو.... منزل کہاں ہے تیری اے لالہ صحرائی؟ مردوں کے بستر کی زینت بننے پر.... تجارت‘ صنعت یا سیاست‘ وزارت اور صدارت.... مایا تیرے کتنے نام؟ وہ خاموشی سے اٹھا اور بادشاہ کو حیران چھوڑ کے باہر نکل گیا۔ سڑک پر آنے والی خالی ٹیکسی اس کے اشارے پر رک گئی۔ وہ بے خیالی میں بیٹھ گیا۔ اندر مہک تھی اور سوندھی سوندھی خوشبو جیسے وہ کسی زنانہ سواری کو اتار کے آیا ہو۔

”کہاں جانا ہے سر...!“ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت وہ جو تصور میں سیکس پارٹی دیکھ رہا تھا اک دم سے چونکا اور جواب دیا۔

”بھائی میرے... مجھے جانا ہے شفاخانہ نجابت.... جلدی سے چل پڑو۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے غور سے اس طرح دیکھا جیسے وہ نشہ میں نہ ہو۔ ”یہ کہاں ہے؟“

جمال نے اسے پتا سمجھا دیا اور پھر غیر حاضر ہو گیا۔ اس کے ذہن میں چلنے والی باد سموم تھم گئی تھی۔ اب محض سناٹا تھا اور خاموشی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں سے گھٹا اٹھی ہے۔ اچانک فضا میں نمی اور خنکی آگئی ہے۔ یہ اس زمین کے سینے سے اٹھتی خوشبو نہ جانے کدھر سے آ رہی تھی۔ لڑکیوں عورتوں سراپا سے خوشبو پھوٹتی تھی تو وہ سوچتا تھا کہ کدھر سے آ رہی ہے۔ کس گوشے سے.... ہرے بھرے کرکٹ گراؤنڈ پر سفید بے داغ وردیاں پہنے کرکٹ کے کھلاڑی کیسے لگتے ہیں جیسے گدلے پانی کے تالاب پر اڑنے والے بگلے۔ ہاؤ از دیٹ جمال؟ از دس کرکٹ؟ کیا یہ کرکٹ ہے؟ کرکٹ کا مطلب ہوتا ہے فیئر پلے... ڈسپلن‘ ایمان داری‘ ٹرسٹ اور ٹیم اسپرٹ.... یہ تو ایک اصطلاح ہو گئی تھی۔ جب کوئی احتجاج کرتا تھا کہ یہ غلط ہے۔ ناجائز ہے۔ ناانصافی پر مبنی ہے۔ وہ کہتا تھا دس از ناٹ کرکٹ... تم بھی کرکٹر تھے جمال! بتاؤ یہ کیا کرکٹ ہے؟ کیا یہ ٹھیک ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرنے جا رہے ہو؟ غزالہ... اس کی فین لڑکیاں عورتیں... جب وہ غلاظت کے دلدل میں ان کے ساتھ بھٹک جاتا تو وہ کہتی تھیں۔

”جمال....! یہ تم فاؤل کیوں کرتے ہو؟ ہم عورتیں ہیں۔“

”کرکٹ کے علاوہ کھیل میں فاؤل ہوتا ہے۔ ہاکی‘ فٹ بال اور کئی کھیل ہیں۔ چوں کہ یہ بھی ایک محبت کا کھیل ہے۔ اگر اس میں فاؤل ہو جاتا ہے تو فطری سمجھو....“

ٹیکسی ڈرائیور نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ ”کیا سو گئے سر...؟“

جمال پھر چونکا ”نہیں۔“ وہ ایک جماہی لے کر بولا ”نہیں بس ٹھیک ہے۔ شکریہ دوست! باقی رکھو۔“

وہ ٹیکسی سے اتر کے شفاخانے کی طرف بڑھا۔ اسے چچا نجابت علی کے معمول کا علم تھا۔ وہ دوپہر کے دو بجے سے چار بجے تک شفاخانہ بند کر دیتے تھے۔ یہ ان کے قیلولہ کا وقت ہوتا تھا۔ چچا سو کر ہی اٹھے ہوں گے۔ اب وہ منہ دھوئیں گے۔ پھر ایک کپ چائے پئیں گے۔ سبز چائے الائچی والی۔ عین دروازے پر اس کے قدم رک گئے۔ بند دروازے پر کاغذ چپکا کے جلی حروف میں لکھا گیا تھا۔

”بوجہ انتقال پر ملال حکیم حاذق نجابت علی خان‘ شفاخانہ بدھ مورخہ سات ربیع الثانی ۱۵ بمطابق چودہ ستمبر 1996ء بند رہے گا۔“

وہ بہت دیر تک اس مضمون کو یوں دیکھتا اور پڑھتا رہا جیسے اس عبارت کا اصل مفہوم کچھ اور ہے جسے وہ

سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے پھر ایک رکشا ان کے قریب آ کے رکا اور کسی نے کہا "ابے لے حکیم صاحب بھی گزر گئے۔"

وہ چونکا اور اس نے رکشا سے اترنے والے کی طرف دیکھا مگر وہ رکشا میں بیٹھ چکا تھا۔ اس کی برقع پوش بیوی حکیم صاحب کی مریض تھی۔

"اب کیا ہوگا جی۔۔۔" عورت کی آواز میں بڑی فکر مندی تھی اور اس کا گورا مکھڑا زرد سا پڑ گیا تھا۔

"مری کیوں جاتی ہے شہر میں اور حکیم نہیں ہیں کیا ؟" اس کے شوہر نے کہا۔ "چل یار! ذرا پیر کالونی۔" اس نے رکشا والے کو پتا سمجھانا شروع کیا۔ ہاتف نے صدا دی۔

دائم رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔

آہستہ آہستہ جمال بھی بوجھل قدموں کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ حکیم نجابت علی خان کا سوئم جمعرات کو ہو چکا تھا۔ پھر جمعہ بھی گزر گیا تھا اور ہفتہ بھی گزر گیا تھا اور اس طرح ہفتے مہینے اور برس بھی گزر جاتے ہیں۔ آج اتوار تھا مگر تین دن کے لیے سوگ میں بند کیا جانے مطلب ہنوز بند تھا۔ اس کی ہلکی سی دستک پر دروازہ خود رانی نے کھولا۔ وہ اسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر یقین نہ آیا۔ وہ گنگ سا ہو گیا۔ رانی کو دیکھ کر اسے اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں اس نے کسی اور گھر کے دروازے پر خود دستک نہیں دے دی ؟ یہ کوئی اور لڑکی ہو۔۔۔ نہیں یہ رانی ہی تھی۔ لوہے کی بالٹی پر جیسے قلعی کر دی گئی ہو۔ وہ اب موٹی بھینس نہ تھی۔ اس کے جسم پر چربی بالکل نہ رہی۔ وہ متناسب اور چھریرے بدن کی اور اتنی سڈول ہو گئی تھی اس کے نشیب و فراز میں ایک عجیب سی دل کشی اور کشش بول رہی تھی۔ شادابیاں اور رعنائیاں دل موہ لے رہی تھیں۔ اس کی رنگت اب سیاہ نہیں تھی بلکہ نکھری نکھری گندمی ہو گئی تھی۔ ایک ایسا نکھار اور دل آویزی رخساروں پر پھوٹ رہی تھی اگر تنہائی ہوتی تو وہ اسے آغوش میں لے کر بے تحاشا چومنے لگتا۔۔۔ اس کے ہونٹ بھی شہد آگیں اسے دعوت دے رہی تھے۔ دوپٹا جو سینے سے ہٹ گیا تھا گریبان میں بڑا ہیجان خیز نظارہ تھا۔ لمحے بھر کے لیے ان کی آنکھیں پیوست ہو گئیں۔ رانی کا سینہ دھڑک اٹھا۔ یہ اس کا جمال اور منگیتر تھا۔ اسے خواب ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہر رات جب وہ بستر پر دراز ہوتی تھی اپنے آپ کو اس کی آغوش میں محسوس کرتی اور تصور میں ان جانے راستے پر چلی جاتی تھی۔

اندر سے اس کی ماں نے چلا کر پوچھا۔ "رانی بیٹی۔۔۔ !کون ہے؟"

رانی اسے جن نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کی تاب نہ لانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ رانی ماں کی آواز سنتے ہی چونکی ' اس کا شاخ گل جیسا بدن کسمسایا۔ اس نے فوراً ہی دوپٹا شانے اور سینے پر درست کیا تاکہ گریبان کا نظارہ چھپ جائے۔

رانی نے بڑی اپنائیت اور پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"آیئے۔۔۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔"

وقت کی نبض جو رک گئی تھی وہ پھر حرکت کرنے لگی۔ وہ سر جھکائے اندر داخل ہوا تو رانی جو دروازہ بند کرنے کے لیے پاس سے گزری تو اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو جو کنواری لڑکیوں میں عورت بننے سے پہلے ہوتی تھی اس نے جمال کو بہکا دیا تھا۔ وہ آشنا تھا۔ رانی کی صورت بڑی موہنی اور پیاری سی ہو گئی تھی۔ اگر وہ پہلے ایسی ہوتی تو اس سے شادی کر چکا ہوتا۔ اس کے حسن و ملال میں بھی اداسی کا وہی حسن تھا جو دیکھنے والوں کو پندرہویں یا سولہویں شب کے طلوع ہونے چاند کی روشنی میں نظر آتا ہے۔

جواب نہ پا کر ماں نے پھر تیز آواز میں پوچھا۔ "اری بولتی کیوں نہیں؟ کیا گونگی ہو گئی ہے؟"

"امی! جمال آئے ہیں۔" اس نے اندر جا کے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"اور تو نے اسے اندر بھی آنے دیا۔" اس کی ماں ہذیانی لہجے میں چلانے لگی۔ "اور تو نے اس کمینے کو دھتکار کیوں نہیں دیا؟ اب وہ کیا لینے ہمارے پاس آ

ہے؟"

"امی۔۔۔!" رانی نے اسے ڈانٹا۔ "یہ خاندانی لوگوں کا وطیرہ نہیں ہے۔ کیا اس طرح بات کی جاتی ہے اپنوں سے۔۔۔ وہ تعزیت کے لیے آئے ہوں گے۔"

"نہیں ہے وہ ہمارا۔۔۔ کہہ دے اسے صاف صاف۔" ماں کے لہجے میں نفرت اور غصہ بڑھ گیا۔

"وہ تایا شرافت علی خان کا بیٹا ہے۔۔۔ اور آپ کا بھتیجا بھی ہے۔ آپ کے سوا کون ہے اس کا بڑا۔۔۔" وہ آہستہ آہستہ ماں کو سمجھا رہی تھی۔ کوشش کر رہی تھی کہ آواز جمال تک نہ پہنچے۔ "ابا جان نے آخری لمحات میں کیا کہا تھا؟"

"اچھا۔۔۔ اچھا تو چل۔۔۔ میں آتی ہوں۔" چچی کی آواز آئی "اس سے کچھ نہ کہنا۔"

جمال اپنی جگہ کھڑا سب سن رہا تھا۔ چچی کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اسے اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا رانی کی ہر بات اسے شرمسار کیے دے رہی تھی۔ وہ خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ چچا نجابت نے آخری وقت میں کیا کہا تھا؟

"رانی پھر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی آئی تو اس کے بدن کی حشر سامانیاں واضح ہونے لگی تھیں جو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"بہت دن بعد آئے ہیں آپ۔۔۔ کہیں چلے گئے تھے کیا آپ؟" لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔

"میں۔۔۔ ہاں۔" جمال کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ "کیا ہوا تھا چچا جان کو۔۔۔"

"بس ایسے ہی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ دل کے مریض تو تھے۔ دواخانے سے گھر آئے۔ رات بڑی مشکل سے گزری۔۔۔ صبح اذان کی آواز کے ساتھ۔" وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے ابھی ابھی باپ کی وفات ہوئی ہو۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے۔ اس کے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

"رانی! حوصلہ رکھو۔"

پھر جمال نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر آنسو صاف کرنے لگا۔

وہ خاموش ہو گئی تو جمال اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اسے عجیب سی بے چینی اور وحشت ہو رہی تھی۔ اسے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

"چچا نے کیا کہا تھا رانی! کیا بتانا پسند کرو گی؟"

رانی نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔ لمبے، گھنے، ریشمی اور سیاہ بالوں کو ایک ادا سے پیچھے کیا اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔

"انہوں نے کہا تھا کہ جمال کو اس کا حق دے دینا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میری بخشش کر دے۔ آخری وقت کی توبہ قبول تو نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوں۔ مایوسی کفر ہے۔ وہ درگزر کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ بس میں دنیا کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑی کمینگی کا سلوک کیا۔ وہ تو بچہ تھا۔ بھائی جان شرافت علی خان نے اسے میرے حوالے کیا تھا۔"

رانی اتنا کہنے کے بعد سانس لینے رکی۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا تھا۔

"تمہیں مجھ سے کوئی گلہ نہیں رانی۔۔۔!" وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر بولا۔

اس نے جمال کی نگاہیں چہرے پر مرکوز دیکھ کر سر جھکا لیا۔

"تقدیر سے گلہ کرنے سے کیا ہوتا ہے جمال! آدمی اپنا نصیب تو بدل نہیں سکتا۔ یہ بتائیں آپ کا چیک کیش ہو گیا تھا؟"

جمال چونکا۔ اس وقت وہ خالی الذہن تھا "کون سا چیک رانی؟"

"جو ابا جان نے دیا تھا۔" رانی نے جواب دیا۔ "جو پانچ لاکھ کا تھا؟"

جمال کا چہرہ لال ہو گیا جیسے رانی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

"کیا وہ چیک چچا جان نے کینسل نہیں کیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔" رانی نے شانے اور سینے سے پھسلتا ہوا دوپٹا درست کیا۔

"مگر... انہوں نے تو مجھ سے کہا تھا۔" جمال بولا۔

"ہاں... وہ بعد میں شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ... بیٹا! رانی! اگر کوئی مجھ سے کچھ مانگنے آئے سوالی بن کے اور میں اسے کچھ دے دوں... کیا مجھے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے؟ میں نے صاف کہا کہ ہرگز نہیں، لیکن بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا تھا کہ جمال آیا تھا۔ آج کل اس کا ہاتھ بہت تنگ ہے اور پریشان پھرتا ہے۔ میں نے اسے پانچ لاکھ کا چیک تو دے دیا۔ مگر ساتھ ہی شرط رکھ دی اور کہہ دیا کہ صبح چیک کینسل ہو جائے گا۔ میں نے کہا۔ ابا جان! آپ لو لوگ کو غلط مشورہ دیتے ہیں۔ ان کی مانتے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج آپ کے اپنے بھی اپنے نہیں رہے۔ تایا جان سے کیے ہوئے وعدے کا بھی پاس نہیں رہا۔ آپ کے دل میں۔ بس اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ صبح خود انہوں نے بینک فون کیا تھا۔ منیجر کو کہ آپ کو پریشان نہ کرے اور بڑی آسانی سے اتنی بڑی رقم کا چیک آسانی سے کیش ہو جائے۔ کیوں کہ اتنی بڑی رقم کا چیک آسانی سے کیش نہیں ہوتا ہے۔"

"میں... میں نے رات ہی وہ چیک پھاڑ دیا تھا۔" جمال نے اسے بتایا۔

رانی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ دوپٹے کو اپنی ایک انگلی پر لپیٹتی اور کھولتی رہی۔

چچی اندر آئیں تو جمال کھڑا ہو گیا۔ چچی نے اس سے گلے مل کر رونا شروع کیا تو ضبط کی کوشش کے باوجود جمال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب آیا ہے بد بخت... اتنا رلانے کے بعد... تیرے چچا کو آخری وقت تک آس رہی کہ تو آئے گا... تو وعدہ کر کے گیا تھا ان سے... وہ کہتے تھے کہ جمال جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا۔ آخر بھتیجا ہے میرا۔"

"امی...!" رانی نے تنبیہہ کی۔ "آپ کیا گلے شکوے لے کر بیٹھ گئیں۔"

"اچھا بیٹا! کیا فائدہ پرانی باتوں سے..." چچی نے دوپٹے میں آنسوؤں کو جذب کیا۔

"میں کہیں چلا گیا تھا چچی جان! اس لیے نہیں آ سکا تھا۔" اس نے ندامت سے کہا۔

"ابا جان کے وعدے کا آپ پر کوئی قرض نہیں ہے... آپ آزاد ہیں مسٹر جمال احمد!" رانی نے جاتے جاتے کہا۔

چچی نے پھر رونا شروع کیا۔ پھر رونے پر قابو پا کر کہنے لگیں۔

"انہوں نے کہا تھا۔ جمال کو سب کچھ دے دینا جو اس کا ہے۔ میں بڑے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا اس جہاں میں جا کے۔ وہ پوچھیں گے کہ میں نے تو جمال کو تمہارے سپرد کیا تھا۔ تم نے کیا غیروں والا سلوک کیا اس کے ساتھ۔"

"پرانی باتوں کو بھول جائیں چچی!" جمال نے کہا۔ "میں تو محبت کے جذبے کے تحت چلا آیا ہوں۔"

"کل میں وکیل سے کہہ دوں گی کہ مقدمہ واپس لے لیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے ہمارے رہنے کو یہ جگہ بہت ہے۔ حویلی لے کر ہم کیا کریں گے اور اب شفاخانہ کون چلائے گا۔" ان کی آواز میں سارے جہاں کا دکھ بھر گیا۔

"چچی! آپ فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔ میں چلاؤں گا۔" جمال نے بے اختیار کہہ دیا۔

"تم...؟ کاش! تم نے حکمت سیکھی ہوتی؟" چچی نے آہ بھری۔ "اب تو در صدری نسخے تمہارے والد اور تمہارے چچا کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔"

"میں اسے اسپتال بناؤں گا ان کے نام پر۔" جمال نے جواب دیا۔

"تم کوئی ڈاکٹر ہو جو اسپتال چلاؤ گے؟" چچی نے طنز سے کہا۔

"میں ڈاکٹر رکھوں گا۔ صرف خود انتظام چلاؤں گا۔ ہر چھوٹے بڑے کلینک اور اسپتالوں میں تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور ہو گی۔ حویلی بک جائے گی۔ میں چالیس لاکھ میں، آج کل زمین اور عمارتوں کے دام آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس رقم سے پرانے شفاخانے کی جگہ

عمارت بن جائے۔ عمارت ہو تو ڈاکٹر خود آ جاتے ہیں اور وہ پریکٹس کرتے ہیں تو کمیشن ہمیں ملے گا۔ کمروں کے باہر ان کے نام کی تختی لگ جاتی ہے تو مریض بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ہر مرض کے فزیشن اور سرجن بھی ہوں گے۔ ہم تو مالک ہوں گے چچی!"

"نا بیٹا... نا! میں کہو... ہم نہیں۔" چچی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا... میں اور... رانی... میں بہت بد بخت ہوں اور نافرمان... میں نے بہت دکھ دیے ہیں آپ کو... ابا جان اور چچا مرحوم کو مگر بچے نادان ہوتے ہیں۔ غلطیاں کرتے ہیں اور بڑے تو بڑے ہی ہوتے ہیں۔ بڑا ظرف رکھتے ہیں۔ مجھے انکار مت کیجیے گا۔"

"ارے باؤلا ہوا ہے لڑکے! میں کیا زبان دے کے انکار کر سکتی ہوں۔ بھلا ایسا ہوا بھی ہے خاندانی لوگوں میں... تو نہ آتا تو وہ ساری عمر بیٹھی رہتی۔ ٹھیکرے کی منگنی بھلا توڑی جا سکتی ہے۔"

رانی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی۔ اس میں گرم گرم پکوڑے اور چٹنی بھی تھی۔

"اماں! آپ وہ فائل تو لے آئیں... حویلی اور شفاخانے کی۔"

"فائل... ہاں۔" چچی نے کہا۔ "جمال کو دے دوں... اب وہ اس کی ملکیت ہیں۔"

رانی نے عمداً "ماں کو باہر بھیجا تھا ورنہ فائل وہ خود بھی لا سکتی تھی ماں کے باہر جاتے ہی وہ بولی۔

"جمال صاحب! امی کی باتوں کو چھوڑیے... یہ پرانے وقتوں کے لوگ تھے۔ چچا بھی، تایا بھی مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"تم سے پوچھا کس نے ہے ابھی؟ کنواری لڑکیاں گونگی ہوتی ہیں۔"

"میں آپ کو بتا رہی ہوں پہلے سے... تاکہ کسی خود فریبی کا شکار نہ رہیں۔"

"جو پہلے سے طے ہے وہ طے ہے کہتے ہیں دیر آید درست آید تم سمجھ لو کہ میں صبح کا بھولا ہوں اور شام کو گھر لوٹ آیا ہے۔"

رانی نے کمزور لہجے میں کہا۔ "میں انکار کر دوں گی۔ میں اب نئی رانی ہوں۔"

"کر دینا... میں اٹھا کے لے جاؤں گا۔ اپنی چیز کوئی زبردستی لے جائے تو مجرم نہیں ہوتا۔"

پھر اس نے رانی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کے چہرے پر جھکنے لگا تو رانی ماں کے آ جانے کے ڈر سے کسمسانے لگی۔ کمزور سی مزاحمت تھی تو خود سپردگی بھی... اس نے اپنے ہونٹ رانی کے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ طویل بوسہ لینے کے بعد وہ اس کے رخساروں گردن اور گلے

چٹکلے

☆

معاشیات داں وہ شخص ہے جو جانتا ہے کہ تیراکی کا تالاب آہستہ آہستہ خالی ہو رہا ہے۔ جب آپ اس میں چھلانگ لگانے لگتے ہیں تو وہ بہت، بہت ہلکی آواز میں کہتا ہے۔

"ذرا دیکھ کر۔" جب حادثہ رونما ہو جاتا ہے تو وہ بہت، بہت اونچی آواز میں کہتا ہے۔

"میں نے پہلے بتا دیا تھا۔"

☆

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی پسنجر ٹرین جب چل پڑی تو ایک دیہاتی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور اسٹیشن ماسٹر سے کہنے لگا۔ "جناب مجھے اس گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اگر میں تیز بھاگوں تو کیا اسے پکڑ سکتا ہوں۔"

اسٹیشن ماسٹر اطمینان سے کہنے لگا۔ "اگر تیز بھاگو گے تو گاڑی سے پہلے اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہو۔"

کے نیچے جذباتی اور جنونی کیفیت سے چومنے لگا۔ پھر چچی کی آہٹ سنائی دی تو رانی بجلی کی سی سرعت سے تڑپ کر نکلی اور اپنے بال اور لباس کی شکنیں درست کیں اور دوپٹا جو فرش پر گر گیا تھا اسے اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کیا۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔

"اچھا... اب میں چلتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اجازت ہے؟"

"ارے کہاں چلا..." چچی فائلیں اٹھائے اندر آئیں۔ "ارے یہ فائلیں لے جا اور کھانا کھائے بغیر جائے گا کیا؟"

"فائلیں اپنے پاس رکھیں چچی! یہاں ہیں تب بھی میرے پاس ہی ہیں... رانی کی طرح۔"

اس نے رانی کی طرف دیکھا اور آداب کر کے باہر نکل گیا۔ اس نے وہ مسکراہٹ دیکھی ہی نہیں جس نے رانی کے ماضی سے اس کے مستقبل تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو روشن کر دیا تھا۔ اس کی زندگی میں غزالہ، جتنی فین لڑکیاں عورتیں آئی تھیں آج اب وہ سب رانی کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں۔ اسے ایک دکھ، افسوس اور صدمہ اس بات سے ہو رہا تھا کہ کاش! وہ اس قدر سیاہ کار، بدکار اور آلودہ نہ ہوا ہوتا۔ لیکن اس نے سوچا کہ سارا قصور اس کا نہیں بلکہ غزالہ اور فین لڑکیوں عورتوں کا ہے جنہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنا سب کچھ عشق کے کھیل میں سونپ دیا تھا۔ کھیل میں فاؤل ہوتا ہے لیکن انہوں نے کبھی اس فاؤل پر احتجاج نہیں کیا تھا۔

جمال سڑک پر آیا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب رانی، بوسیدہ اور ایسی گھناؤنی دنیا سے نکل آیا ہے جو ایک گلی سڑی لاش کی مانند تھی جس میں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ اسے گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں... اب وہ ایک ایسی نئی دنیا میں آ گیا جہاں ہر سمت افق تا افق قوس قزح بکھری ہوئی ہے۔ وہ ایک عجیب سی سرشاری اور فرحت محسوس کر رہا تھا جس سے قلب کو طمانیت محسوس ہو رہی تھی جو اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے ہونٹ رانی کے ہونٹوں کی مٹھاس سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے جو رانی کی گردن، چہرے اور گلے سے نیچے جو بے تحاشا چوما تھا ان کا لمس ایسا انوکھا اور لطیف تھا جو اس کی نس نس میں امرت بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس نے جو غزالہ اور لڑکیوں عورتوں کے جسموں کا لمس نشاط انگیز لمحات میں محسوس کیا تھا ان میں ایسا کیف و سرور نہ تھا۔ اگر چچی گھر پر نہیں ہوتیں تو وہ ان جانے راستے پر چل پڑتا... پھر اس نے سوچا نہیں وہ رانی کو تنہائی میں داغ دار نہیں کرے گا۔ اس سے شادی کرے گا۔ اب ایک نئی زندگی شروع کرے گا... کاش! وہ کرکٹر نہ ہوتا اور نہ اسے شہرت ملتی اور نہ ہی وہ بدکار بن جاتا... اوپر والا تو بڑا رحیم کریم اور در گزر کرنے والا ہے۔ وہ ہر روز تہجد اور ہر نماز میں اپنے گناہوں پر نادم ہو کر گڑگڑا کے معافی مانگتا رہے گا۔

اس نے وہ لفافہ نکالا جس میں مطالبے کے ساتھ چند تصویریں تھیں۔ اس نے ایک ایک تصویر کے پرزے پرزے کر کے کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیے۔ وہ گھر پہنچا تو بادشاہ موجود نہیں تھا۔ اس نے سوٹ کیس میں سے غزالہ کی تصویریں اور کچھ خط نکالے اور انہیں کچن میں نذر آتش کر دیے۔ پھر اس نے سوٹ کیس باہر لے جا کر رکھا اور بادشاہ کا انتظار کرنے لگا۔

بادشاہ کسی طوفان کی طرح گاڑی دوڑاتا ہوا پورچ میں داخل ہوا اور اس نے وہیں سے چلانا شروع کیا "جمال!"

جمال نے باہر آ کر پوچھا۔ "کیا ہوا بادشاہ سلامت! ... ایک تیر سے دو شکار... یہی تصویریں ٹرمپ کارڈ بن جائیں گی... تم فاؤل کرو گے تو بھی وہ احتجاج نہیں کریں گی۔ ہر بات مانیں گی۔ سمجھ گئے نا... میرے یار!"

جمال نے چابی نکال کے ڈگی کھولی اور اپنا سوٹ کیس اس میں رکھ دیا۔ بادشاہ چند لمحوں کے بعد جمال کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کیمرا جمال کو پکڑا دیا۔ پھر اس نے جمال کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے بولا۔

"یار! سنا ہے کہ تمہارا وہ چاچا مر گیا۔ اصل کانٹا تو وہی تھا تمہاری راہ میں... مقدمہ اب کون لڑے گا؟ تمہاری منوبیہ تو کرنے سے رہی؟"

"ہاں... اب مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ وہ کورٹ کچہری میں دھکے کھانے سے رہی۔"

"مبارک ہو۔" بادشاہ نے گاڑی چلاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

تھوڑی دیر بعد جمال نے ریوالور نکال کر اسے دکھایا "کیا یہ اصلی ہے نا؟"

"ہاں۔" بادشاہ نے سر ہلایا "یار! میں تو بھول گیا تھا۔ اچھا کیا جو تم لے آئے؟ بادشاہ نے اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر جیب میں رکھا۔

"یار! یہ ایسا ٹرمپ کارڈ ہے جس سے میرا ہر داؤ کام کیا تمہارے خلاف بغاوت ہو گئی ہے؟" نہیں ہوئی تو ہو جائے گی... کیا یاد نہیں شیریں اور مہ ناز کو وقت دیا تھا ہم نے... ہمیں ان کے ساتھ جھیل پر جانا تھا۔"

"میں تیار ہوں۔" جمال نے کہا۔ "ہم وہاں سہاگ دن رات منائیں گے؟"

"بس میں ذرا کیمرا لے لوں۔" بادشاہ کو اچانک یاد آ گیا۔ "میرے پاس موبائل بھی ہے اس سے سیلفی بنائیں گے۔ شیریں اور تمہاری، مہ ناز کی ہم بستری کی حالت کی تصویریں اور فلم جو ٹی وی پر دیکھیں گے۔ یہ سمجھو کہ لاٹری نکل آئی۔ ہر مہینے لاکھوں کہیں نہیں گئے اور جب چاہے انہیں بلا لو وقت گزاری کے لیے اب رہا۔ لڑکیاں ہر بات مان جاتی ہیں اور میں نے اس سے ہر طرح کی تصویریں بنائیں۔ انہوں نے کبھی بھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ زیور اور رقم اور دوشیزگی بڑی فیاضی سے قربان کیا اور نوازتی رہیں اور ان سے ہر ماہ ہزاروں لاکھوں کما رہا ہوں۔ میری الماری میں لاکھوں کے سونے کے زیورات اور لاکھوں کی رقم رکھی ہوئی ہے۔ میں نے دو دشمنوں کو صفحہ ہستی سے ہٹایا۔ پولیس آج تک سراغ نہیں لگا سکی کہ ان کا قاتل کون ہے اور میرا بال تک بیکا نہیں ہوا۔

پھر اس نے تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک ویرانے میں روک لی۔ ایک ہزار گز کے بنگلے کے گیٹ کے سامنے۔

"یار! میں ٹرمپ کارڈ لے کر جا رہا ہوں۔ دس منٹ میں دس لاکھ اور شراب کی بوتل لے کر آ رہا ہوں۔ اس کے بستر میں اس کے ساتھ ہر مرتبہ جی بھر کے کھیلتا رہا ہوں۔ اس لیے کہ وہ ظالم ہے ہی ایسی... شراب کے بغیر ان لڑکیوں کے ساتھ لطف نہیں آئے گا۔ شباب اور شراب کے بغیر حسن بے کیف ہوتا ہے۔ اگر شیریں اور مہناز انتظار نہ کر رہی ہوتیں تو تمہیں سرفراز کرا دیتا۔"

بادشاہ گیٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ چھ سات منٹ

اندازفکر

دنیا کی محبت اندھیرا ہے اور اس کا چراغ تقویٰ ہے۔
گناہ اندھیرا ہے اس کا اجالا استغفار ہے۔
قبر اندھیرا ہے اس کا چراغ کلمہ شہادت ہے۔
آخرت اندھیرا ہے اور اس کا چراغ عمل صالح ہے۔
پل صراط اندھیرا ہے اور اس کا چراغ اللہ پر یقین کامل ہے۔

ہمارے ناشاد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس درجہ کا توکل کر لیتے ہیں جس درجہ کا ہمارا ایمان نہیں ہوتا۔

آنسو اس وقت قیمتی اور مقدس ہوتے ہیں جب دوسروں کے دکھ پر نکلیں۔

اللہ سے صلح رکھو تا کہ آخرت سلامت رہے۔
لوگوں سے صلح رکھو تا کہ دنیا برباد نہ ہو۔

سفر کا آغاز اگر تیزی سے کیا ہے تو دیکھو رکنا نہیں ورنہ تمہارا اپنا ہی غبار تمہیں گرد آلود کر دے گا۔

برے لوگ اچھی باتوں میں بھی برائی کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔

کے بعد تجسس اسے اندر لے گیا۔ کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بادشاہ کرسی پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔

ایک نوجوان حسین عورت ہاتھ میں لفافہ لیے جو فطری حالت میں کھڑی ہوئی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

"بادشاہ! تم دس مہینے سے مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔ تمہاری ہر حرکت، فعل اور بدمعاشی میں کتنی اذیت سے برداشت کرتی آ رہی ہوں یہ میرا دل جانتا ہے۔ میں اپنی دس تصویروں کے نیگیٹوز کے دس لاکھ دے رہی ہوں۔ لیکن تم یہ دس لاکھ نہیں لے جاسکو گے۔ کیوں کہ اب تم صرف دس منٹ کے مہمان ہو؟"

"کیا مطلب۔۔۔؟" بادشاہ بری طرح چونکا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔

"میں نے شراب میں زہر ملا دیا ہے۔ اس لیے کہ تم یہ دس لاکھ نہیں لے جاسکو گے؟"

اس عورت نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ بادشاہ نے جیب سے ریوالور نکال کے سینے پہ دل کی جگہ کا نشانہ بنایا۔ پے در پے فائر کیے۔ بادشاہ اور عورت کو موت نے گلے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

چند لمحوں کے بعد جمال باہر آیا پھر اس نے اپنا سوٹ کیس نکالا اور مین روڈ پر آکر ٹیکسی روکی۔

☼ ☼ ☼

چھ مہینے بعد وہ رانی کے ساتھ صدر کی ایک دکان سے نکل رہا تھا۔ ایک فیشن ایبل اور شوخ قسم کی لڑکی نے اس کا راستہ روک لیا۔

"بابر صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟ کہاں ہیں آخر آپ۔۔۔؟"

جمال نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "معاف کیجیے گا محترمہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام جمال احمد ہے! اور یہ ہیں میری شریک حیات رانی آفرین۔"

اس لڑکی نے حیرت سے سر ہلایا۔ "کمال ہے اتنی مشابہت بھی ہوتی ہے چہروں میں۔۔۔ آپ کے ایک بزنس پارٹنر تھے۔۔۔ بادشاہ جان!"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" رانی نے بگڑ کر رہی سے کہا "یہ پہلے کرکٹ کھیلتے تھے۔ بزنس انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ البتہ ہمارا ایک اسپتال ضرور ہے۔"

"کم آن میری رانی جی! وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ بچی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

رانی پلو سنبھال کر کار میں بیٹھ گئی۔ جمال نے دروازہ بند کیا اور گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے اس لڑکی کو جو ابھی تک وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس لڑکی نے جب وہ کھلاڑی تھا اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ کار روانہ ہوگئی۔

رانی زیر لب مسکراتی رہی۔ اس نے جمال کی ادائے ناشناس کو پہچان لیا تھا مگر وہ مطمئن تھی۔ وہ فیشن ایبل، بے باک اور جارحانہ انداز رکھنے والی لڑکیاں ہار گئی تھیں۔ کیوں کہ جذبہ محبت کے خلوص نے جیت لیا تھا۔ جس کا ٹرمپ کارڈ اب اس کے پاس تھا۔

جمال نے اس عورت کے ہاں سے جو لفافہ لایا تھا جسے بادشاہ نے قتل کیا تھا اس میں دس لاکھ کی رقم تھی۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کی ماڈل اور کال گرل تھی۔ اس کی الماری سے جو غیر ملکی، ملکی کرنسی نکلی اس کی مالیت چھ کروڑ تھی۔ سونے اور ہیرے جواہرات کے زیورات تین کروڑ کے بادشاہ کی الماری پر بھی اس نے ڈاکا مارا تھا جس میں سے رقم اور سونے کے زیورات سات کروڑ کے۔۔۔ اگر وہ اس رقم اور زیورات کو ہاتھ نہ لگاتا تو پولیس بغیر ڈکار لیے ہضم کر جاتی۔ اب شفاخانہ جدید ترین اسپتال میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس میں صرف غریبوں اور نادار مریضوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ یوں ہر مرض کے معالج کی فیس صرف سو روپے ہے۔

☼ ☼

پتی ورتا

شاہین کاظمی

کچھ لوگ اس قدر حقیقت پسند ہوتے ہیں کہ وہ محبت جیسے طاقت ور جذبے کو وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی۔

خواہشوں کی بے کراں سمندر میں ایک ننھی منی کشتی حیات کا سفر

میری ماں عجیب سی تھی۔ آدھی سے زیادہ زندگی رسوئی میں گزار کر پتی ورتا ہونے کا ثبوت دیتے دیتے ایک دن اس نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ روز کھانا پروس کر وہ اپنے پتی کے چہرے پر اگنے والے تاثرات میں محبت کی کوئی بھولی بھٹکی کرن تلاش کرنے کی کوشش کرتی، لیکن وہاں جامد سناٹے کے سوا کچھ نہ پا کر خاموشی سے برتن سمیٹ کر کھرے میں گھسنے بیٹھ جاتی اور باپو اپنا پوا بغل میں دبائے اندھیرے میں جاگتی گلیوں کا رخ کرتا۔ میں گو بہت چھوٹی تھی لیکن باپو کے تیور اور ماں کے آنسو دونوں نظر آتے۔ میں نے اتنی چھوٹی عمر میں ہی تہیہ کر لیا تھا کہ مجھے ماں جیسی نہیں بننا۔ پھر ایک دن ماں اپنے ہاتھ کا سارا ذائقہ مجھے سونپ کر خود چتا پر جا سوئی، اور نہ چاہنے کے باوجود جب میں نے پہلی بار موہن کو کھانا پروسا تو مجھے لگا وہ کھانے کے ساتھ انگلیاں بھی کاٹ کھائے گا۔ کھانا کھا کر اس نے ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈالی۔

"تیرے ہاتھوں میں غضب کا سواد ہے۔" اس کا ہاتھ میری کمر پر رینگ آیا۔

"کیا اس کا بھی مجھ سے صرف بھوک کا رشتہ ہے؟" مجھے بے اختیار ماں یاد آگئی۔۔۔۔ ستائش اور چاہے جانے کی تمنا میں گھلتی ہوئی، رسوئی میں ہلکان ہوتی ہوئی ماں۔

مجھے موہن سے نفرت نہیں تو محبت بھی نہیں تھی۔ عجیب شخص سا آدمی تھا۔ کھانے اور پیسے کے علاوہ اس کا کوئی اور شوق نہ تھا۔ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنے والی چمک سے مجھے شدید چڑ تھی، لیکن اس کے باوجود میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا من مار کر رسوئی سے رشتہ جوڑ لیا۔ سسرال بھر میں میرے کھانوں کی تعریف ہوتی۔ فرمائش کر کے کھانے بنوائے جاتے اور جی بھر کر سراہا بھی جاتا، لیکن مجال ہے جو موہن کے منہ سے تعریف کے نام پر کبھی کوئی ایک شبد بھی پھوٹا ہو۔ میں تو شاید اس کی دکان میں پڑے کپڑے کا

کوئی تھان تھی...... لیکن نہیں کپڑے کے تھان بھی اس کی نظر میں اہم تھے۔ میں تو بس نرک جھونکنے کو تھی...... چاہے وہ تن کا ہو یا من کا۔

دھرتی سوکھے کی زد میں ہو تو مٹی چٹخنے لگتی ہے۔ سب کھنڈر ہونے لگتا ہے۔ میں بھی ایک ایسی ہی بانجھ دھرتی تھی جسے سوکھا کھا گیا تھا۔ دراڑوں میں جانے کون سے آسیب اتر آئے جو اپنے لمبے ناخنوں سے دن رات مجھے نوچا کرتے۔ میری آتما بلبلا کر بین کرنے لگتی۔ ایسے میں مرا جی چاہتا میں موہن کا خون پی جاؤں۔ کبھی ماں کو کوسنے پر اتر آتی جس نے بنا دیکھے بھالے مجھے اپنے سے پندرہ سال بڑے موہن کے پلے باندھ دیا تھا۔ وہ اس کے بڑے سے گھر اور پیسے کی ریل پیل پر ریجھ گئی تھی۔

ماں مجھے اکثر کہا کرتی کہ میں ناشکری ہوں۔ گلہ میری زبان کی نوک پر دھرا رہتا ہے۔ کیا میں واقعی ناشکری ہوں؟ جو ملا نہیں اس پر شکر کیسا؟ لیکن ماں کو میری یہ منطق سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ ہر حال میں مجھے اپنے جیسا دیکھنا چاہتی تھی...... گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے۔ لیکن مجھے یہ زندگی منظور نہ تھی۔

اس دن دیور جی کو نئی سنوری دیورانی کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر میں دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ اوپر جاتی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھ ٹکائے دیور جی اس کے چہرے پر جھکے ہوئے تھے۔ دیورانی کے چہرے پر محبت اور ممتا کا انوکھا تال میل دیکھ کر وہ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگی۔ میرے اندر کہیں نارسائی کا گہرا کرب سانپ کی طرح پھنکارنے لگا...... سونی کوکھ جلنے لگی۔ اس دن پہلی بار مجھے موہن سے نفرت محسوس ہوئی...... شدید نفرت۔ لیکن وہ تو شروع سے ہی ایسا تھا...... بے حس اور خود غرض۔ اگر اسے کوئی غرض تھی تو محض اپنی بھوک سے۔ میں بھی ''رادھیکا کھانا''......

''رادھیکا رات بھیگ گئی ہے اب آ بھی جاؤ۔'' سن سن کر اوب گئی تھی۔

''میں اسے کیوں نظر نہیں آتی تھی؟'' کبھی کبھی میرا من کرتا اسے کسی دن جھنجوڑ کر پوچھوں۔

''آخر میں تمہیں کیوں نظر نہیں آتی۔'' لیکن جانتی تھی پتھر سے ٹکرانے پر اپنا ہی ماتھا پھوٹتا ہے.... سو یہی ہوا۔

''ڈرامے کم دیکھا کرو۔'' اس کی آواز میں تلخی تھی۔

''کاروبار بھی تو دیکھنا ہوتا ہے، اور ہماری کون سی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ یہ چونچلے نئے نویلوں پر اچھے لگتے ہیں۔''

''نئے نویلے ہونے پر تم نے کون سا پہاڑ توڑ لیا تھا؟'' میں اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو نہ چھپا سکی۔

''تم جانتی ہو مجھے زبان چلانی عورتیں پسند نہیں۔'' وہ جھنجلا گیا۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی خبر تھی وہ کبھی میری بات نہیں سمجھے گا۔ کیا میں کچھ زیادہ مطالبہ کر رہی تھی؟

اندر سوکھا بڑھا تو مٹی بھرنے لگی۔ تیز ہواؤں شور ڈرانے لگا۔ اس گرداب میں میرے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ اپنی بے مائیگی اور بانجھ پن کا احساس بڑھنے لگا...... ساتھ ہی رسوئی میں گزرتا وقت لمبا ہوا اور موہن کی نفرت بھی۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا... کٹھور...... بے حس اور وہی اس کا تیزی سے بے ہنگم بڑھتا ہوا جسم۔

دیسی گھی میں تر بتر حلوے کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم بنا لاتی ہو اور میں نہ نہیں کر سکتا جب کہ ڈاکٹروں نے سختی سے چکنا منع کیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ خون میں گھی زیادہ ہو گیا ہے نا۔'' اس نے سا منہ بنایا اور پلیٹ پکڑ لی۔

''ڈاکٹروں کا کیا ہے، اپنی دوکان بھی تو چلانی ہے انہیں۔'' میں اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور سوچ رہی تھی صبح دودھ والے سے مزید پانچ کلو شدھ گھی منگوا ہی لوں۔

☆☆

سرد موسم کے گلاب

فرحین جمال

ہزاروں لاکھوں افراد ایک ٹھوس اور مستحکم مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجا کر اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں جاتے ہیں۔

تارکین وطن ایک شخص کی سبق آموز کتھا

شام کسی مہیب اور سالخوردہ پرندے کی مانند اپنے پر پھیلائے نیچے اتر آئی تھی۔ صبح سے ہونے والی ہلکی ہلکی بارش اب شدت اختیار کر چکی تھی، بارش کی بوندوں نے ہواؤں کو بھی سرد کر دیا تھا۔ بھیگے بھیگے سے اس ٹھنڈے موسم میں، ناصر کوٹ کے کالر کو گردن تک چڑھائے، گلے میں مفلر لپیٹے، سردی سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ، سڑک کے کنارے گلابوں کے چھوٹے چھوٹے گلدستوں کو سرد ہوتی ہتھیلی کی انگلیوں سے تھامے، ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں لگا تھا۔ اسے اس کام کو شروع کیے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ اس علاقہ میں ناصر کو جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے اپنے قدم جمانے میں تھوڑی دشواری ہو رہی تھی، لیکن وہ خوش تھا کہ دارالحکومت سے دور اس شہر میں روزی کا حصول قدرِ بہتر تھا۔

ناصر بھی ان ہزاروں تارکین وطن میں سے تھا جو ایک ٹھوس اور مستحکم مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے اتنی دور چلا آیا تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچوں، بوڑھی ماں اور بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی زمین کی سوندھی خوشبوؤں سے دور وہ اس شہر میں آ چکا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے روٹی کے لالے پڑے تھے یا وہ اپنا وطن چھوڑ کر خوش تھا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ بچوں کی ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور اس کی آمدنی اتنی نہیں کہ وہ سب کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اس کا بڑا بھائی دس سال سے ملک سے باہر تھا، پہلے تو وہ تھوڑی بہت رقم ہر مہینے بھیج دیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کے اپنے بچے اور بیوی تھی اور وہ ہر بار فون پر یہ ہی کہتا تھا کہ کسی طرح ویزا لگوا کر اس کے پاس آ جائے۔ دونوں بھائی مل کر کام کریں گے۔ سو ناصر نے زمین کا بچا کچھا ٹکڑا بھی بیچ دیا اور تھوڑا قرض لے کر پردیس آ بسا۔

انسان بھی کتنا معصوم ہوتا ہے، جس جہاں کو دیکھا نہیں۔ اس کے بارے میں اتنا خوش گمان رہتا ہے جیسے زمین پر کوئی جنت اس کے انتظار اور کھوج کی منتظر ہے۔ پردیس آ کر معلوم ہوا کہ یہاں کی راتیں بھی کالی اور دن کے اجالے میں بھی سیاہی گھلی رہتی ہے۔ لوگ سرد مہر اور تنگ دل، تہذیب مادر پدر آزاد، کھانا حرام...... ناصر کو یہاں کی اونچی اونچی تاریخی عمارتوں، ان کے تنگ و تاریک نیچی چھتوں والے کمروں اور سرد ماحول سے الجھن سی ہوتی تھی، کہاں وہ دیہات کی کھلی فضا روشن دن، دوپہریں اور خنک شامیں اور کہاں یہ برف خانہ۔ لیکن کیا کرے مجبوری انسان کو ہر طرح کے ماحول کا عادی بنا ہی دیتی ہے سو وہ بھی یہاں کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ آتے ہی بڑے بھائی نے کہہ سن کر چھوٹے موٹے کام پر لگوا دیا۔ کبھی کسی ریستوران میں برتن

دھونے پر، کبھی کسی ''نائٹ شاپ'' میں رات کی ڈیوٹی تو کبھی اپنے ساتھ روز کی لگنے والی مارکیٹ کے اسٹال پر۔ اس کے پاس یہاں مستقل رہائش کے کاغذات نہیں تھے اس لیے بہت احتیاط برتنی پڑتی اور ویزا ختم ہونے کے بعد تو ہر لمحے پکڑے جانے کا بھی خطرہ رہتا کہ وہ یہاں ایک پردیسی تھا جو اپنے مقررہ معیاد سے زائد ٹک گیا تھا۔

ایک چھوٹے سے دو کمرے کے فلیٹ میں بھائی کے ساتھ رہتے اسے ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ بھابھی کو اس کا وجود کھٹکنے لگا اور بات بے بات کھٹ پٹ ہوجاتی، وہ بھی بے چاری مجبور تھی۔ سارا دن میاں کے ساتھ مارکیٹ میں کام کرتی، شام کو بچوں اور باورچی خانے کو سنبھالتی۔ ایک دن وہ بارہ گھنٹے کی شفٹ کر کے فلیٹ واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا سامان دروازے سے باہر رکھا ہوا ہے۔ اس کے بھائی نے ناصر کو 'چھڑوں' کے فلیٹ میں ایک کمرہ دلوا دیا۔ کمرہ کم اور ڈربہ زیادہ لگتا تھا، ایک کمرے میں چار بستر لگے تھے اور دن کی ڈیوٹی کرنے والے رات کو اور رات کی ڈیوٹی کرنے والے دن کو وہاں آٹھ گھنٹے گزارتے تھے۔ کوریڈور میں ایک اجتماعی غسل خانہ تھا جس کے لیے لائن لگانا پڑتی تھی۔ جسم و جان کے رشتے کو قائم رکھنے کو یہ بھی بہت تھا، وہ محنت کر کے جو بھی کماتا، اب ضرورت کے لیے تھوڑی سی رقم رکھ کے وطن اپنی بیوی کو بھیج دیتا بچوں سے کبھی کبھی بات ہوتی تو وہ چلا چلا کر اپنی فرمائشیں کرتے، گڈو کہتا کہ اسے ''نائیک کے نئے جوتے چاہئیں'' اور مانو کی ضد ہوتی کہ ''اس کے لیے گلابی رنگ کے فراک والی گڑیا'' وہ بچوں سے وعدہ کرتا کہ ''اگلی تنخواہ پر ضرور لے کر بھیج دے گا۔'' بیوی بے چاری صرف اس کی خیریت اور ماں جی کا حال کہہ کر چپ ہوجاتی کہ وہ بھی شوہر کے بنا ادھوری تھی۔ فون پر بات کرنے کے بعد وہ اور تن دہی سے کام میں جٹ جاتا، انتھک محنت کرتا کہ بچوں کی فرمائش پوری کر سکے۔

یہاں کے موسم کی ایک خاصیت ہے کہ وہ انسانی اعصابی نظام پر بہت ہی منفی اثرات مرتب کرتا ہے، سردی اور اندھیرا جینے کی امنگ کو کم کرتا جاتا ہے، ہڈیوں کو کاٹ دینے والی ٹھنڈ روح کو بھی کملا دیتی ہے، بس ایسا ہی ناصر کے ساتھ ہوا، وہ آہستہ آہستہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ مایوسیوں نے اس کے جگر کو چھلنی کر دیا، ہر طرف سے ناکامی، سکون کی تلاش میں وہ قسط قسط مر رہا تھا۔ بے پناہ مشکلات، گھر سے دوری، اجنبی ملک اور لوگ، اس کی قوت برداشت جواب دیتی گئی اور وہ شراب کا عادی بنتا گیا اور اکثر فلیٹ سے باہر دوستوں میں راتیں گزرنے لگا۔ شاید خود کو نشے میں ڈبو کر وہ سمجھتا تھا کہ سب بھول جائے گا مگر بچوں کے خوبصورت چہرے نظروں کے سامنے آتے تو وہ نئے سرے سے اپنی ہمت جمع کرتا۔ اپنا من مار کر کام پر توجہ دیتا۔ آج اس بات کو ایک سال ہو چکا تھا اور اس دیس میں قیام کی تمام درخواستیں مسترد ہو چکی تھیں۔ اب وہ ایک غیر قانونی اجنبی تھا جس کو کسی بھی وقت پکڑ کر جلاوطن کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اب دوسرے شہر میں راتوں کو چھپ کر پھول بیچنے لگا۔ وہاں بھی اسے ہر وقت پولیس کا خطرہ رہتا۔ لیکن کیا کرتا واپس جانا اس کے لیے ناممکن تھا، ابھی تو مشکل سے قرض ہی ادا ہوا تھا، ابھی بچوں کی تعلیم اور گھر کی مرمت بھی باقی تھی۔

جہاں وہ پھول بیچتا تھا وہیں سڑک کے ایک طرف بڑی بڑی عمارتیں، ریستوران اور بار تھے اور دوسری جانب شہر کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہر۔ اسی کنارے پر ایک لڑکی اپنے مختصر سے لباس میں کھڑی آتے جاتے لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی ہوتی، اس غضب کی سردی میں اسے اتنے کم لباس میں دیکھ کر اسے جھرجھری سی آ جاتی اور وہ جلدی سے اپنے ٹھٹھرتے ہوئے بدن کو پرانے کوٹ میں سمیٹ لیتا، وہ اکثر سوچتا کہ یہ بے چاری تو اس سے زیادہ مجبور اور بے کس ہے۔ آہستہ آہستہ دونوں نے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کر لیا اور ان کے درمیان ایک انجانا سا علامتی بندھن بن گیا، دونوں ایک دوسرے سے دور ہو کر بھی ایک دوسرے کے ساتھی تھے، اکیلا پن اور رات کی خاموشی، جیسے ان کے درمیان احساس کی ترسیل کا ذریعہ تھی، جس رات اسے کوئی گاہک نہ ملتا تو وہ کافی کے دو کپ لے کر ناصر کے پاس آ بیٹھتی، وہ اس کی زبان سے نابلد تھا پر وہ بے تکان بولے جاتی، اس کی آواز کا ارتعاش، ڈھلتی ہوئی رات میں بہت بھلا لگتا۔ ان دونوں کے درمیان یہ انوکھا اور اٹوٹ بندھن، ناصر کے لیے بے حد حوصلہ مند تھا۔ وہ بھی کوشش کرتا کہ جلدی جلدی اپنے پھول بیچ لے تاکہ تنہائی میں بیٹھ کر اس کی آواز سن سکے ایسا لگتا تھا کہ یہ آواز کی ڈور ہی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا نام روزی تھا بالکل نوخیز گلاب جیسی ادھ کھلی کلی جو اکثر راتوں کو جانے کیسے کیسے مسلی جاتی۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ ناصر کو اس کے جسم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بس اس کی روح سے ایک ناتا سا بن گیا تھا۔ وہ جب بھی کسی گاہک کے ساتھ کار میں بیٹھتی تو ہاتھ ہلا کر اسے ہائے کرتی اور وہ جلدی سے اس کار کی نمبر پلیٹ نوٹ کر لیتا، ایسا وہ کیوں کرتا تھا؟ اسے معلوم نہیں تھا۔

کئی بار سوچا بھی کہ وہ روزی سے اس کے پیشے کے بارے میں سوال کرے لیکن ایک تو زبان کی مجبوری دوسرے وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ ایک دن جب وہ بہت ہی موڈ میں تھی تو ناصر نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس سے پوچھا کہ ''یہ کام کیوں کرتی ہے؟''

''تو کیا کروں؟ کسی مارکیٹ یا اسٹور میں کلرکی کرنے کے بعد جو تنخواہ مجھے ملتی تھی اس سے گھر کا خرچا اور ماں کے علاج کے لیے رقم کافی نہیں تھی اور یہ میرا جسم ہے میں اسے جیسے مرضی چاہوں استعمال کروں! جب میں اپنے جسم کو اپنی مرضی سے اپنے بوائے فرینڈ کو پیش کر سکتی ہوں تو اس کی قیمت کیوں نہ وصول کروں؟'' روزی کی منطق ناصر کے پلے نہیں پڑی۔ مگر چپ ہو رہا کہ اس مادر پدر آزاد ملک میں ہر چیز بکتی ہے۔ انسان کی کوئی وقعت نہیں، پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ شرم و حیا جیسے لفظ ان کی لغت میں شاید نہیں ہیں۔ وہ خود بھی تو اپنے بچوں کی ضرورتوں کے لیے دربدر پھر رہا تھا۔

دونوں کو علم نہیں تھا کہ روزی کے دلال ان کی کافی دنوں سے نگرانی کر رہے تھے اور ایک رات جب وہ کسی خریدار کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی تو ان محافظوں نے ناصر پر دھاوا بول دیا۔ گلاب کے گلدستے ہاتھوں سے پھسل کر سڑک پر بکھر گئے اور ان غنڈوں کے پیروں تلے روندے جاتے رہے وہ اکیلا، ناتواں کب تک ان کا مقابلہ کرتا۔ وہ لاتوں، جوتوں سے اسے پیٹتے رہے۔ ناصر نے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر ان کی گرفت سے نہ نکل سکا۔

کسی نے شور سن کر پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس کی گاڑی اور سائرن کی آواز نے ناصر کے جسم میں جیسے برقی لہر دوڑا دی۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی خدشہ تھا کہ اگر پکڑا گیا تو ڈی پورٹ کر دیا جائے گا، اس لیے بڑی مشکل سے ان مسٹنڈوں سے جان چھڑائی اور اندھا دھند سڑک پر دوڑ لگا دی۔ وہ بھاگا چلا جا رہا تھا، سمت کا اندازہ کیے بغیر، بارش کی وجہ سے سڑک پر پھسلن ہو گئی تھی۔ جانے کب اس کو ٹھوکر لگی اور وہ سڑک کے کنارے کی پھسلن سے، نہر میں جا گرا۔ اس کی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا وہ دونوں جانب چمکتی دمکتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس اور نیچے کی جانب گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

ادھر جب چار دن تک ناصر کا کوئی فون نہیں آیا تو اس کے بھائی کو تشویش ہوئی اور اس نے آس پاس اس کے دوستوں سے پوچھ گچھ کی، کوئی مثبت جواب نہ ملا تو جا کر اپنے قریبی پولیس اسٹیشن پر گمشدگی کی رپورٹ کروائی۔ اس بات کو کوئی ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک دن پولیس نے اس کے بھائی کو بلا کر ایک موبائل فون اور کاغذ کا وہ پرزہ، جس پر ناصر کا نام اور پتا درج تھا اس کے حوالے کیا اور یہ دلدوز خبر سنائی کہ ناصر کی لاش دوسرے شہر کی ایک نہر سے برآمد ہوئی تھی اور وہاں کی لوکل اتھارٹی نے لاوارث جان کر اس کی لاش کو جلا دیا۔ وہ جو سرد موسم سے ہمیشہ نالاں رہتا تھا۔ اس آخری سفر پر، دہکتے ہوئے شعلوں نے اسے راکھ میں تبدیل کر دیا۔

☆☆

کچھ قدم دل کے ساتھ ساتھ

سرندر کمار مہرا

دوانسانوں کی کہانی ایک جس نے زندگی کو ہمیشہ سنجیدگی سے لیا۔ ہمیشہ زندگی میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جس کو انصاف پر یقین تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ اگر گناہ کیا ہے تو سزا ملنی چاہیے۔دوسرا جس کا نظریہ تھا کہ فطرت میں کوئی سلیقہ اور اصول نہیں ہے. جب تک کوئی ضابطہ نہ ہو مکمل انصاف ممکن نہیں۔ زندگی سب کو چوٹ دے جاتی ہے اگر یہ کچھ دے سکی تو وہ ایک لمحہ ہے جو گزر رہا ہے

کہانی پڑھ کر آپ فیصلہ کیجیے کہ آپ کو کون سا نظریہ پسند ہے

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے محبت کے لائق دنیا کی تمام عورتوں کو پانچ خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلے خانے میں وہ سب عورتیں شامل ہیں جو دولت یا فن کی بدولت شہرت اور کامیابی کے آسمان پر ستاروں کی مانند چمک رہی ہیں۔ یہ مجھ جیسے عام آدمی سے اتنے ہی فاصلے پر واقع ہیں جتنا کہ آنکھ سے افق۔ میں نے ان کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ دوسرے خانے میں وہ سب عورتیں ہیں جو پیدائشی طور پر سرد مزاج ہونے کی وجہ سے عشق کے جنون سے بے نیاز ہیں یا جن پر بدنصیبی سے بچپن میں ظالم باپ کا قہر نازل ہوا اور جس کے ردعمل کے طور پر وہ دم آخر تک مردوں کے خلاف سخت نفرت کا طوفان سینے میں دبائے پھرتی ہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ضرور ہے، لیکن دلچسپی ہرگز نہیں۔ تیسرے خانے میں وہ عورتیں ہیں جنہیں میں بہت پسند کرتا ہوں، لیکن جو میری نظر التفات پڑنے سے پہلے ہی یا بعد میں شادی کرکے اپنی دنیا آباد کر چکی ہیں۔ میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا بھی مستحق نہیں۔ یہ میرے لیے ایک اصول کی بات ہے۔ چوتھے خانے میں وہ عورتیں ہیں جن کی ایک نگاہ کرم مجھ جیسے فرشتہ صفت انسان کا ایمان متزلزل کر دینے کی قوت رکھتی ہے، لیکن افسوس کہ انہوں نے کبھی اس قوت کا استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا غرور راستے میں حائل ہو یا شاید اس کی وجہ ان کی کنجوسی ہو یا صرف بے وقوفی۔ بہرحال ان کے تعلق سے خدا سے میری یہی دعا ہے کہ اگر مجھے اور زبان نہیں دیتا تو انہیں اور دل دے۔ ان کے لیے میں نے ہمیشہ امید کا چراغ جلائے رکھا ہے۔ آخری پانچویں خانے میں وہ عورتیں ہیں جو نہ صرف یہ کہ حسین بلکہ عقل کو پیچھے چھوڑ کر عشق کے ساتھ ساتھ نمرود کی آگ میں کود پڑنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ ان کے ایک اشارے پر میں جان قربان کرنے کو تیار رہتا ہوں۔ لیکن ان کی خاص بات یہی ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا مطالبہ نہیں کیا۔

اس طرح کسی بھی عورت کو ایک بار دیکھ کر میں کچھ ذہنی ضرب تقسیم کے بعد کسی مناسب خانے میں جگہ دے دیتا ہوں اور خدا گواہ ہے، میرا پہلا فیصلہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کوئی مغرور عورت پگھل جائے اور چوتھے خانے سے ترقی کرکے پانچویں خانے میں چلی آئے یا کوئی باوفا یکایک اپنا گھر بسا لے، ورنہ عام طور پر سب اپنے اپنے خانوں میں سکھ چین کی بانسری بجاتی ہیں۔

تو قصہ یوں ہے کہ مارچ کی ایک خوشگوار صبح کو میں جے پور کے بھوانی سنگھ اسٹریٹ پر واقع اپنے خوب صورت مکان کی دوسری منزل پر بیڈ روم میں لیٹا گرم چائے اور تازہ اخبار سے کچھ اس طرح لطف اندوز ہو رہا تھا جس کا اندازہ صرف وہی خوش نصیب لگا سکتے ہیں جن کی بیویاں مر چکی ہوں یا اپنی ماؤں سے ملنے میکے گئی ہوئی ہوں۔ میری بیوی بھی اپنے پیارے بھائی اور بھابھی سے ملنے دہلی گئی ہوئی تھی اور واپسی تک مجھے خودمختار بنا گئی تھی۔ آج میری خودمختاری کا آخری دن تھا۔ تب ہی ملازمہ نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور میری اجازت کے بعد دبے قدموں کمرے میں داخل ہو کر صبح کی ڈاک میرے سامنے رکھ دی۔ یہ ڈاک دو خطوں پر مشتمل تھی۔ میں نے اخبار ایک طرف رکھ کر پہلا خط اٹھا لیا۔ یہ میری بیوی کا تھا، جس نے لکھا تھا کہ یوں تو اسے کل تک لوٹ آنا چاہیے، مگر بھائی کی محبت اور بھابی کا اصرار راستہ روک رہا تھا۔ اس لیے ایک ہفتے بعد لوٹے گی۔ معافی کی درخواست تھی۔ میں نے دوسرا خط اٹھا لیا۔ پہلے جملہ پڑھتے ہی میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لیا۔ لکھا تھا۔ ''ہر جیت مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔ میرا نام رتنا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ ہم نو برس پہلے ملے تھے اور پھر کچھ ناگوار حالات میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ آج کل میں ادے پور میں رہتی ہوں۔ اگر ممکن ہو تو یہاں آ کر مجھ سے ملو۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔ تمہاری رتنا۔''

یہ خط پڑھ کر مجھ پر ایک اضطراب طاری ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا کیا مطلب لگایا جائے۔ سوچتا تھا رتنا بھی ایک عجیب عورت ہے۔ اسے شک تھا کہ شاید میں نے اسے یاد نہیں رکھا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا۔ خدا کی پناہ۔ مجھے تو یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا تو معمول کے مطابق ضرب تقسیم کرکے میں نے اسے پانچویں خانے میں رکھ دیا تھا...... مگر قدرت نے وہ کرتب دکھایا کہ رتنا پانچویں خانے سے اچھل کر چوتھے خانے میں جا بیٹھی اور میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ تماشا دیکھتا رہا۔

جی ہاں! رتنا نے ٹھیک ہی لکھا تھا۔ نو برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں میں بھی جے پور کے بھوانی سنگھ اسٹریٹ پر واقع اسی مکان میں رہا کرتا تھا اور اپنی تعلیم مکمل کرکے ادھر ادھر ملازمت کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ میرے باپ نے، جس کے پاس روپے کی کمی نہیں تھی، ایک بڑی رقم میرے اوپر لگا دی۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ میں بمبئی کی ایک بڑی کمپنی کے جے پور سیلز بیورو کا انچارج ہوں۔ میرے پاس کام بہت تھا۔ لیکن دنیا کے تمام کاہل آدمیوں کی طرح میں بھی اپنا کام بڑی تیزی سے کر ڈالتا، تاکہ جو وقت بچے، وہ بستر پر لیٹ کر اونگھنے میں گزار سکوں۔ ان دنوں جے پور کا قدیم شہر مغربی تہذیب کی آمیزش سے تبدیلی کے ابتدائی مرحل طے کر رہا تھا۔ مجھے اس ملی جلی فضا میں بڑی رنگینی نظر آئی۔ فکر معاش سے فارغ ہو کر دھیرے دھیرے میں نے پر پھیلانا شروع کیے۔

سب سے پہلے میری نظر جس جگہ الجھی، وہاں رتنا کھڑی تھی۔ رتنا میری طرح راجپوت نسل کی تھی اور میرے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔ اس کا باپ ہوشیار سنگھ مہاراجہ کے بچے کھچے دربار میں ایک ادنیٰ خادم تھا، مگر بوڑھے کے پاس آج بھی اپنے اجداد کی جاگیر کا کچھ حصہ بچ رہا تھا، جو سرحد پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے کشن گڑھ میں محفوظ تھا۔ وہاں اس نے اپنے اکلوتے بیٹے خوش بخت سنگھ کو لگا رکھا تھا۔ رتنا کی ماں ایک دم بوڑھی تھی۔ اسے آنکھوں سے بہت کم دکھائی دیتا اور وہ ہمیشہ سفید ساڑھی پہنے خزانے والوں کے راستے پر واقع ایک مندر کے چکر کاٹا کرتی اور جب وہاں سے واپس آتی تو مالا ہاتھ میں لیے تلسی کے جاپ کیا کرتی۔ اس کی آواز اتنی کرخت تھی کہ مجھے محسوس ہوتا جیسے شیطان کو بلاوا دے رہی ہو۔

رتنا ایک قسم کی آرٹسٹ تھی۔ میرا مطلب ہے اسے بچپن سے تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھرنے کا شوق تھا۔ جب وہ بڑی ہوئی تو اس نے جے پور کے ایک آرٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے آرٹ کا امتحان دے کر باہر نکلی تو ایک دو برس یوں ہی اپنے فن کی نمائش کے لیے ادھر ادھر کی آرٹ گیلریوں کی خاک چھانتی پھری۔ جب اس سے دل بھر گیا تو اپنے ماں، باپ کے پاس لوٹ آئی۔ اس کے خدوخال آج بھی میرے دل کی گہرائیوں میں کندہ ہیں۔ تب اس کی عمر بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ لمبے قد کی ایک دلکش لڑکی تھی۔ اس کی جلد کندن کی طرح چمکتی تھی اور جسم بھرا بھرا تھا، اس کے چہرے پر ایک آرٹسٹ کی دیانت داری جھلکتی تھی۔ وہ عام طور پر چپ رہا کرتی اور اکثر سنجیدگی سے کسی بات پر غور کرتی نظر آتی۔ جب وہ بے خیالی کے عالم میں اپنے مکان سے برآمد ہو کر لان پر کینوس جما دیتی اور اوڑھنی کس کر باندھتے ہوئے برش ہاتھ میں تھام لیتی تو بھوانی سنگھ اسٹریٹ پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے شمار راجپوت دل مچل جاتے۔ چونکہ مجھے بھی ایک دن خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے، اس لیے جھوٹ نہیں بولوں گا کہ میرا دل بھی اس کی قربت کے لیے مچلتا تھا۔

رتنا کے باپ کو میرے راجپوت خون پر مجھ سے زیادہ بھروسا تھا۔ مجھے رتنا کے گھر آنے جانے کی کھلی اجازت تھی۔ میں کسی بھی وقت وہاں جا دھمکتا۔ اس کے باپ کو ادب سے جھک کر سلام کرتا اور تلسی کے جاپ اور مالا کو بالکل نظر انداز کرتا ہوا سیدھا رتنا کے

پاس جا پہنچتا۔ شروع میں وہ مجھ سے دور بھاگتی تھی اور مجھے شک کی نظر سے دیکھتی۔ پھر رفتہ رفتہ کھل کر بات کرنے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ میری طبیعت میں کچھ کھوکھلا پن ہے۔ مگر میں نے اس کی رائے کی بھی پروا نہیں کی۔

ایک دن میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''رتنا تم سچ مچ بڑی بے وقوف لڑکی ہو۔''

میں نے ہمیشہ لڑکیوں کو اپنی بے وقوفی کی بات سن کر خوش ہوتے دیکھا ہے۔ رتنا بھی خوش ہو کر بولی۔ ''ہر جیت میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔ اگر تم یہ ثابت کردو کہ تم مجھ سے زیادہ عقل مند ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بہت آسان بات ہے۔ تم اپنے دل میں جھانک کر دیکھو۔ وہاں یہ ہی لکھا نظر آئے گا۔''

وہ بے چینی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔ ''مجھ سے پہیلی نہ بجھاؤ۔ مجھے سیدھی بات بھلی لگتی ہے۔''

''دیکھو، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے زیادہ عقل مند ہوتیں تو شاید میں تم سے نفرت کرتا۔''

''لیکن تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ تمہارے متعلق میرا کیا خیال ہے؟''

''ہاں جانتا ہوں۔ تم نے کبھی مجھے خاص پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔''

''اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''تم سمجھتی ہو میں ایک سطحی قسم کا آدمی ہوں۔ مجھے صرف سامنے رکھی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان چیزوں کے پیچھے پوشیدہ حقیقت نظر نہیں آتی۔''

رتنا ہنستے ہوئے تالیاں بجانے لگی۔ ''بہت خوب، تو کیا یہ غلط ہے؟''

میں نے جوش میں آ کر کہا۔ ''ہاں، یہ ایک غلط بات ہے، یہ مجھ پر ایک الزام ہے۔ میں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے، میرا مشاہدہ ہے کہ زندگی ایک نہ ایک دن سب کو چوٹ دے جاتی ہے۔ اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔ اگر یہ کچھ دے سکتی ہے تو صرف وہ ایک لمحہ جو ہم اس وقت ایک بے معنی بحث میں ضائع کر رہے ہیں۔''

رتنا انہماک سے میری بات سن رہی تھی۔ کچھ سوچ کر بولی۔ ''اگر اپنا یہ ایک لمحہ میں نے تمہیں سونپ دیا تو کیا تمہاری تسلی ہو جائے گی؟''

میں نے اچانک بڑھ کر اس کے کندھوں کو تھام لیا۔ اس نے کن انکھیوں سے میری جانب دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں دعوت شوق دکھائی دی۔ میری عزیز رتنا اس وقت کتنی دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جھک کر پیشانی پر آہستہ سے بوسا دیا۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور قریب پڑے ایک تخت کے کنارے پر لا بٹھایا۔ پھر میں اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ ''رتنا تم بے وقوف ضرور ہو، مگر یقین کرو، اس لمحے میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم زندگی بھر خوش رہو اور بس۔''

رتنا سر جھکائے دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ پھر ہاتھ چھڑا کر کمرے سے باہر جاتی ہوئی کہنے لگی۔ ''مجھے تمہاری بات کا بالکل یقین نہیں۔''

میں نے اسے روک کر اس کے دونوں ہاتھوں پر بوسہ دیا اور رخصت لے کر واپس چلا آیا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد وہ میرے مکان میں میری آرام کرسی پر بیٹھ کر میری چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''ہر جیت تم جو بھی ہو، میں تمہارا ایک پورٹریٹ بنانا چاہتی ہوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے پورٹریٹ میں وہ گہرائی نہیں آئے گی۔ جس کی تمہارے آرٹ کو تلاش رہتی ہے۔''

اس نے میرے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جو بھی ہو۔ اگر میں نے تم کو کینوس میں قید کر لیا تو سمجھو کامیاب ہو گئی۔''

''آج مجھ پر بڑی مہربان ہو۔ پھر اس پورٹریٹ کا کیا بنے گا؟''

''وہ میں تمہیں ایک میمنٹو کے طور پر دے دوں گی۔''

''اگر یہ ہی بات ہے تو اپنی محبت کا تحفہ مجھے دے دو۔''

اس نے چائے کی پیالی سامنے رکھ دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر خفگی کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''تم ان مردوں کی طرح بات کرتے ہو جو ڈائری میں اپنی فتوحات کا حال تاریخوں کے ساتھ درج کیا کرتے ہیں۔''

میں نے اسے واپس کرسی میں دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''تم پہلی لڑکی ہو، جس نے مجھے ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کاش کہ میں تم سے کبھی نہ ملتا۔''

رتنا غور سے میرے چہرے میں کچھ ڈھونڈنے لگی جو شاید اسے وہاں نہیں ملا۔ پھر جیسے ایک دم ہوش میں آ کر دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی سے دروازے کی طرف چل دی۔

ایک گرم دوپہر کو میں مرزا اسماعیل اسٹریٹ پر ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں کچھ خریدنے گیا اور ایک بڑا پیک بغل میں دبائے باہر نکل کر سوچ رہا تھا کہ اب کیسے گھر واپس جایا جائے، کیوں کہ میری کار تین روز سے گیراج میں مرمت کے لیے پڑی تھی۔ یکایک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں پلٹا تو رتنا اپنی بہترین مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ میں نے ذرا جھکتے ہوئے اسے سلام کیا تو مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔ اور وہ بولی۔ ''میرے پیارے ہر جیت..... تم بڑے کنفارمسٹ قسم کے آدمی ہو۔ موقع کوئی ہو، تم تہذیب کا پاس کبھی نہ چھوڑو گے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''یہ میری تعریف کی جا رہی ہے یا میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔''

''میں اتنی تنگ نظر نہیں۔ تمہاری ایک عادت پسند آئی۔ سو کہہ دیا۔'' اس نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''آؤ..... تمہیں اپنے ایک آرٹسٹ دوست سے ملاؤں۔ دراصل میں اسی کے ساتھ کھڑی تھی کہ تم نظر آئے اور میں اس سے دو منٹ کی اجازت لے کر چلی آئی۔''

رتنا کا آرٹسٹ دوست ایک نوجوان سکھ تھا۔ عمر اٹھائیس کے قریب ہوگی۔ وہ دراز قد اور کسی قدر بھاری جسامت کا مالک تھا۔ ناک نقشہ شاید اچھا ہی تھا۔ مگر جیسا کہ عموماً سکھوں کے ساتھ ہوتا ہے اس کی گھنی داڑھی نے اس کی شخصیت کچھ چھپا سا دیا تھا، مگر وہ ایک عام سکھ سے یوں مختلف تھا کہ اس کی داڑھی بندھی ہوئی نہیں تھی، ہاں پگڑی بندھی تھی، مگر ڈھیلی ڈھیلی سی۔ اس کی جلد میں کچھ کھردرا پن سا تھا جو تیز ہوا اور گرد و غبار میں مسلسل رہنے سے پیدا ہو جاتا ہے، مگر آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس کے کپڑے صاف تھے، مگر غلط طور پر سلے ہوئے۔ کہیں کہیں رنگ کے پرانے داغ نمایاں تھے۔ مختصر یہ کہ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ آرٹسٹ ضرور نظر آتا تھا۔

ہم اس کے قریب پہنچے تو رتنا نے بتایا کہ اس کا نام بلبیر سنگھ ہے۔ ان کی ملاقات دو سال قبل بمبئی کی مشہور جہانگیر آرٹ گیلری میں ہوئی تھی، جہاں ان دنوں بلبیر سنگھ کی بنائی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ رتنا بھی اپنے کچھ خاکے اس نمائش میں داخل کرانا چاہتی تھی، مگر ناکام رہی۔ بلبیر سنگھ امیر باپ کا بیٹا تھا اور لدھیانے کا رہنے والا۔ شروع میں وہ رتنا سے ملنے جے پور آیا تھا۔ پھر یہ جگہ اسے اتنی پسند آئی کہ اس نے تخت شاہی کے پاس ایک باقاعدہ اسٹوڈیو بنا لیا اور رہنے بھی وہیں لگا۔

مجھے دیکھتے ہی بلبیر سنگھ نے کہا۔ ''واہگورو...... واہگورو۔''

وہ بڑے تپاک سے ملا اور تجویز پیش کی کہ قریب کے نیروز ریستوراں میں چائے پی جائے۔ ہم ایک کونے میں پڑی میز کے اطراف جا بیٹھے۔ میں نے بغل میں دبا ہوا پیکٹ ایک جانب رکھ دیا اور پیر پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ سرد ہوا اور ہلکے اندھیرے میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گرم خوشبودار

چائے کا انتظار کرتے ہوئے مجھے لطف آ رہا تھا۔

رتنا نے اپنی کہنی سے مجھے ٹہوکا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ پوچھنے لگی۔ ''جب تم دکان سے باہر نکل رہے تھے تو کچھ فکرمند نظر آ رہے تھے۔ کیا بات ہے؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ''دراصل میری کار تین دن سے بے کار پڑی ہے۔ میں صرف اتنا سوچ رہا تھا کہ گھر کیسے جاؤں۔''

اسی درمیان چائے آ گئی۔ رتنا نے چائے بنا کر پہلی بلبیر سنگھ کی طرف بڑھا دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مسکراتی ہوئی بولی۔ ''بلبیر چائے بہت پیتا ہے۔ دو گھنٹے سے میرے ساتھ ہے اور سات پیالیاں خالی کر چکا ہے۔ میں چاہ رہی تھی کہ جب ہم اٹھیں تو اس کی دس پیالیاں پوری ہو جائیں۔''

اس موقع پر بلبیر سنگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہرجیتے! جب بھی میں پریشان ہوتا ہوں تو دھیان لگا کر دوبارہ واہگورو کا نام لیتا ہوں۔ اس سے میری پریشانی ختم ہو جاتی ہے یا مجھے سکون مل جاتا ہے۔ تو بھی واہگورو کا نام لیا کر۔''

اس کے اس غیر رسمی انداز پر میں پھر ایک بار ہنس پڑا اور بدستور ہنستا ہوا بولا۔ ''واہگورو واہگورو۔ میری کار تین دن سے بے کار پڑی ہے۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گا۔''

بلبیر سنگھ نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ ''ہرجیتے...... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مشکل کیا ہے۔ صرف نام لینا بہت ہے۔ واہگورو سب جانتے ہیں۔'' پھر کچھ رک کر بولا۔ ''میں تجھے اپنی کار میں چھوڑ دوں گا۔''

پھر رتنا نے ایک باسکٹ سے جس پر اب تک میری نظر نہیں پڑی تھی، مختلف رنگوں کے درجنوں ٹیوب نکال کر پوری میز پر پھیلا دیے اور رنگوں کے امتزاج کے متعلق ان دونوں میں ایک گرم بحث چھڑ گئی۔ میں نے اپنے لیے کچھ اور چائے انڈیل لی۔ سگریٹ سلگا لیا اور تمام خیالات دماغ سے خارج کر کے چھت کو گھورنے لگا۔

بلبیر سنگھ نے بیچ بیچ اپنی دس پیالیاں پوری کیں۔ جب بیرا بل لے کر آیا تو میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے مجھے روک دیا اور خود بل چکانے پر اصرار کرنے لگا۔ پھر ہم تینوں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر تیز دھوپ میں نکل آئے۔

بلبیر سنگھ جھپٹ کر اپنی کار لے آیا۔ میں نے کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے رتنا سے کہا۔ ''رتنا، یہاں میرے پاس بیٹھو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

بلبیر سنگھ نے کہا۔ ''واہگورو...... واہگورو۔''

جب کار میرے گھر کی طرف جا رہی تھی تو مجھے محسوس ہوا، بلبیر سنگھ اتنا سیدھا آدمی نہیں جتنا پہلی بار دیکھنے پر مجھے لگا تھا۔ وہ یوں تو لاخیالی کے عالم میں کچھ گنگنا رہا تھا، مگر میری ایک ایک حرکت پر اس کی نظر تھی اور کان بھی میری طرف لگے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے تمام مسائل کا اس کے پاس ایک ہی حل تھا اور وہ حل تھا واہگورو کا نام۔ وہ کار بے حد تیز چلا رہا تھا اور بغیر گیئر بدلے دائیں بائیں موڑ دیتا تھا۔ ایک چوراہے پر میں نے ایک سپاہی کو اس کی کار کا نمبر نوٹ کرتے دیکھا۔ ایک جگہ چھوٹی لڑکی اچانک سامنے آ گئی۔ بلبیر سنگھ نے کمال پھرتی سے اسے بچایا اور رفتار ذرا دھیمی کرتے ہوئے بول اٹھا۔

''واہگورو...... واہگورو۔''

رتنا میری طرف رخ کر کے بولی۔

''ہرجیت...... تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟''

بلبیر سنگھ نے ہانک لگائی۔ ''واہگورو...... واہگورو۔''

میں نے اسے بالکل نظرانداز کر دیا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر رتنا کے کندھوں کو ڈھک لیا اور پھر بلند آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''رتنا! کل میرے کلب میں ایسٹر کے موقع پر ایک بال ہے۔ تم وہاں میرے ساتھ جاؤ گی۔''

''واہگورو۔''

''اپنے بہترین لباس میں۔''

''واہگورو۔''

''اور اپنی بہترین مسکراہٹ کے ساتھ۔''

''واہگورو۔''

رتنا میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''بہت معمولی بات ہے، وعدہ رہا۔''

بلبیر سنگھ نے فوراً جپ جی کا پاٹھ شروع کر دیا۔

کار رکی تو میں اور رتنا اتر پڑے۔ رتنا اپنے گھر چلی گئی۔ میں نے بلبیر سنگھ کا شکریہ ادا کیا اور اندر آنے کو کہا۔ اس نے معذرت چاہی اور پھر کسی مناسب دن آنے کا وعدہ کر کے گنگناتے ہوئے کار چلا دی اور ایک دو منٹ میں یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک اتوار کی صبح دس بجے میں سو رہا تھا کہ رتنا اور بلبیر میرے کمرے میں گھس آئے اور مجھے جگا کر بستر پر بٹھا دیا۔ وہ دونوں ایک بڑا کینوس، کئی برش اور بے شمار ٹیوب اٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کندھوں سے پکڑ لیا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے بغل والے کشادہ لاؤنج میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنا سامان فرش پر رکھ دیا اور چھوٹی میز کھینچ کر دیوار سے لگا دی اور اس کے سامنے ایک اسٹول ڈال کر مجھے اس پر بٹھا دیا۔ پھر رتنا نے کہیں سے ایک پرانی بوسیدہ انگریزی کتاب برآمد کی، جس پر لکھا تھا۔

''ارسطو کے چند بنیادی نظریات۔'' اس نے کتاب میرے ہاتھ میں اس طرح تھما دی کہ دور سے اس کا نام صاف دکھائی دے۔ پھر مجھے سگریٹ سلگا کر کش لیتے ہوئے پرخیال انداز میں چھت کی طرف دیکھنے کو کہا اور بلبیر کی طرف مڑ کر بولی۔ ''یوں بنے گا پورٹریٹ۔''

میں نے سر پیٹ لیا۔ یکایک مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''رتنا، ذرا سوچو، کینوس پر یہ سب کتنا مصنوعی معلوم ہوگا۔ مجھے یہ بالکل بالکل پسند نہیں۔''

مگر شاید میں ایک انچ موٹی لوہے کی دیوار کے دوسرے جانب سے بات کر رہا تھا۔ رتنا پر کچھ اثر نہیں پڑا، بولی۔ ''تمہارے چہرے پر فکر کی جو کمی ہے۔ وہ یہ کتاب پوری کر دے گی۔''

''مگر تم نے تو کہا تھا کہ میری اصلی شخصیت کو کینوس پر منتقل کرنے کی کوشش کرو گی۔''

''اس کتاب کو چھو کر تمہارے چہرے میں جو تغیر آیا ہے وہ کینوس پر ضرور منتقل ہوگا۔''

''مگر ارسطو کے نظریات! خدا رحم کرے۔ میں اس سفاک کو چمٹے سے پکڑنے کے لیے بھی تیار نہیں۔'' میں نے کہا اور بلبیر کو مخاطب کر کے اپیل کرنے لگا۔ بلبیرے۔ ''تو بھی کچھ کہہ ڈال۔ تجھے ایک سچے دوست کا واسطہ۔''

بلبیر ایک کونے میں بیٹھا داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ رتنا سے کہنے لگا۔ اس کا ارسطو سے پرانا بیر معلوم پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بقراط کی کوئی کتاب تھما دو۔ اس کا استاد تھا۔ چلو معاملہ ختم ہوا۔''

میں نے چلا کر کہا۔ ''بلبیرے...... بے وقوف۔ وہ اس کا استاد نہیں۔ تجھ پر خدا کی مار۔''

ان دونوں نے میری ایک نہ چلنے دی۔ بلبیر اوپر آنے سے پہلے بہت سی چائے بھیجنے کی ہدایت کر آیا تھا۔ کچھ دیر میں چائے آ گئی۔ ہم سب پینے لگے۔ رتنا نے کینوس پر دو چار آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر ہاتھ روک لیا اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ ہم ادھر ادھر کی بے پرکی باتیں کرنے لگے جو صرف اتوار کی سست صبح میں کی جا سکتی ہیں۔ کمرے میں میری قیمتی سگریٹوں کا دھواں پھیلنے لگا۔ بلبیر نے چائے کی چوتھی پیالی صاف کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ ''مجھے کچھ ضروری کام سے پہنچ جانا ہے۔'' پھر رتنا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم کو کہیں جانا ہو تو چھوڑ دوں۔''

رتنا نے جواب دیا۔ ''شکریہ...... مگر مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں کچھ دیر اور یہیں بیٹھوں گی۔''

بلبیر سنگھ نے کہا۔ ''واہگورو...... واہگورو'' اور چپ چاپ چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے اپنی جگہ سے ایک چھلانگ لگائی اور رتنا کے قدموں میں گھٹنے ٹیک کر ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''رتنا...... کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے کہ ہم ساتھ چل رہے ہیں، مگر متوازی راستوں پر۔ یہ سفر کبھی ختم بھی ہوگا؟''

رتنا میرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے الجھانے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ کھینچ کر انہیں بار بار چوما اور جذبات کی شدت سے بار بار پوچھنے لگا۔ ”رتنا...... مجھے جواب دو۔ مجھے جواب دو، مجھے جواب دو۔“

بڑی دیر کے بعد اس نے زبان کھولی۔

”ہر جیت مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا پوچھنا تھا؟“

”تم مجھ سے شادی کرو گے؟“

یکا یک میرا حلق سوکھ گیا اور آواز اندر اٹک گئی، مگر میں نے فوراً خود پر قابو پالیا۔ اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے قریب کھینچ لیا اور بولا۔

”ہاں رتنا...... میں تم سے شادی کروں گا۔“

مگر اس ایک لمحہ کے توقف نے اپنا کام کر دکھایا۔ میری پیاری رتنا مجھے سمجھ گئی اور خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔

آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ اس دن کی گفتگو سے میری جانب رتنا کے رویے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ پر اتنی ہی مہربان تھی جتنی کہ پہلے۔ وہ ہمیشہ مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کرتی اور جب تک میرے قریب رہتی مسرت کا نور اس کے چہرے سے ٹپکتا رہتا۔ بلبیر سنگھ اکثر اس کے ساتھ میرے پاس آیا کرتا۔ ہم تینوں بالائی منزل پر لاؤنج میں بیٹھے گپ لڑاتے، میری سگریٹ کے دھوئیں سے فضا بوجھل ہو جاتی، بلبیر چائے کی پیالیوں پر پیالیاں چڑھاتا۔ ہم اکثر شام کا کھانا باہر کھاتے۔ جب پہلی بار ہم باہر کھانے گئے تو مجھے پتا لگا کہ بلبیر شراب بھی غضب کی پیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی شخصیت میں آرٹ کم اور چائے اور شراب زیادہ بھری تھی۔ جو تھوڑی جگہ بچ رہی تھی، وہ داہگورو کے نام کے منتر نے پر کر دی تھی اور ادھر ادھر کے شگافوں میں رتنا کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ بس یہ تھا ہمارا نام نہاد آرٹسٹ دوست بلبیر۔ مگر مجھے اس کی رفاقت میں بڑا مزا آتا۔

وہ ہم تینوں کی ملی جلی دوستی۔ دشمنی کا سب سے زریں دور تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ سب کچھ جاننے کے باوجود رتنا دھیرے دھیرے میری جانب بڑھ رہی ہے۔ مجھے شروع میں اس کا صرف جنون تھا، مگر اب مجھے اس سے ایک قسم کا انس ہو گیا تھا۔ میں اپنے سے کچھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور الگ کھڑا اپنا تماشا آپ دیکھنے لگا۔ ان دنوں میں خود سے کہا کرتا تھا۔ ”جو آئے خیال یار۔“

ایک دن بلبیر کچھ پریشان پریشان سا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کے باپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لدھیانہ جانا پڑے گا۔ پھر کچھ دیر بعد رتنا بھی میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ بلبیر اکیلا ہے۔ پریشان ہے۔ اسے بھی اس کے ساتھ لدھیانہ جانا چاہیے۔ میں نے ان دونوں پر لعنت بھیجی اور کوشش کی کہ انہیں نہ صرف شہر سے بلکہ اپنے دل و دماغ سے بھی رخصت کر دوں۔

مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے رہ رہ کر ان کی یاد آئی۔ کم بختوں نے مجھے ایک چٹھی تک نہیں لکھی۔ میں اپنی تنہائی سے اکتا گیا۔ پھر اچانک ایک دن اجمیر سے مجھے اپنے ایک چچازاد بھائی کا خط ملا۔ اس کی بیوی کی چھوٹی بہن جو اجمیر ہی میں رہتی تھی اور غیر شادی شدہ تھی، اپنے کچھ رشتے داروں سے ملنے جے پور آ رہی تھی اور بنی پارک میں کہیں ٹھہرنے والی تھی۔ اس نے آگے لکھا کہ اگر مجھے پسند ہو تو شادی کی بات چلائی جا سکتی ہے۔

اس کا نام مدھو تھا۔ جب میں پہلی بار مدھو سے مل کر واپس ہوا تو مجھے لگا کہ اک خواب تھا جو آیا اور گزر گیا۔ بس اک تیر نیم کش تھا جو جگر میں پیوست تھا۔ نہ آر آتا تھا، نہ پار اور اس کی خلش پکار پکار کر کہتی تھی کہ یہ خواب نہیں یہ خواب نہیں۔ ایک لحاظ سے جب تک مدھو میری زندگی میں رہی، اس خواب آمیز کیفیت نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پھر میں مدھو سے دوسری بار ملا اور تیسری بار اور چوتھی بار...... اور بار

بار...... ہر ملاقات میرے احساسات کے سفینے کو مسرت اور سکون کے نئے جزیروں کی سیر کراتی، جن کے وجود سے بھی تب تک میں ناواقف تھا اور ان انوکھے جزیروں پر میں بچوں کی طرح کھلواڑ کرتا اور بچوں کی طرح سوچتا کہ عمر بھر یہیں رہوں گا، کبھی واپس نہیں جاؤں گا اور پھر بچوں کی طرح ڈر جاتا کہ کہیں یہ جادو کی نگری تو نہیں، کہیں کوئی جادوگر ایک چھڑی ہوا میں گھما کر اسے غائب کر دے تو میرا کیا بنے گا؟

مدھو بلند قامت، نازک اور بے حد خوب صورت لڑکی تھی، اس کا رنگ صاف تھا، وہ اپنے سیدھے سیاہ بالوں کو کبھی باندھ کر نہیں رکھتی تھی، بلکہ ایک خاص انداز سے سنوار کر پیچھے دھکیل دیتی، جہاں وہ کندھوں پر بے فکری کے عالم میں جھومتے رہتے۔ مجھے اس کی یہ ادا بڑی پسند تھی، مگر مدھو میں اور بھی بہت کچھ تھا، مثلاً جب وہ سوچنے لگتی تو اس کی پیشانی پر ذہانت کی باریک لکیریں ابھر آتیں جو حسن کو بہت کم نصیب ہوتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی گہرائی تھی، ان میں جھانک کر اس کے دل کی حالت کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ لیکن ان میں کبھی کبھی شرارت کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ اس کے ہونٹوں کو قدرت نے بڑی محنت سے تراشا ہوگا، لیکن اس کے ہونٹ ہمیشہ بھنچے رہتے تھے۔ گویا کسی نے اسے کوئی ناخوش گوار بات کہہ کر ناراض کر دیا ہو۔ اس کا چہرا بڑا تھا اور جبڑے مضبوط اور معلوم ہوتا تھا ضرورت پڑنے پر یہ لڑکی سخت ظالمانہ رویہ بھی اختیار کر سکتی ہے، مگر مجھے اس کی فطرت کے ظالمانہ جزو میں بھی ایک رومانیت نظر آتی۔ اگر میرے چچازاد بھائی نے شادی کا نہ لکھا ہوتا تو شاید میں معمول کے مطابق اپنی ضرب تقسیم کر کے اسے چوتھے خانے میں نصب کر دیتا۔

مدھو کو پڑھنے لکھنے کا کسی قسم کا شوق نہ تھا، اس لیے اسکول چھوڑ کر کے وہ گھر بیٹھ رہی، مگر وہ بڑی ذہین تھی اور بڑی تیز۔ مگر ایک بات اس کی میں نے یہ محسوس کی وہ روایت کی غلام تھی۔ اسے ہر تبدیلی اور ہر تغیر سے نفرت تھی، کیوں کہ تبدیلی اور تغیر کائنات میں غیر یقینی پن کی علامت تھی اور ہر نئی چیز ناقابل قبول تھی، کیوں کہ ہر نئے پن میں کوئی شیطانیت کار فرما تھی۔ اسے صرف ایک اچھے شوہر کی تلاش تھی اور ایک صاف ستھرے گھر کی، جس کے فرش کو وہ دیوار سے دیوار تک نرم اونی قالینوں سے ڈھک سکے اور ڈھیر سارے خوب صورت صحت مند بچوں کی جو، جولیوس کیردل کی کتابوں سے نکل کر، چاند کی کرنوں کے سہارے اس کے گھر کے آنگن میں اتر آئے ہوں۔

تو یہ تھی میری دلبر مدھو، حسین، مغرور، ذہین، روایت پسند، شکی، ظالم، محبت سے بھری ہوئی، خواہشوں سے لدی ہوئی، خوش مزاج، بدمزاج، مگر ہر حالت میں میرے دل کا سکون، میری آنکھوں کی راحت۔

میں نے اپنے دل میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا ہے۔ بڑی بڑی چٹانوں کو کاٹ کر اس کی دیواریں بنائی ہیں اور چاروں طرف ایک گہری خندق کھود دی ہے اور خندق سے پرے ایک خطرناک خاردار جنگل اگایا ہے اور مدھو کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک پل کو اس قلعے میں عمر بھر کے لیے قید کر دیا ہے۔ وہ سب نکھری صحبتیں اور وہ سب مہکی شامیں یہاں آباد ہیں جو اس کی قربت سے عبارت ہیں۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ وہ خاموش رات اور ویران سڑک اور مدھو کا اپنے نازک جسم کا بوجھ میرے کندھے پر ڈالے ہولے ہولے قدم اٹھانا، وہ شام کا دھندلکا اور شہر کی بھیڑ بھاڑ اور ہم دونوں کی بھیڑ میں خود کو کھو دینے کی کوشش، وہ اس کی ایک ساڑھی کی خریداری کا لمبا سلسلہ اور میرا تھکاوٹ کا اظہار کرنا اور آخر میں تنگ آ کر اس کا ایک ہری سلک کی ساڑھی خرید لینا۔ اب ہم ایک شان دار ہوٹل کے تاریک پارلر میں بیٹھے گرم گرم کافی پی رہے ہیں اور اب تیز دھوپ میں ایک گلی کے نکڑ پر کھڑے بھٹے کھا رہے ہیں

اب رات کے دو بجے ہیں اور میں اسے اس کے گھر چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہوں اور وہ مجھے روک کر شکایت کر رہی ہے کہ میں نے ٹائی کی گرہ لاپروائی سے لگائی ہے، اب میری تمباکونوشی پر اعتراض ہو رہا ہے اور اب میری نافرمانی پر برہم ہوا جا رہا ہے۔ مجھے سب یاد ہے، مجھے سب یاد ہے۔

کوئی ایک ماہ بعد جب مدھو سے شادی کی درخواست کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے میں لگا ہوا تھا کہ رتنا اور بلبیر لوٹ آئے۔ ان کی آمد پر میں نے یہ کام کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیا اور سیدھا تخت شاہی کا رخ کیا، جہاں بلبیر کا اسٹوڈیو تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا اور اس نے بتایا کہ اس کے باپ کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ میں نے اسے مبارک باد پیش کی، مگر اس نے میری سنی ان سنی کر دی اور غور سے میرا چہرا تکنے لگا میں نے وجہ دریافت کی تو میری پشت پر زور سے گھونسا جما کر بولا۔ ''ہر جیتے۔ تو، تو بڑا کھل رہا ہے۔ بول تو سہی، کیا بات ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

اس نے میرا گلا پکڑ لیا اور بولا۔ ''ہر جیتے سچ بول، تجھ کو واہگورو کا واسطہ۔''

میرا تجربہ ہے کہ ایک خانے کی عورتوں کو دوسرے خانے کی عورتوں سے الگ رکھنا بڑا ضروری ہے، ورنہ انجانے میں کھیل بگڑ سکتا ہے، خصوصاً چوتھے خانے کی مدھو کو پانچویں خانے کی رتنا سے دور رکھنا میرے لیے بڑی اہم بات تھی۔ مگر بلبیر سے چھٹکارا پانا مشکل تھا اور پھر میں جلد ہی مدھو سے شادی کی درخواست کرنے جا رہا تھا۔ جلد یا بدیر اسے پتا چل جاتا۔ اس لیے میں نے اسے اسی وقت پوری طرح آگاہ کرنا مناسب سمجھا اور کہا۔ ''ایک لڑکی ہے۔''

اس نے بدستور گلا پکڑے پکڑے پوچھا۔

''نام؟''

''مدھو۔''

''کام۔''

''شادی۔''

اس نے گلا چھوڑ دیا اور مجھے گود میں اٹھا کر ناچنے لگا۔ مجھے اس کی خوشی میں رقیب پر بازی لے جانے کا عنصر نظر آیا اور میں دل ہی دل میں کڑھتا ہوا وہیں بیٹھا رتنا کو حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔

اسی شام میں رتنا سے ملنے اس کے گھر گیا تو نیچے اس کی ماں سے سامنا ہو گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''رتنا آج ہی سویرے لدھیانے سے آئی ہے۔ بہت تھکی ہوئی تھی۔ کہہ کے سوئی ہے کہ کل صبح تک نہ جگاؤں۔''

میں واپس چلا آیا۔

دوسرے دن دوپہر کو میں پھر اس کے گھر گیا۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ وہ کچھ دبلی سی نظر آ رہی تھی اور رنگ بھی کچھ ماند پڑ گیا تھا۔ میں نے سوال کیا۔ رتنا تم کچھ کمزور ہو گئی ہو۔ سب ٹھیک تو ہے؟''

وہ ہنس کر بولی، ''بلبیر کا باپ سخت بیمار تھا میں نے اس کی بہت تیمارداری کی اس ایک مہینے میں ٹھیک سے سو نہ سکی۔ شاید اسی کا اثر ہے۔ مگر کچھ ہرج نہیں۔ دو چار دن میں پہلی جیسی ہو جاؤں گی۔''

''اس کے باپ کو آخر بیماری کیا ہے؟''

''جگر کی کوئی بیماری ہے۔ کسی معمولی بیماری کا نام بھی لاطینی زبان میں لو تو خطرناک معلوم ہونے لگتی ہے'' پھر کچھ وقفے سے بولی۔ ''مگر اس کی بیماری معمولی نوعیت کی نہیں۔''

''بلبیر کہتا تھا۔ اب اس کی طبیعت بہتر ہے۔''

''اب بہتر ہے۔ مگر کسی بھی وقت پھر خراب ہو سکتی ہے۔''

''پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ کب تک کھاٹ پکڑے پڑی ہو گی۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ دنیا اتنی ہی حسین جتنی اس وقت تھی جب تم مجھے چھوڑ کر جا رہی تھیں۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی۔'' اس نے لفظ ''چھوڑ'' پر زور دیتے ہوئے کہا پھر پیار سے حکم جتانے لگی، ''اب تم چپ چاپ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں آرام کروں گی۔''

میں نے اس کے بستر کے کنارے بیٹھ کر اس کی پریشان زلفوں کو سنوارتے ہوئے سوال کیا، ''اور میرے پورٹریٹ کا کیا بنے گا؟''

اس نے جواب دیا، ''اوہ۔ وہ پورٹریٹ! اس پر کام کل سے پھر شروع ہو جائے گا۔ اب جاؤ''۔

میں نے اسے بانہوں میں لے کر اس کے گال چومے اور کہا، ''رتنا میں تمہارا انتظار کروں گا''۔

اگلی شام وہ میرے گھر آئی تو آتے ہی اس نے کینوس لگا کر برش ہاتھ میں لے لیا اور بڑی سنجیدگی سے پینٹ کرنے لگی۔ میں نے موقع مناسب جان کر مدھو کا ذکر چھیڑ دیا۔ پوچھا۔ ''رتنا بلبیر آیا تھا؟''

وہ بولی، ''ہاں آج ہی سویرے، کیوں پوچھتے ہو؟''

''اس نے تمہیں مدھو کے بارے میں بتایا ہو گا۔''

''نہیں بتایا۔ وہ کون ہے؟''

''وہ ایک لڑکی ہے۔ مدھو اس کا نام ہے۔ میں اس سے شادی کر رہا ہوں''

کچھ دیر کے لیے ایک گہری خاموشی نے ہم دونوں کو آن گھیرا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی۔ وہ کچھ کھوسی گئی تھی۔ پھر دفعتاً ہوش میں آ کر مجھ سے مخاطب ہوئی، ''یہاں ہمارا سفر ختم ہوتا ہے۔'' پھر ہنس کر کہنے لگی، ''یہ پورٹریٹ وقت کے خلاف ایک دوڑ ہے۔ مجھے اسے جلد سے جلد مکمل کرنا ہو گا۔'' پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا، ''ہر جیت۔ مبارک ہو''۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے اپنی جانب گھمایا اور پوچھا، ''رتنا تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پھر کہا، ''رتنا میں آج بھی تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔''

اس کے بعد کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور دلکش رتنا اپنا درد اپنے ساتھ لیے مجھ سے رخصت ہوئی۔

ایک دن بلبیر مچل گیا کہ مدھو سے ملوا دو۔ رتنا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں ایک شام بڑے اہتمام سے ان سب کو شہر کے شاندار قیصر ہند ہوٹل لے گیا۔ مدھو اپنے قیمتی سیاہ لباس میں جیسے کسی اور دنیا سے چلی آئی تھی۔ ہر بار اس پر نظر ڈالتے ہی فخر سے میری چھاتی تن جاتی تھی۔ رتنا بھی اپنے سیاہی مائل نیلے لباس میں بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی پرانی رنگت اور پرانی شادابی لوٹ آئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کا پورا دماغ اس کوشش میں لگا تھا کہ کس طرح اپنی توجہ باری باری ہم تینوں میں تقسیم کر دے اور بلبیر اپنے مخصوص غلط طور پر سلے ہوئے کپڑوں میں ملبوس گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا بالکل آرٹسٹ کی تصویر بنا تھا۔ آج اس کے برتاؤ میں بڑی شائستگی آ گئی تھی۔ وہ مدھو سے بڑے ادب سے ملا اور اس نے موسم کی غیر یقینی صورت پر اس کے ساتھ تبادلہ خیال کیا، جو اس کے لیے بہت بڑی بات تھی اور جسے مدھو نے بہت پسند کیا۔ مختصر یہ کہ میرے دوستوں سے مل کر مدھو کافی خوش نظر آئی اور اس سے ملتے ہی میرے دوستوں نے اسے اپنے اندرونی حلقے میں شامل کر لیا۔ میں فرط مسرت سے ساتویں آسمان کی سیر کرنے لگا۔ میں نے اپنی کرسی ذرا پیچھے گھسیٹ لی اور گفتگو میں مصروف ان تینوں کو یوں تکنے لگا جیسے کوئی موسیقار اپنے آرکسٹرا پر نظر جمائے رکھتا ہے تاکہ جو بھی سر نکلے وہ اپنی جگہ مناسب ہو۔

پھر بلبیر نے اس شام کی پہلی بوتل کا کارک اڑایا اور حیات آور سیال کا پہلا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ کچھ دیر میں سوڈے اور وہسکی کی چھوٹی بوتلوں سے میز بھر گئی اور شراب کی ترش مہک ہوا میں بس گئی

پانچویں پیگ کے بعد بلبیر بہکنے لگا۔ آٹھویں پیگ کے بعد شام کا مہذب بلبیر فضا میں تحلیل ہوگیا اور اس کی جگہ اصلی بلبیر اس کی کرسی پر آبیٹھا۔ دسواں پیگ صاف کرنے کے بعد بلبیر نے اپنی گیلی مونچھوں کو پونچھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انکشاف کیا کہ اس کا باپ مرگیا ہے اور باقاعدہ رونے لگا کہ اب اتنی بڑی دنیا میں اس کا کوئی نہیں اور یہ بتانے کے لیے کہ دنیا کتنی بڑی ہے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک قوس کی شکل میں میز پر پھیلا دیے، کئی بوتلیں اور گلاس ہلکی آواز کے ساتھ فرش پر گر پڑے۔

مدھو، جو بڑھتی ہوئی بے چینی سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی، یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی لیکن بلبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیا اور اپنا شراب آلود منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر کہنے لگا ”بہن جی، میں نے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے“۔

مدھو برا سا منہ بنائے سوالیہ انداز میں اسے گھورنے لگی، ”کہہ ڈالو“

اس نے کچھ اور وہسکی گلاس میں انڈیل لی اور سوڈا ملا کر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ پھر بولا، ”بہن جی، میں ایک بہت بڑے کینوس پر کام شروع کرنا چاہتا ہوں،“ اور ثبوت کے طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھاتا ہوا ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر دو فرضی لکیریں متوازی طور ہوا میں کھینچتا ہوا میز تک لے آیا اور اپنے دونوں ہاتھ میز پر اس نزاکت سے دھر دیے کہ میز کا سینہ دہل اٹھا اور کچھ بوتلیں اور گلاس پھسل کر فرش پر گر پڑے۔

رتنا نے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا، ”بلبیر تمہارا موضوع کیا ہوگا؟“

مگر بلبیر جو مدھو کی طرف متوجہ تھا اسی سے مخاطب ہوا، ”بہن جی، میرا موضوع ہے غیر متحرک زندگی“۔

مدھو نے فرش اور میز پر بکھری ہوئی بے ترتیبی کو ایک نظر دیکھا اور خشک لہجے میں جواب دیا، ”تم متحرک زندگی کی زندہ مثال ہو“۔

اب میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، ”بلبیر ے، مدھو کو اپنا اسٹوڈیو نہیں دکھائے گا؟ کل وہ تیرے اسٹوڈیو آرہی ہے“۔

رتنا بولی، ”آج میں بہت خوش ہوں، کشن گڑھ سے میرے بھائی خوش بخت سنگھ کی چٹھی آئی ہے۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد ادھر آرہا ہے“۔

میں نے دریافت کیا، ”بھلا کیوں آرہا ہے“۔

وہ مسکرا کر بولی، ”میرا بھیا اپنا بیاہ رچانے کی فکر میں ہے“۔

اب ماحول ذرا خوش گوار ہوگیا تھا۔ میں نے بیرے کو اشارہ کیا۔ کچھ ہی دیر میں کھانا میز پر چن دیا گیا۔ کھانے کے دوران زیادہ تر خاموشی رہی۔ کھانا ختم ہونے تک بلبیر ے کا نشہ کچھ کم ہو چکا تھا۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات ڈھلے ہم سب اپنی میز سے اٹھے۔ بلبیر رتنا کو اپنی کار میں چھوڑنے جا رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے اپنا راستہ لیا۔

واپسی پر مدھو سخت ناراض تھی۔ کہنے لگی، ”مجھے تمہارے دوست ایک آنکھ نہیں بھائے“۔

میں نے بلبیر کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا، ”بلبیر اپیا بہت ہے، مگر دل کا زیادہ برا نہیں۔“

”میں صرف اس کی نہیں کہہ رہی۔ اس کی بھی کہہ رہی ہوں“۔

”تمہارا اشارہ رتنا کی طرف ہے؟؟“

”ہاں۔ وہ اپنا نام نہاد آرٹ سب کی آنکھوں کے سامنے یوں نچاتی ہے جیسے ڈگڈگی بجا رہی ہو۔ مجھے یہ مطلق پسند نہیں“۔

”مگر رتنا ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”ایسا سمجھنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں۔“ پھر جیسے اس موضوع پر اپنا قطعی فیصلہ صادر کرتی ہوئی وہ بولی، ”تم ان کی چھٹی کر دو“۔

جب میں واپس ہوا تو میرے پاس سوچنے کو بہت کچھ تھا۔ مگر میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ذہن کو جھٹکنے کی لاکھ کوشش کی مگر ناکام رہا، جب میں بستر پر لیٹا تو سر اس وقت تک بوجھل تھا اور نیند کوسوں دور۔

پہلے پہل میرا خیال تھا کہ میرے دوستوں کے متعلق مدھو کے نظریات عبوری نوعیت کے ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ حقیقت مجھ پر آشکارا ہوئی گئی کہ میں غلط فہمی میں تھا۔ اس کا رویہ نرم پڑنے کے بجائے سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ اسے ان کی ہر اچھی بری چیز سے نفرت تھی انہیں دیکھتے ہی اس کے بشرے میں ایک عجیب تبدیلی آجاتی، اس کے تیکھے نقش تن سے جاتے گویا باقاعدہ جنگ کی تیاری ہو۔ وہ اپنے اندر سکڑ سی جاتی گویا ایک مرض ہے جو اسے لگ جائے گا۔ خصوصاً رتنا کو وہ بڑی حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی۔ اس کے لباس پر فقرے کستی۔ اس کی چال ڈھال پر تنقید کرتی اور اس کے نظریہ حیات کا مضحکہ اڑاتی۔ وہ جب بھی اس سے کوئی سوال کرتی تو فوراً جواب کی خواہاں ہوتی لیکن اگر رتنا پلٹ کر کوئی بات پوچھتی تو یوں چپ ہو جاتی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کی اس آخر الذکر عادت پر مجھے سخت شرمندگی ہوتی۔ میں نے ایک اچھا آدمی ہونے کا دعوا کبھی نہیں کیا لیکن اس قسم کی توہین کر کے ذہنی کوفت اپنے بدترین دشمن کو بھی نہیں پہنچائی۔

میں نے اکثر اپنے دماغ کو کرید کرید کر یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ کیا اس دور میں مدھو سراسر غلطی پر تھی؟ کیا اس میں کسی اور کا کوئی قصور نہیں؟ اور ہمیشہ ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے اور وہ یہ کہ شاید میں اس حد تک قصوروار ہوں کہ میں نے انہیں آپس میں ملنے کے ضرورت سے زیادہ مواقع فراہم کیے اور اس طرح ان کی جنگوں کے لیے خود میدان آراستہ کیا اور مدھو کے حق میں یہ عرض کروں گا کہ اس نے جو بھی روا رکھا وہ ایک خاص سطح پر تھا۔ اس نے کبھی خود کو نہیں گرایا۔

مگر رتنا ایک حساس لڑکی تھی۔ وہ ہوا کا رخ خوب جانتی تھی۔ وہ تیزی سے پورٹریٹ مکمل کرنے میں جٹ گئی۔ اس کے لیے ہماری بیٹھک عموماً شام کو ہوتی۔ اکثر بلبیر بھی آن ٹپکتا اور بالائی منزل پر بیڈ روم سے لگے میرے خوب صورت کشادہ لاؤنج میں پرانے وقتوں کی محفل جم جاتی۔ بلبیر اپنے مخصوص کونے میں جا بیٹھتا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتا، اپنی ڈھیلی پگڑی سنبھالتا، چائے پر چائے منگاتا۔ کبھی کبھی جب وہ آتا تو اس کی بغل میں وہسکی کی ایک بوتل ہوتی۔ میں نے اسے اپنے گھر میں پینے کی پوری آزادی دے رکھی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنی جانب سے اس کی مہمان نوازی میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر وہ آدمی بڑا مکار تھا اور رتنا کے تعلق سے میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتا اور جب بھی میں رتنا کے قریب ہوتا یا اس کے ساتھ کسی آپسی مذاق پر ہنس رہا ہوتا اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی اور وہ واہگورو کے نام کا منتر پڑھنے لگتا۔ رفتہ رفتہ یہ ہوگیا کہ واہگورو کے نام کو میں نے ایک بیرومیٹر کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب تک یہ نام میرے کانوں میں گونجتا، مجھے اطمینان رہتا کہ رتنا میرے قریب ہے اور قریب آتی جا رہی ہے اور دو تین دن مسلسل یہ نام سننے میں نہیں آتا تو مجھے الجھن ہونے لگتی۔

آخر کار ایک دن رتنا کی آنکھوں کا تارا اس کا چہیتا بڑا بھائی خوش بخت سنگھ آہی گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس سے ملاقات سے قبل اس کے بارے میں میری رائے چاہے کچھ بھی کیوں نہ رہی ہو اچھی ہرگز نہیں تھی۔ میرے تخیل میں وہ ایک اڑیل ٹٹو کی حیثیت رکھتا تھا جو میری چاؤ سے بنائی ہوئی دنیا میں قدم بھی رکھنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن جب ملا تو پتہ چلا کہ وہ ایک چوڑا چکلا خوبرو نوجوان تھا جس کے عادات و اطوار میں ایک سلیقہ تھا اور کیوں نہ ہوآخر وہ ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ تھا، پھر بھی مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ اس نے ایک ڈیڑھ سال یونیورسٹی

میں بھی تعلیم حاصل کی ہے، وہ ایک سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا اور ہر سوال کا سوچ سوچ کر جواب دیتا۔ اسے یہ دائمی ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں انصاف کا پلڑا ایک طرف نہ جھک جائے۔ مجھے یہ ایک نفسیاتی کمزوری نظر آئی۔ میں نے طے کیا کہ ضرور بچپن میں ماں باپ کے سخت برتاؤ نے اسے اتنا محتاط بنا دیا ہے۔ تب سے مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی۔ بہر حال جلد ہی وہ ہماری محفل کا ایک لازمی جزو بن گیا اور ہم سب اپنے اصل اور فرضی جھگڑے اس کے دربار میں آخری فیصلے کے لیے پیش کرنے لگے۔

مدھو کو اس سے صرف دو شکایتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ رتنا کا بھائی تھا اور دوسرے یہ کہ جب وہ کرسی پر بیٹھتا تو اپنے دونوں پاؤں اوپر کھینچ لیتا گویا گھٹنوں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ اس کے علاوہ خوش بخت سنگھ بڑا بد بخت سنگھ تھا۔ وہ ایسے کہ جب وہ لاؤنج کے طول و عرض کو پار کر رہا ہوتا تو اس کے پاؤں کسی نہ کسی چیز میں اٹک جاتے اور وہ لڑکھڑا جاتا یا پھر گلدان اس کے ہاتھ کے دھکے سے الٹ جاتا یا چائے کی پیالی ہاتھ سے گر کر چور چور ہو جاتی اور وہ بڑا کمبخت سنگھ تھا کیونکہ ایک بار نہ جانے کس لہر میں میں نے سب کی موجودگی میں رتنا کا ہاتھ چوم لیا تو وہ اتنا بھڑکا کہ پانی سے بھرا گلاس ملازم کے منہ پر کھینچ مارا اور غصے میں اٹھ کر چلا گیا۔ مگر پھر دوسرے دن خود آ کر اس نے مجھ سے معافی مانگی، میرے پاؤں چھوئے اور پھر سے خوش بخت سنگھ بن گیا۔

پھر ایک بار مدھو کہیں سے مشہور فرانسیسی مصور ڈیگاس کی ایک شاہکار تصویر۔۔۔۔ اٹھا لائی۔ یہ تصویر ایک ایسی عورت کی شاندار اسٹڈی تھی جو شاید شباب کے آخری دور سے گزر رہی تھی۔ فریم بھی بہت قیمتی تھا۔ مدھو نے تصویر کی پشت پر لکھا، ”ہر جیت کے لیے مدھو کی جانب سے“ اور اس کے نیچے ”مجھے آج بھی تم سے محبت ہے“ اور اس کے بھی نیچے انگریز ادیب رچرڈ لیویلین کے ناول ”میری وادی کتنی سرسبز تھی“ کا ایک جملہ لکھ دیا، ”کتنی عجیب بات ہے کہ دماغ اتنا کچھ بھول جاتا ہے اور پھر بھی ان پھولوں کی تصویر دماغ میں تازہ رہتی ہے جنہیں مرجھائے تیس برس ہو چکے ہیں، یا اس سے بھی زیادہ۔“

تصویر ہاتھ میں لیے مدھو کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتی پھری۔ پھر خوش بخت سے کہہ کر، جو اس وقت وہاں موجود تھا،۔۔۔ اس نے تصویر کو عین اس میز کے اوپر دیوار پر ٹنگوا دیا جہاں اپنے پورٹریٹ کے لیے مجھے بیٹھنا ہوتا تھا۔

اس شام جب سب اکٹھا ہوئے تو فطری طور پر وہ تصویر ہی موضوع بحث تھی۔ رتنا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، ”بے حد خوب صورت اسٹڈی ہے۔ آہ ڈیگاس! عظیم ڈیگاس!“

بلبیر نے کہا، ”وہ اپنے فن کا استاد تھا۔ میں اس کے صدقے جاؤں“ اور وسکی سے بھرا گلاس منہ سے لگا کر صدقے جانے لگا۔

پھر رتنا نے پوچھا، ”مگر اسے یہاں کس نے ٹانگا ہے؟“

خوش بخت نے، جو اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا ہوا تھا، اپنے گھٹنوں کے اسپرنگ سیدھے کیے اور پاؤں فرش پر ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا، بولا، ”میں نے ٹانگی ہے۔ کیوں؟“

رتنا نے جواب دیا، ”نہیں، بس یوں ہی پوچھا تھا۔“

مدھو ایک طرف کھڑی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ مگر منہ سے نہیں بولی۔ پھر رتنا نے برش تھام لیا اور میں نے اپنی متعینہ جگہ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لی اور ”ارسطو کے چند بنیادی نظریات“ کو معمول کے مطابق کھول کر میز پر رکھ لیا۔

رتنا کچھ دیر تک پینٹ کرتی رہی پھر سر پکڑ کر بولی، ”ہر جیت، یہ جو ڈیگاس کی تصویر تمہارے چہرے کے پس منظر میں لگی ہے۔ اس سے مجھے کچھ ڈسٹریکشن سا ہوتا ہے۔“

اس کا بھائی آگے بڑھا مگر کسی چیز سے ٹکرا کر لڑکھڑا گیا۔ خود کو سنبھالتا ہوا بولا، ”لاؤ میں سے ہٹا دوں۔“

یکایک مدھو جیسے میدان جنگ میں کود پڑی۔ تصویر پر ہاتھ رکھ کر بولی، ”یہ یہیں رہے گی۔“

بلبیر نے گلاس منہ سے ہٹاتے ہوئے لقمہ دیا، ”واہگورو۔ واہگورو۔“

میں نے میز کھینچ کر دوسری جگہ دیوار سے سٹا دی اور وہاں بیٹھ کر رتنا سے کہا، ”اب تمہیں کوئی ڈسٹریکشن نہیں ہوگا۔“

مگر اس معمولی واقعے نے سب کے منہ کا مزا بدل سا دیا۔ زندگی! کتنی عجیب ہو تم! اتنی معمولی چیز اور اتنا بکھیڑا! کیسی بے ہودہ بات ہے! مجھے تم سے نفرت ہے!

پھر تین چار دن رتنا کی شکل نہیں دکھائی دی۔ میں نے اس سے ملنا چاہا تو کمبخت سنگھ نے روک دیا۔ بولا، ”اس کے سر میں درد ہے اور ہلکا بخار بھی ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ رتنا کے فراق میں بلبیرا جیسے یتیم ہو گیا۔ ایک رات تیسرے پہر تک وہ کسی کلب کے بار میں بیٹھا شراب کے جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ جب بار بند ہونے لگا تو وہ تقریباً بے ہوش تھا۔ لوگوں نے اسے اٹھا کر باہر اس کی کار میں پٹک دیا۔ جہاں وہ رات بھر برفیلی ہوا میں ٹھٹھرتا رہا۔ پھر سویرے ہی سویرے کار لے کر میرے پاس چلا آیا اور مجھے جگا دیا۔ اس کا چہرہ پھولا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے گاڑھی گرم چائے پلائی۔ مگر اس نے قے کر دی۔ پھر وہ میرے بیڈ روم میں اس کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا جو شمال مغربی سمت میں کھلتی تھی اور جدھر رتنا کا گھر تھا۔ اس کے کندھے کچھ جھک سے گئے تھے اور کھڑکی کی سلاخوں کو تھامے رتنا کے گھر پر ٹکٹکی جمائے وہ یاس کی تصویر نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے ناشتے کے متعلق ملازم کو ضروری ہدایات دیں اور آفس چلا گیا۔

کوئی دو بجے جب میں واپس ہوا تو دیکھا کہ بلبیرا اسی کھڑکی کے پاس ٹھیک اسی حالت میں کھڑا تھا جس حالت میں میں نے اسے صبح چھوڑا تھا۔ میں نے اس کا منہ دھلا کر کھانا کھلایا اور سمجھا بجھا کر اسے اس کے اسٹوڈیو واپس بھیج دیا۔

وہ دن کچھ خالی خالی سے لگتے تھے اور جیسا کہ انگریزی میں کہاوت ہے۔ وقت اپنے دونوں سروں پر ڈھیلا ڈھیلا لٹک رہا تھا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں مدھو بیٹھی تھی، اپنی شکایتوں کے ساتھ۔ یکایک مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ ساری غلطی میری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ سب کو ایک دوسرے سے الجھا دیا تھا۔ مدھو ایک پیاری لڑکی تھی۔ کیا کہتی تھی وہ؟ دماغ سب کچھ بھول جاتا ہے مگر تیس برس قبل مرجھائے ہوئے پھولوں کی یاد تازہ رہتی ہے۔ یہ دیکھو۔ تم سے ملے پورے پانچ دن ہو گئے اور میرے دماغ میں آج بھی تمہاری یاد تازہ اور یہ دیکھو تمہارا نامراد ہر جیت تمہارے کوچے کی خاک چھان رہا ہے اور یہ دیکھو، اب وہ تمہارے در پر سجدہ کر رہا ہے اور اب اٹھ کر دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

جب مدھو نے دروازہ کھولا تو سخت خفا تھی، مگر میں نے اس کی منت سماجت کی، اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور سر جھکایا، اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور اس کی گلی کی خاک اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لی اور یوں میں نے اسے منا لیا۔ پھر میں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور بہت احتیاط سے ٹائی کی گرہ باندھی کہ کہیں غلط گرہ سے مدھو پھر نہ روٹھ جائے اور اسے جوہری بازار لے گیا اور پہلے ٹوپاز کی ایک بیش قیمت انگوٹھی خرید کر دی۔ پھر ہم نے ایک ساتھ ایک رومانی اطالوی فلم دیکھی اور وہاں سے نکل کر ایک دور افتادہ مقام پر ایک ساتھ چائے پی اور میں مدھو کو بتایا کہ مجھے صرف پندرہ دن کا وقت درکار ہے اور وعدہ کر لیا کہ ان پندرہ دنوں میں میں ان کے چھٹی کر دوں گا مگر شرط یہ رکھی کہ یہ پندرہ دن وہ مجھ سے اور میرے گھر سے دور ہی دور رہے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ وہ مان گئی اور ہم خوشی خوشی شہر کی جانب لوٹ آئے۔

اسی درمیان بلبیر کے باپ کی طبیعت پھر بگڑ گئی

اور وہ لدھیانے چلا گیا مگر اب کے کچھ ہی دن میں لوٹ آیا اور اس نے بتایا کہ واہگورو کی مہربانی سے اس کے باپ کی طبیعت پھر سنبھل گئی ہے۔ پھر کمبخت سنگھ کو گالی دے کر رتنا کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے انکشاف کیا کہ اب وہ رتنا کو اس جیل سے نجات دلا کر ہی دم لے گا۔

شاید مدھو سے کیے ہوئے میرے وعدے کا گیارہواں دن تھا۔ اس دن جب آفتاب طلوع ہوا تو مجھے گمان تک نہ تھا کہ قدرت میری بربادی کے کیا سامان کر رہی ہے۔ اس شام بلبیر اوہسکی کی چار بڑی بڑی بوتلیں بغل میں دبائے، رتنا کو اپنے پیچھے کھینچتا، میرے لاؤنج میں چلا آیا۔ کمبخت سنگھ بھی چار و ناچار ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ آتے ہی بلبیر انے رتنا کو ایک صوفے پر دھکیل دیا اور میری جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے لہک کر اعلان کیا " آج دادن جشن دادن اے"

میں رتنا کے قریب جا کھڑا ہوا اور جھک کر اس کے چہرے کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ بالکل ویسی ہی دلکش اور جوان تھی۔ وہی لاخیالی کا عالم تھا اور وہی مہربان آنکھیں۔ چونکہ جس بات پر وہ روٹھی تھی وہ بہت معمولی اور غیر اہم تھی اس لیے اب وہ شرما رہی تھی۔ مجھے بس سرور آ گیا۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے چلا کر کہا، "بلبیر ے جشن مبارک ہو۔"

میرے کہنے کی دیر تھی کہ ملازم نے بہت ساری سوڈے سے بھری بوتلیں اور ڈھیر ساری برف لا کر رکھ دی اور پھر بلبیر ے نے بوتل سامنے رکھ کر اسے سجدہ کیا۔ اور پھر واہگورو کا نام لے کر پہلی بوتل کا کارک اڑایا اور پھر دوسری بوتل کا اور پھر تیسری بوتل کا۔ میری دانست میں میں آج ان سب سے آخری بار مل رہا تھا کیونکہ مدھو سے کیے ہوئے وعدے کے بموجب اب مجھے چار دن کے اندر ان سب کو خیرباد کہنا تھا۔ اس لیے میں نے بھی وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے جام تھام لیا اور پھر جام سے جام ٹکرانے لگا۔ بلبیر ے نے زبردستی کر کے خوش بخت سنگھ کے حلق میں بھی کچھ انڈیل دی اور اسے لے کر ناچنے لگا اور ساتھ ہی وارث شاہ کا کوئی راگ بڑی سریلی آواز میں الاپنے لگا مجھے سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ رتنا کہیں سے سگریٹ اور لائٹر اٹھا لائی۔ میں سگریٹ سلگا رہا تھا کہ اس کی آواز کانوں میں گونجی، "ہرجیت تم بہت پی گئے ہو"۔

میں بمشکل تمام اس کی طرف مڑا اور نشے کے دھندلکے میں اس سے مخاطب ہوا، "رتنا میں نے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے میں تمہارا قصوروار ہوں۔ مجھے معاف کرنا۔

اس کی آواز بھرا گئی۔ بولی، "کیا کہتے ہو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ تم آباد رہو اور بس" پھر دفعتاً جیسے کچھ یاد کر کے بولی، "ہرجیت لاؤ میں تمہارا پورٹریٹ پورا کر دوں۔ اب صرف آخری کچھ ٹچ دینے باقی ہیں"۔ پھر مجھے سر سے پیر تک گھور کر بولی، "مگر کیا تم اس قابل ہو کہ کچھ دیر اس میز کے پاس جا کر ٹھیک سے بیٹھ سکو؟"

میں نے سینہ ٹھونک کر کہا، "ہاں رتنا۔ یہ میں کر سکتا ہوں"۔

اور سچ مچ میں میز کے پاس جا بیٹھا اور میں نے "ارسطو کے چند بنیادی نظریات" کو اپنے سامنے کھول لیا۔ رتنا کینوس کے قریب جا کھڑی ہوئی اور اس نے رنگ ملا کر برش ہاتھ میں لے لیا اور انہماک سے پینٹ کرنے لگی۔ بلبیر ا اب بھی ناچ رہا تھا اور اس کا وارث شاہ ابھی تک زندہ تھا۔ مگر خوش بخت سنگھ نے تھک کر اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ایک کونے میں پڑا گھٹنوں کے اسپرنگ دبائے ہانپ رہا تھا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگا۔ بیچ بیچ میں بلبیر ابھرا ہوا جام میری طرف بڑھا دیتا جو میں غٹاغٹ پی جاتا۔ دھیرے دھیرے قیمتی تمباکو کے دھوئیں کے بوجھ سے فضا بوجھل ہو گیا ور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور مدھو لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور خاموش کھڑی صورت حال کا جائزہ لینے لگی میں نے غنودگی سے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس نے خوب صورت ہرے سلک کی وہ ساری زیب تن کر رکھی تھی جو ایک زمانے میں ہم نے خریدی تھی۔ ساری اس کے جسم سے چپک کر اس کے پوشیدہ حسن کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کے خاص انداز سے سنوارے ہوئے سیدھے سیاہ بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک پریشان زلف اڑ کر چہرے پر چلی آتی اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اسے پیچھے ڈھکیل دیتی۔ اس کے کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں چمک رہی تھیں اور گلے میں سونے کا خوب صورت ہار آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا تھا۔ اس کی انگلی میں ٹوپاز کی وہ بیش قیمت انگوٹھی تھی جو میں نے اسے تحفے میں دی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے کپڑوں پر بلکہ شاید اپنی جلد پر بھی کوئی عجیب خوشبو اسپرے کر رکھی تھی کیونکہ جب وہ وہ ہلکی سی جنبش کرتی، ایک تیز مہک چاروں طرف پھیل جاتی۔

مدھو کی آمد کے ساتھ ہی ایک سناٹا چھا گیا۔ وہ پہلے تو دروازے کے پاس چپ چاپ کھڑی غور سے مجھے دیکھتی رہی، پھر دھیمے دھیمے چلتی میرے قریب آئی اور میرا منہ سونگھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ کینوس کے قریب آ گئی اور اس نے رتنا کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور اس کے گرد ایک چکر لگایا، پھر بلبیر کی باری آئی۔ وہ وارث شاہ کو بھول کر منہ کھولے حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ مدھو نے اسے دیکھ کر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ پھر ایک اچٹتی نظر خوش بخت سنگھ پر ڈالی، چاروں طرف پھیلے ہوئے دھوئیں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور اسی طرح آہستہ آہستہ چلتی ایک بند کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس کے پٹ اتنے زور سے کھول دیے کہ اس میں سے ایک کا شیشہ الگ ہو گیا۔

اس عمل کے بعد مدھو نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھرنے لگی۔ پھر وہ پلٹی اور اس نے پرسکون آواز میں مجھ مخاطب کیا، "ہرجیت۔ مجھے افسوس ہے کہ یوں اچانک چلی آئی" پھر گلے پر ہاتھ رکھ کر بولی، "ایک منٹ کے لیے میری سانس رک سی گئی تھی اور مجھے چکر آنے لگے تھے"۔

میں بت بنا بیٹھا رہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دفعتاً مدھو فرط جوش سے بے قابو ہو گئی اور چلا کر بولی، "ہرجیت۔ مجھے تم پر شرم آتی ہے۔"

اب میں نے زبان کھولی اور آہستہ سے کہا، "مدھو۔ آج تمہاری یہاں پر موجودگی میرے لیے باعث حیرت ہے۔"

"ہاں مگر شکر ہے کہ میں آج یہاں موجود ہوں۔"

"تم کس کا شکر ادا کر رہی ہو؟"

"خدا کا" پھر بڑھتے ہوئے جوش سے کپکپانے لگی، "میں جانتی ہوں۔ خدا کی ذات کی تمہارے دل میں کوئی اہمیت نہیں۔ تم صرف اپنے حیوانی جذبات کے غلام ہو۔"

"تمہیں علم ہے میں اکثر خدا کو یاد کیا کرتا ہوں"

"ہاں، مگر صرف طنز سے۔ کیونکہ وہ تمہارے اچھے برے ارادوں کی راہ میں آڑے آتا ہے۔"

اس موقع پر بلبیر ے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "میں تو روز جپ جی کا پاٹھ کیا کرتا ہوں"

مدھو بپھر کر اس کی طرف پلٹی، "تم؟ تمہیں میں خوب جانتی ہوں۔ تم شراب میں زندگی گھول سکتے ہو۔ مگر اس کے آگے پورے صفر ہو۔"

میں نے کمزور آواز میں احتجاج کیا، "مدھو تم آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں"۔

لیکن اس نے مجھے سراسر نظر انداز کر دیا۔ چیخ کر بولی، "تم سب کھوکھلے انسان ہو۔ تم سب اپنے مقام سے گر چکے ہو۔ ہزاروں برس کے انسانی ارتقا و بھلا دیا ہے تم نے اور اپنی وقتی خوشی کو فلسفے کا روپ

دے کر من مانی کرنے میں لگے ہو۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی اور رونے لگی، "کاش میں تم سے کبھی نہ ملی ہوتی۔"

اس کے رونے سے سب کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ طوفان سر سے گزر چکا ہے اور اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال چکی تو اس نے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔ وہ بظاہر تھک گئی تھی۔ اس نے دوبارہ پلٹ کر کھڑکی کی جانب رخ کیا اور کہنیوں پر سر ٹکائے سیاہ افق پر نظریں جما دیں۔

میں نے ہولے سے کہا تاکہ مدھو نہ سن سکے، "بلبیر، رتنا مجھے اس واقعے کا سخت افسوس ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

مزید کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے ماحول کو گوارہ بنانے کے لیے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا، "رتنا۔ تم میرا منہ کیا تک رہی ہو؟ میں آج تمہیں یوں نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں یہ پورٹریٹ آج ہر حالت میں مکمل کرنا ہوگا۔"

پھر رتنا بھی جیسے اس کھیل میں شریک ہوگئی۔ اس نے برش تھام لیا اور ہنس کر بولی، "بلبیر۔ تم مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ کہاں کہاں ٹچ کرنا ہے۔"

بلبیر اس کی طرف بڑھ آیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ مدھو سیدھی کھڑی ہو کر ایک قوس کی شکل میں گھوم گئی اور تیر کی تیز رفتاری سے رتنا کی طرف لپکی اور برش اس کے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ رتنا کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ دفعتاً بلبیر ے کا دماغ پھر گیا۔ اس نے مدھو کا بازو تھاما اور بے رحمی سے مروڑتے ہوئے اسے اتنے زور سے ایک جانب جھٹک دیا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ شیرنی کی طرح بپھر کر پلٹی اور سوڈے کی ایک بھری ہوئی بوتل بلبیر ے کے سر پر کھینچ ماری۔ دوسرے ہی لمحے ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور بلبیر ے کے سر سے خون بہنے لگا۔ بلبیرا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے فرش پر بیٹھ گیا۔ مدھو نے، جو غصے سے بے قابو ہوئی جاتی تھی، ایک بڑا برش اٹھا لیا اور سیاہ پینٹ میں ڈبو کر کینوس کی طرف بڑھی ہی تھی کہ میں نے اسے جا لیا۔

یہ سب کچھ اس سرعت سے ہوا تھا کہ بدبخت سنگھ دیکھتا ہی رہ گیا، پھر جب معاملہ سمجھ میں آیا تو اپنی بہن کو تسلی دینے لگا۔ اب رتنا کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مدھو بھی رونے لگی۔ میں گنگ احمق کی طرح کبھی ادھر دیکھتا، کبھی ادھر۔ بڑی دیر بعد بلبیر نے سر اٹھایا اور بولا، "واہگورو، واہگورو"

میں لپک کر اس کے پاس جا پہنچا اور پوچھا "بلبیر ے ٹھیک تو ہے؟"

اس نے جواب دیا، "کچھ ہو تو پلا دے۔"

اس رات جب میں سب کو اپنے ٹھکانے لگا کر واپس ہوا تو دل اندر ہی اندر مسوس رہا تھا۔ رہ رہ کر مدھو کا خیال آتا تھا۔ تم جو بھی تھیں، میں نے تم سے عشق کیا تھا۔ مگر تم نے اسے میری وحشت جانا۔ کاش کہ تم نے مجھے صحیح طور پر آزمایا ہوتا۔ مگر شاید تم قدرت کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ میں تم سے شکوہ نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ کچھ دن بعد جب میں نے پھر ایک بار تمہارے دروازے پر دستک دی اور کسی نے لا کر میری دی ہوئی انگوٹھی مجھے واپس کی تو میں نے اف تک نہ کی اور جب میرے دریافت کرنے پر کسی نے بتایا کہ تم اجمیر چلی گئی ہو تو میں نے آہ بھری تمہارے یوں اچانک چلے جانے کا مجھے کوئی گلہ نہیں، کوئی گلہ نہیں۔ تمہاری دی ہوئی ویگاس کی حسینہ آج بھی میرے پاس ہے اور آج بھی مجھے عزیز ہے۔

اس واقعے کے بعد میری رتنا سے صرف ایک ملاقات ہوئی اور وہ بھی تب ممکن ہو سکی جب تین ہفتے بعد کمبخت سنگھ کشن گڑھ واپس چلا گیا۔ وہ جس لڑکی سے بیاہ رچانے کی سوچ کر آیا تھا وہ اسے پسند نہیں آئی اور اس پر اس کے باپ ہوشیار سنگھ نے اسے

ڈانٹ پلا کر واپس بھیج دیا تو جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اس کے بعد ہی میں رتنا سے مل سکا۔ مگر اس سے مل کر مجھے الجھن ہی ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک اجنبی رتنا تھی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت روکھا برتاؤ کیا۔ چند ہی منٹ میں ہماری گفتگو ختم ہوگئی۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا اور وہ اداس لہجے میں کہنے لگی، "جو بھی ہوا ہو۔ ہمارے درمیان اب ایک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اسے عبور کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے، اس لیے آخری بار خیر باد۔"

میرا گلا رندھ گیا۔ میں نے جواب دیا۔ "رتنا خدا تمہارا حافظ ہو"

اس کے بعد راہ چلتے دو ایک بار وہ مجھے بلبیر سنگھ کے ساتھ دکھائی دی مگر میں نے اس کا راستہ نہیں کاٹا۔ پھر جلدی ہی وہ شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر میں نے ایک اڑتی ہوئی خبر سنی کہ وہ کہیں کسی آرٹ گیلری میں ملازمت حاصل کرنے کی فکر میں ہے اور اس طرح رتنا پانچویں خانے سے پھدک کر چوتھے خانے میں جا بیٹھی۔ بعد کی اس کی مصروفیات کا مجھے علم نہیں۔

البتہ بلبیر سنگھ سے میری چند ملاقاتیں ضرور ہوئیں۔ وہ اب بھی بلانوش تھا اور کبھی کبھی میرے پاس آ کر چائے کی خواہش کرتا۔ ہم بیٹھے اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے۔ رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ اس کی مانوس شکل نمودار ہوتے ہی مجھے کوفت ہونے لگتی۔ آخر کوئی چھ ماہ بعد جب اس نے واہگورو کا نام لے کر تخت شاہی والی اپنی اسٹوڈیو کی جگہ فروخت کر دی اور اپنے بیمار باپ کے پاس لدھیانے چلا گیا تو جیسے ایک بوجھ میرے سر سے اتر گیا۔ اب گزشتہ دنوں کے سائے دور ہو چکے تھے اور ساتھ ہی میری فطری زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

پھر ایک دن اجمیر سے چچازاد بھائی نے مجھے ایک ملامت آمیز خط لکھا کیونکہ مدھو کے ساتھ میرے سلوک کی وجہ سے اس کی بیوی اس سے سخت ناراض تھی۔ ساتھ اس نے مجھے اطلاع دی کہ مدھو کی شادی ایک جگہ طے ہو چکی ہے اور اس خط کے ساتھ ہی مدھو چوتھے خانے سے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تیسرے خانے میں چلی گئی۔

کوئی ڈیڑھ برس بعد رتنا کی ماں نے کھاٹ پکڑ لی اور برسوں کے ریاض کا خمیازہ بھگتتے اس جہان سے رخصت ہوئی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ جہنم کی آگ میں جلتی جب وہ مالا ہاتھ میں لیے تلسی کا جاپ کرتی ہوگی تو چاروں طرف سے شیطانی روحیں دوڑ دوڑ کر اس کے اطراف جمع ہو جاتی ہوں گی۔ کچھ عرصہ بعد بوڑھا ہوشیار سنگھ بھی آخری بار مہاراجہ کے بچے کھچے دربار میں کورنش بجا لایا اور چل بسا۔ بدبخت سنگھ نے کشن گڑھ سے آ کر اس کا کریا کرم کی اگر اس کی بہن نہیں آئی۔ پھر سمجھدار بیٹے نے اپنے باپ کا مکان کرائے پر اٹھا دیا اور جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ گیا۔

بے رحم وقت اپنی چال چلتا رہا۔ آسمانوں نے یہ ستم کیا کہ میں نے شادی کر لی مجھے زندگی سے نفرت تھی اور اس کا اظہار میں نے اس طرح کیا کہ کبھی زندگی کی پروا نہیں کی۔ مگر اس نے ہمیشہ میرا تعاقب کیا۔ میں آگے ہوتا اور وہ میرے پیچھے۔ اس درمیان کئی عورتوں نے میری دنیا میں قدم رکھا۔ برسہا برس گزر گئے اور نو برس بعد میں بھوانی سنگھ اسٹریٹ پر واقع اپنے اسی خوب صورت مکان کی دوسری منزل پر بیڈ روم میں لیٹا گرم چائے اور تازہ اخبار سے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ میری بیوی دہلی گئی ہوئی تھی اور میرے سامنے دو خط پڑے تھے، ایک خط میں میری بیوی نے لکھا تھا کہ وہ ایک ہفتہ بعد لوٹے گی اور دوسرے خط میں رتنا نے لکھا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ تم آج تک مجھے نہ بھول سکیں۔ ایک دفعہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہو چکی ہے اور اسے عبور کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ پھر آج یہ اچانک تمہیں کیا سوجھی۔ ٹھہرو میں بتاتا ہوں۔ یہ وقت کی ایک سازش ہے۔ تم جس چیز کو پکڑنا چاہو وہ چھو کہہ کر غائب ہو جاتی ہے اور جس چیز سے دور بھاگنا چاہتی ہو وہ چمن سے نمودار ہو کر تمہیں آ دبوچتی ہے۔ ضرور تم

نے مجھے بھلانے کے جتن کیے ہوں گے۔ ہزار بار میری قبر پر فاتحہ پڑھا ہوگا مگر میں بے شرم کفن پھاڑ کر تمہارے سامنے آکھڑا ہوا اور پھر تم مجبور ہوگئیں۔ مگر شاید تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم آج بھی عزیز ہو۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوں۔ ذرا دیکھوں تو تم نے مجھے کیا کچھ لکھا ہے۔

میں نے رتنا کا خط اٹھالیا اور شاید چودھویں بار پڑھنے لگا۔ لکھا تھا، ’’ہر جیت۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو، میرا نام رتنا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ ہم نو برس پہلے ملے تھے اور پھر کچھ ناگوار حالات میں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے۔ آج کل میں اودے پور میں رہتی ہوں اگر ممکن ہو تو یہاں آکر مجھ سے ملو۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔ تمہاری رتنا‘‘۔

میں نے خط رکھ دیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ بہار کا موسم اپنے شباب پر تھا اور لان پر نرم سبزے کی ایک موٹی چادر بچھ گئی تھی اور ہوا میں پھولوں کی مہک تھی اور آسمان نیلا تھا۔۔۔ دور افق کے پاس کھڑی رتنا میرا انتظار کر رہی تھی۔ سوچنے کا مقام نہیں میں نے ایئر پورٹ فون کیا تو معلوم ہوا کہ آج کی اودے پور کی فلائٹ ٹھیک وقت پر نو بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہو چکی ہے۔ میں نے فوراً اگلے دن کے لیے ایک سیٹ بک کرالی اور رتنا کو تار بھیج دیا۔

اودے پور نیلی جھیلوں کا شہر ہے جنہیں چاروں طرف سے سرسبز پہاڑیوں نے گھیر رکھا ہے اور ان سے پرے سینکڑوں میل تک طویل و عریض ریگستان ہے۔ میں وہاں سویرے کے ٹھیک گیارہ بج کر بیس منٹ پر وارد ہوا اور میں نے سیدھے پچولہ جھیل کا رخ کیا اور جھیل کے ساحل پر ایک جگہ کھڑے ایک موٹر بوٹ میں بیٹھ کر اس چھوٹے جزیرے کے طرف چل دیا جو جھیل کے شمال مغربی خطے میں واقع ہے۔ اس جزیرے میں عہد وسطیٰ کے مہاراناؤں نے اپنا محل تعمیر کیا تھا لیکن آج کل یہ ہوٹل لیک پیلس کہلاتا ہے۔ ہوٹل پہنچ کر ضروری مندرجات کے بعد پہلی منزل پر واقع اپنے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے مقفل کر کے سو رہا۔ کوئی چھ بج رہے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ ہلکی تاریکی جھیل کی لہروں پر تیرتی میرے کمرے میں گھس آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر غسل کیا اور اپنے اطراف کی مناسبت سے ایک گہرا نیلا سوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔

اب گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ لیکن ہوٹل کا وسیع لاؤنج دن کی طرح روشن تھا۔ لوگ دبیز سبز قالین پر دبے قدموں ادھر ادھر آجا رہے تھے کچھ لوگ ایک چھوٹے گروپ کی شکل میں کھڑے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کچھ ریلنگ پر جھکے جھیل کا نظارہ کرتے ہوئے تمباکو پی رہے تھے۔ ایک غیر ملکی جوڑا ایک کیوریو شاپ میں ماضی کی خاک چھان رہا تھا کہ شاید کوئی گوہر ہاتھ لگ جائے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور ٹہلنے لگا۔

ٹھیک سات بجے دلکش رتنا مسکراتی ہوئی چلی آئی تو میں نے اسے کوئی رسمی بات کہنے کا موقع نہیں دیا اور فوراً اس کا نرم بازو تھام کر فلورسٹ کے پاس لے گیا اور اس سے دریافت کیا، ’’یہ پھول اصلی ہیں یا کاغذ کے؟‘‘

فلورسٹ ہنس پڑی۔ بولی، ’’دونوں‘‘ پھر کچھ رک کر اس نے کہا، ’’مگر کاغذ کے پھول کچھ زیادہ قیمتی ہیں‘‘۔

میں نے کہا ’’کتنی عجیب بات ہے‘‘

وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہوئی بولی، ’’جی ہاں جناب، یہی زندگی کا تضاد ہے‘‘۔

مجھے اس کا جواب بہت پسند آیا۔ میں نے کہا، ’’مجھے صرف ایک اصلی پھول درکار ہے‘‘۔

فلورسٹ نے ایک نظر رتنا پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے ایک نیلا گلاب کلپ کیا رتنا نے لاشعوری طور پر اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر فلورسٹ شرارت سے پیچھے ہٹ گئی اور پھر رتنا کے گرد گھوم کر اس کی پشت پر جا کر کھڑی ہوئی اور اس نے کمال خوب صورتی سے نیلا گلاب اس کے بالوں میں لگا دیا۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اپنے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر ہم

دونوں کو دوستانہ انداز میں دیکھنے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر رتنا کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑلیا۔ اور غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اس پر وقت کا سایہ تک نہیں پڑا تھا، وہی رنگ روپ تھا، وہی مہربان آنکھیں تھیں، وہی بھرا بھرا بدن تھا۔ بس وہ بے خیالی کا عالم نہیں تھا اور حرکات میں وہ بے چینی نہیں تھی اور لباس میں سلیقہ آگیا تھا۔ اس نے ایک سیاہ ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر نیلے پھول کھلے ہوئے تھے اور اس کے کٹے ہوئے خوش نما بالوں میں وہ نیلا گلاب غضب ڈھا رہا تھا۔ تم اس وقت کتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس وقت میں نے تمہیں نہیں بتایا لیکن آج بتا دوں کہ مجھ سے حسن کا نظارہ برداشت نہیں ہوتا۔ جگر میں ایک خلش سی ہوتی ہے اور دل میں درد جاگتا ہے۔ اس دن تمہیں دیکھ کر یہی کچھ ہوا۔ میرے اندر ایک دھواں سا اٹھنے لگا اور قبل اس کے کہ میں اپنے آپ کو سنبھالتا میری آنکھیں پرنم ہوگئیں اور فرط جذبات سے بے قابو ہو کر میں گھٹنوں پر تمہارے قدموں میں جھک گیا اور تڑپتے ہونٹوں سے تمہارے دائیں ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور تم حیران ہوگئیں۔ تم نے شرم سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی فلورسٹ ہمدردانہ انداز میں ہمیں گھورنے لگی اور وہیں تمہارے قدموں میں جھکے میں سوچنے لگا، کاش کہ نو برس پہلے تم نے مجھے یوں اکیلا نہ چھوڑا ہوتا، مجھے اپنے دامن میں پناہ دی ہوتی۔ مگر میں نے بھی کون سا قصہ چھیڑ دیا۔ آج یہ ایک بے کار سی بات ہے۔ پھر بھی اتنے دن تم کہاں رہیں؟ اتنے دن تم پر کیا گزری؟

میں نے اپنا ذہن جھٹک دیا۔ فلورسٹ کو پھول کی قیمت چکائی، اس کا شکریہ ادا کیا اور رتنا کا ہاتھ پکڑے اسے باہر لے آیا۔

باہر لاؤنج میں اب کچھ زیادہ بھیڑ ہوگئی تھی۔ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کا ایک جمگھٹ تھا۔ ایک خوش گوار دبا دبا شور اٹھ رہا تھا۔ ہوٹل کے خادم اپنی روایتی وردی پہنے بھاگ بھاگ کر اپنے مہمانوں کی خدمت کر رہے تھے۔ ہم دونوں ریلنگ کے پاس پڑی ایک خالی میز کے گرد جا بیٹھے۔ ہمارے پیروں سے کچھ ہی فٹ نیچے، ریلنگ کے اس طرف، جھیل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جھیل خاموش تھی۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر ایک ہلکی لہر نمودار ہو کر ہماری سمت بڑھ آتی مگر ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا جب وہ ریلنگ سے ٹکرا کر ہلکا سا احتجاج کرتی ہوئی بکھر جاتی۔ رتنا نے انگلی سے میز پوش پر ’’ایچ‘‘ کا نشان بنایا اور سر جھکائے جھکائے پوچھنے لگی، ’’ہر جیت۔ تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟‘‘

میں نے جواب دیا۔ ’’ہاں‘‘

’’تمہارے نصیب اچھے ہیں۔ مگر میں خوش نہیں‘‘۔

’’تم دوسری مٹی کی بنی ہو‘‘۔

’’اس کی وضاحت کرو‘‘۔

میں نے میز پر آگے جھک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور جھنجوڑتا ہوا بولا،

’’ایک زمانہ تھا جب تم مجھے ایک سطحی آدمی سمجھتی تھیں‘‘۔

’’مجھے یاد ہے‘‘

’’مگر تمہیں یہ یاد نہیں تھا کہ تمہارا خیال غلط تھا۔ تم نے ہمیشہ زندگی کے ساتھ بڑی سنجیدگی کا برتاؤ کیا۔ تم نے ہمیشہ زندگی میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ان ہی دنوں اندیشہ ہو چلا تھا کہ تم بربادی کے راستے پر گامزن ہو۔ میں سمجھ گیا کہ تم غموں سے دوچار ہونے جا رہی ہو۔ مگر شاید یہی تمہارا نصیب تھا۔ میں کچھ نہ کرسکا‘‘۔

’’تمہیں میری بدنصیبی پر افسوس ہے؟‘‘

’’مجھے کوئی افسوس نہیں۔ یہ اونٹ اسی کروٹ بیٹھنے جا رہا تھا۔‘‘ پھر ریگستان کے بیچوں بیچ بیٹھے ہوئے اونٹ کے ذکر کا سوچ کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اس سے کہا، ’’شاید یہ سن کر تمہیں سکون ہو کہ تم نے جو بھی کیا اپنی مرضی سے کیا، کسی کے دباؤ میں نہیں کیا۔‘‘

''پھر ایک بار میں سمجھی نہیں''۔

میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کا کندھا آہستہ سے دبایا اور نرم لہجے میں کہنا شروع کیا، ''رتنا اگر کوئی اپنا مقدر آپ نہ بنا سکے تو اسے اتنا غم نہیں ہوتا لیکن اگر کسی اور نے آ کر اس کی دنیا میں آگ لگا دی ہو تو وہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ تمہیں یہ اطمینان تو ہے کہ اپنی دنیا کو آگ میں تم نے خود اپنے ہاتھوں سے جھونکا ہے''۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو غیر یقینی انداز سے دیکھا اور ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی، ''لو مجھے سکون ہو گیا۔ اب مجھے کچھ چائے پلوا دو۔''

میں نے چائے منگائی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی مجھے بلبیر یاد آ گیا میں نے اس سے پوچھا ''رتنا کیا تمہیں بلبیر کی کوئی خبر ہے؟''

اس کا چہرہ کچھ زرد پڑ گیا۔ تڑپ کر بولی، ''میری ایک گزارش ہے تم اس کا ذکر اسی وقت کرنا جب میں اس کی اجازت دوں''۔

میں نے کہا، ''پھر یہ بتاؤ کہ ان برسوں میں تم پر کیا گزری''

''میں ایک عرصے تک ایک آرٹ گیلری میں اسسٹنٹ کیوریٹر کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ پھر میرا ان لوگوں سے جھگڑا ہو گیا میں نے انہیں دنوں کمرشل آرٹ کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ میں نے وہ نوکری چھوڑ دی اور ایک کمرشل آرٹ اسکول میں پڑھانے لگی۔ پھر میں نے بغیر کسی وجہ کے اسکول بھی چھوڑ دیا اور ادے پور چلی آئی کیونکہ یہاں میری ایک چاچی رہتی ہے۔ اب بھی کمرشل فیلڈ میں مجھے کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا ہے لیکن کام کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ میرا بھائی خوش بخت سنگھ مجھے بہت چاہتا ہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا ہے۔ مجھے تنگ دستی کا شکار کبھی نہیں ہونا پڑا۔''

یہ ماجرا سن کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''میں سمجھ رہا تھا تم پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اب جا کر معلوم ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

وہ بولی۔ ''اب تم ضرور غلطی پر ہو، میں سچ مچ بہت اداس ہوں۔''

میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرا اٹھایا اور بولا۔ ''بھلا کیوں اداس ہو؟''

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''اب یہ موضوع بدل دیں تو کیسا رہے؟''

میں نے آج اسے ناراض نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میں نے چپ ہو کر کچھ اور چائے پیالیوں میں انڈیل دی اور ہم پھر چائے پینے لگے۔ وہ جھیل پر تیرتی تاریکی میں کھو گئی اور میں نے گردن گھما کر لاؤنج میں جمع بھیڑ پر نظریں گاڑ دیں۔ ہم دونوں کے درمیان ایک دوستانہ خاموشی چھا گئی۔

دفعتاً مجھے خوش بخت سنگھ کا خیال آیا۔ اس کا وہ گھٹنوں کے اسپرنگ دبا کر بیٹھنے کا انداز یاد کر کے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے رتنا کو مخاطب کیا۔ ''تم نے اپنے بھائی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔''

''اس کی شادی ہوئے بہت دن ہو گئے۔ اب اس کے دو لڑکے بھی ہیں، ننھے منے خوب صورت۔''

''مجھے اس کی ایک بات یاد آ گئی ہے، اسے انصاف پر غیر ضروری اعتقاد تھا جب کہ میں دیکھتا ہوں، فطرت کی تعمیر ناانصافی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔''

رتنا خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ شاید وہ میری جانب سے ایک طویل خطاب کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی، اس کا خوف بجا تھا، کیوں کہ یکایک میں اپنی جگہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور میں نے سگریٹ سلگالی تھی اور دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا میز پر ہاتھ مار کر بلند آواز میں اسے مخاطب کر رہا تھا۔ اپنی آواز کسے بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ ''فطرت کی تعمیر ہی ناانصافی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔'' میں اس سے کہہ رہا تھا۔

میں تمہیں ایک معمولی واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا تو مجھے بھی اسکیچ اتارنے کا شوق تھا۔ ویسے اسکیچ نہیں، جیسے تم بناتی ہو۔ تم نے اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ میرے اسکیچ بچکانا ڈھنگ کے ہوتے تھے۔ ان میں نفاست کا دور، دور تک پتا نہ ہوتا۔ مگر انہیں بنا کر مجھے ایک عجیب تسکین ہوتی، جیسے اپنا راز ایک دوست کو بتا دینے سے دل کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ تو ایک بار لائبریری میں بیٹھے بے خیالی کے عالم میں، میں نے ایک اسکیچ بنایا۔ پس منظر میں ایک جنگل تھا اور سامنے ٹیلی گراف کے کچھ تار گزر رہے تھے، میں نے اس اسکیچ کا عنوان یوں رکھا کہ فطرت میں کوئی خط مستقیم نہیں۔ اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرے اسکیچ اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے جتنے ان کے عنوان۔ خیر، میرا اسکیچ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ انسان کے بنائے ہوئے ٹیلی گراف کے تاروں میں سیدھی لکیریں تھیں۔ لیکن ان تاروں کے پیچھے جو جنگل تھا وہ بالکل الٹ پلٹ تھا۔ اسکیچ بنانے کے کچھ دن بعد میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ فطرت میں ایک بھی سیدھی لکیر نہ ہو۔ ضرور کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی چیز تو ہو گی ہی جس میں ایک سیدھی لکیر ہو، ایک ضابطہ ہو اور جیومیٹری کے اصول کام میں لائے گئے ہوں اور پھر میں نے باقاعدہ تلاش شروع کر دی۔ مگر مجھے سخت ناکامی ہوئی۔ کبھی کبھی مجھے ایسی کوئی چیز نظر آ جاتی، جس میں ایک حد تک ضابطہ ہوتا، مگر پھر ضابطہ کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور وہی بے ضابطگی شروع ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ مجھے ایک جنون سا ہو گیا۔ ایک دن میں سچ مچ جنگل کی طرف نکل گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر ہر چیز کو گھورنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف بے ضابطگی بکھری پڑی ہے۔ میں حیران ہو گیا۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ فطرت میں کوئی سلیقہ نہیں، کوئی اصول نہیں، سب آڑا ترچھا ہے۔ سب کچھ بکھرا بکھرا سا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک کوئی ضابطہ نہ ہو، کوئی اصول نہ ہو، انصاف پنپ نہیں سکتا۔ دراصل فطرت کی بے ضابطگی ایک علامت ہے۔ یہ قدرت کی جانب سے اس بے رحم حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ مکمل انصاف کبھی ممکن نہیں۔

فرط جوش سے میں میز پر اس قدر آگے جھک آیا تھا کہ تقریباً کرسی سے اٹھ گیا تھا۔ میرا بدن کانپ رہا تھا اور سانس تیز ہو گئی تھی اور گلا بھر آیا تھا۔ آس پاس کی میزوں سے لوگ گردن گھما کر ہمیں دیکھ رہے تھے اور شرم سے رتنا کی پیشانی پر سرد پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ میں نے اپنا رومال نکال کر اس کا پسینہ پونچھا۔ اس عمل سے اس کا جذبہ خودداری واپس لوٹ آیا اور مسکرانے لگی۔ پھر یہ مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ ''شاید میرا بھائی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی انصاف کا دلدادہ ہے، مگر مجھے تمہاری اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں۔ مکمل انصاف ایک ناممکن چیز ہے۔ میرے پاس انصاف کا مطلب کوئی ضابطہ یا اصول نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہو تو مجھے اس کی سزا ملنی ہی چاہیے اور بس۔''

میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگی۔ ''جب میں بہت چھوٹی بچی تھی اور نرسری جایا کرتی تھی تو وہاں ایک نن اچھے اچھے گیت سکھایا کرتی۔ ان میں سے ایک گیت میں تمہیں سناتی ہوں۔ ایک ننا منا چوہا۔ وہ ایک گھڑی پر چڑھ دوڑا۔ گھڑی نے ٹن سے ایک بجایا، چوہا دم دبا کر بھاگا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''

وہ بولی ''یہ بکواس نہیں۔ اس میں بھی ایک علامت ہے۔ تم نے ابھی ابھی ایک لمبی تقریر کی ہے۔ اگر پھر بولنا شروع کیا تو میں بھی ٹن سے ایک بجا دوں گی اور تمہیں چوہے کی طرح دم دبا کر بھاگنا ہو گا۔''

میں مسکرا کر چپ ہو گیا اور ایک سگریٹ سلگائی۔ نو بج رہے تھے۔ مگر لاؤنج میں بھیڑ کا وہی عالم تھا کہ دفعتاً میں نے ایک اکتاہٹ سی محسوس کی اور اس اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور ایک انگڑائی لی۔ پھر میں نے رتنا کی کمر

کے گرد ہاتھ ڈال دیا اور بولا۔ ”آؤ کہیں اور چلتے ہیں۔“

ہم نے رات کے کھانے کے لیے ایک میز محفوظ کروالی۔ پھر ہوٹل سے نکل کر جھیل پار کی اور ساحل پر ایک ٹیکسی لے کر ”سہیلیوں کی باڑی“ جا پہنچے جو فتح ساگر جھیل سے سٹا ہوا ایک طویل و عریض سرسبز قطعہ ہے۔ یہاں کوئی بھیڑ نہیں تھی۔ چاروں طرف سکوت طاری تھا اور گھنے پیڑوں کے بیچ سے خوش گوار سرد ہوا ہلکی آواز پیدا کرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ سیاہ آسمان پر تاروں کی بارات تھی۔ ہم خاموش ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے لگے، مگر ہمارے جسم ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ رتنا میرے قریب سمٹ آئی۔ اس کے نرم بھرے بھرے جسم کے لمس سے میرا سر گھومنے لگا اور میری نسوں میں آگ بھر گئی۔ میں نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا اور اس کے ہونٹ چوم لیے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے اور خود کو مکمل طور پر میرے حوالے کردیا۔ میں نے اس کے گالوں کو بار بار چوما اور گردن کو اور بالوں کو۔ پھر اس نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم ایک تنے کے درخت سے لگ کر بیٹھ گئے۔

اس نے اپنا سر میرے سینے میں چھپالیا اور وہی کہا جو عورتیں ایسے موقعوں پر اکثر کہا کرتی ہیں۔ ”ہرجیت، تم مجھے ایک بری عورت مانتے ہو؟“

میں نے اسے اپنے اور قریب گھسیٹ لیا۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر چہرا اوپر اٹھایا اور گردن کو آہستہ سے چوم کر جواب دیا۔ ”رتنا...... میں آج بھی تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔“

وہ زیرِ لب بولی۔ ”یہ تو میری بات کا جواب نہ ہوا۔“

میں نے کہا۔ ”سنو رتنا۔ میں نے ابھی کچھ دن پہلے کہیں پڑھا ہے کہ محبت کا مطلب ہے کہ کبھی یہ نہ کہنا پڑے کہ تمہیں افسوس ہے۔“

وہ کچھ دیر اس پر غور کرتی رہی۔ پھر بولی۔ ”بہت خوب صورت بات ہے۔ دل کو لگتی ہے۔“ پھر رک کر بولی۔ ”شاید مجھے تم سے محبت نہیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں...... کیوں کہ مجھے اندر ایک افسوس سا ہو رہا ہے۔“

میں نے پھر ایک بار اس کا چہرا اوپر اٹھایا۔ مگر دھندلکے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور شدت جذبات سے انہیں دباتا ہوا کہنے لگا۔ ”رتنا، رتنا، تم جو کہہ رہی ہو اگر وہ سچ بھی ہو تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔“

مگر رتنا نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک نیا موضوع چھیڑ دیا۔ پوچھنے لگی۔

”ہرجیت...... مدھو کہاں ہے؟“

”اس نے شادی کرلی۔“

”میرے ایک اور سوال کا جواب دو، کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے مدھو سے جھگڑے میں میرا کوئی ہاتھ تھا؟“

مجھے اس سوال پر سخت حیرت ہوئی۔ بولا۔

”ہرگز نہیں۔“

”مگر مجھے اکثر یوں لگتا ہے کہ اس معاملے میں میں ہی قصوروار ہوں۔“

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ مجھے یکا یک اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ پھر دفعتاً وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کی تقلید کی اور جب ہم ٹیکسی میں واپس ہوٹل کی سمت جارہے تھے تو میں نے پھر ایک بار اس سے کہا۔ ”رتنا، تم نے کوئی قصور نہیں کیا۔“

اس نے غیر یقینی انداز میں میری جانب دیکھ اور سر جھکالیا۔

تقریباً گیارہ بج رہے تھے جب ہم نے ہوٹل لیک پیلس کے عظیم ڈنر ہال میں قدم رکھا۔ ہال میں ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ایک کونے سے آرکسٹرا کی دھیمی آواز اٹھ رہی تھی۔ ہم اپنے لیے محفوظ میز کے گرد اس طرح جا بیٹھے کہ میں رتنا کے دائیں جانب تھا، میز پر جلتی ہوئی شمع کی دھندلی روشنی میں، میں نے غور سے رتنا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرا اب پُر

سکون تھا اور مہربان آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔ اس کی خوب صورت سیاہ ساڑھی پر کھلے ہوئے نیلے پھول اس کی دلکشی کو نمایاں کررہے تھے اور پرانے وقتوں کی طرح بکھرے ہوئے بالوں میں نیلا گلاب بھی غضب ڈھا رہا تھا۔ میں کرسی کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گیا اور میں نے فرطِ سرور سے آنکھیں بند کرلیں۔ موسیقی کی ہلکی دھن کانوں سے ہوتے میرے شعور میں داخل ہوگئی۔

نہ جانے کب تک میں اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر رتنا کا نرم ہاتھ مجھے اپنے کلائی پر محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کھانا میز پر چن دیا گیا تھا۔ ہم نے کھانا شروع کیا۔ اس دوران زیادہ تر خاموشی رہی۔ کھانا ختم کرکے ہم پھر لاؤنج پر آگئے اور ریلنگ سے لگی ہوئی اسی مانوس میز کے گرد بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ چائے کے دوران میں نے رتنا سے کہا۔ ”رتنا ان حسین لمحات کے لیے میں تمہارا شکرگزار ہوں۔“

اس نے اپنی بہترین مسکراہٹ کا تحفہ مجھے دیا، مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

چائے ختم کرکے جب ہم اٹھ کھڑے ہوئے تو کوئی ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ لاؤنج بڑی حد تک خالی ہو چکا تھا۔ میں نے رتنا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نچلی منزل پر واقع اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے مقفل کردیا۔ کمرے کی شاہانہ سجاوٹ دیکھ کر رتنا کے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر اسکرینز ہٹا دیے۔ چاند نکل آیا تھا اور کھڑکی کے اس طرف جھیل کی سطح پر چاندی چمک رہی تھی اور جھیل کی کمزور لہریں کمرے کی دیوار سے ہم آغوش تھیں اور ایک عجیب بو جل کے پانی سے نکل کر کمرے میں گھس گئی تھی جو بڑی حد تک سمندری پانی کی بو سے مماثلت رکھتی تھی۔ اس نظارے کو دیکھ کر رتنا کے منہ سے پھر ایک آہ نکل گئی۔

میں نے اپنے جوتے اتارے اور کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور دونوں کو لاپروائی سے ایک جانب پھینک دیا اور قمیص کے اوپر کے بٹن کھول کر ایک لمبی سانس لی۔ اب میں خود کو آزاد محسوس کررہا تھا۔ میں آہستہ سے آگے بڑھا اور اس کی پشت پر پہنچ کر اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔ اس کا بدن کچھ تن سا گیا اور وہ خاموش کھڑی میرے اگلے اقدام کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے آہستہ سے جھک کر اس کے بال چوم لیے اور کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے اپنی جانب گھما لیا۔ اس نے اپنا چہرا اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی، پھر اس نے اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کردیے اور مجھے اپنے اور قریب کھینچ کر اپنے گرم ہونٹ میرے منہ پر رکھ دیے۔ ایک طویل بوسے کے بعد میں نے اس کی کمر پکڑ کر اسے ہوا میں اٹھا لیا۔ اپنے بھرے بھرے جسم کے باوجود وہ کتنی ہلکی لگ رہی تھی۔ میں نے بستر کے کنارے بیٹھ کر اسے اپنی گود میں لے لیا اور بے تحاشا پیار کرنے لگا۔ میں نے اس کے بالوں پر اور پیشانی پر اور رخساروں پر اور ہونٹوں پر پیار کی بوچھاڑ کردی۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ مدتوں کی دبی ہوئی خواہش اب سر اٹھا کر چنگھاڑ رہی تھی اور مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا تھا۔ میں ہانپنے لگا اور میری جلد سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹنے لگا۔ میں نے بے اختیار اس کا پورا لباس نوچ کر پھینک دیا اور ہم اسی طرح ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے بستر پر لڑھک گئے اور لحاف اوپر کھینچ لیا۔ اس کا دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے منہ سے ایک عجیب آواز نکل رہی تھی۔ میں پہلے ہی جانتا تھا رتنا کہ تم بستر میں ایک زبردست محبوبہ ثابت ہوگی۔

رات ابھی باقی تھی۔ کوئی چار کا عمل ہوگا۔ جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ رتنا مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے ہاتھ اس کے برہنہ جسم کی طرف بڑھا دیے، مگر اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا اور انہیں ہلکے سے چوم کر کہنے لگی۔ ”ہرجیت، مجھے کچھ کہنا ہے۔“

میں نے پرسکون آواز میں سوال کیا۔ ”کیا کہنا

ہے؟“

وہ بولی۔ ”مجھے ایک جرم کا اعتراف کرنا ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”تم کچھ بہک رہی ہو۔“

میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے ایک جرم کا اعتراف کرنا ہے۔“

”بک ڈالو۔“

”میں تمہیں کوئی خاص پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔“

”یہ تم اس سے قبل بھی کہہ چکی ہو۔“

”میں بلبیر سے محبت کرتی ہوں۔“

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا۔ ”یہ مسٹنڈا بلبیر یکایک کدھر سے ٹپک پڑا؟“

اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ بدستور اپنا بیان جاری رکھتی ہوئی بولی۔ ”ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنے جارہی ہوں۔“

کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ میں خود کو گھسیٹ کر بستر کے کنارے تک لے گیا اور ایک بٹن دبا دیا۔ تیز روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ اب میں رتنا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے جھپٹ کے لحاف سے اپنا برہنہ جسم ڈھک لیا اور عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی، جن کا مطلب میں اس وقت نہ سمجھ سکا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ تم بلبیر کا قصہ کیا لے بیٹھیں؟“

اس نے نظریں جھکالیں اور زیرِ لب کہنے لگی۔

”شام کو جب ہم لاؤنج میں بیٹھے گفتگو کررہے تھے تو تم نے مجھ سے دریافت کیا تھا۔ یہ نو برس میں نے کس طرح گزارے۔ میں نے اپنے متعلق تمہیں سب کچھ بتادیا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ نو برس میں بلبیر سے مسلسل ملتی رہی ہوں اور جب میں اس کمرشل آرٹ اسکول میں پڑھایا کرتی تھی تو ہم دونوں ایک جگہ رہتے تھے۔ اس کے باپ کو مرے پانچ برس ہوگئے ہیں۔ وہ آج کل اپنے آبائی مقام لدھیانے میں رہتا ہے اور اکثر مجھ سے ملنے ادھر آیا کرتا ہے۔ ایک ہفتہ قبل وہ ادھر آیا تھا۔“

یکایک میرا دل ڈوبنے لگا اور دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا اور شدت جذبات سے میرے ہاتھ کپکپانے لگے۔ مگر ابھی اس داستان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس معاملہ کی تہ تک پہنچنا تھا۔ میں نے بمشکل تمام خود کو سنبھالا اور کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”تم نے وہ کیوں نہیں کیا جو ان حالات میں لوگ عام طور پر کیا کرتے ہیں؟ میرا مطلب ہے تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟ کیا اسے شادی سے انکار تھا؟“

”نہیں، نہیں، نہیں۔“ رتنا تقریباً چیخ پڑی۔ ”اسے شادی سے انکار نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے شادی کے لیے اصرار کرتا رہا۔ مگر ہر بار میں نے اسے ٹال دیا۔ کئی دفعہ ہم میں اس بات کو لے کر جھگڑا ہوا۔ اس نے میری چاچی سے بھی کئی بار اس کا ذکر کیا۔ وہ دونوں ہم خیال تھے۔ میرا مطلب ہے بلبیر اور میری چاچی۔ وہ میرے سر پر سوار ہوگئے کہ میں یہ شادی کر ہی ڈالوں۔“

کیسی بے ڈھنگی سی بات تھی۔ میں نے بدستور کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر پچھلے ہفتے جب وہ آیا تھا تو یہ ہی کہتا تھا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ میرے ساتھ لدھیانے چل کر رہو۔ مگر میں نے ہمیشہ کی طرح اسے کوئی صاف جواب نہیں دیا اور میرا بلبیر مجھ سے روٹھ کر چلا گیا اور اس بار کہہ گیا کہ پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔“

میں نے چلا کر کہا۔ ”خدا کی پناہ۔ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ اتنے برس اس سے یوں ملتے رہنے میں تمہیں کوئی عذر نہیں ہوا۔ مگر شادی ٹال رہی تھی۔ آخر کیوں رتنا؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟“

اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس نے لحاف میں اپنا سر چھپالیا۔ اس کے کٹے ہوئے خوش نما بال سامنے پھسل آئے۔ مگر وہ نیلا گلاب کہاں تھا! میں اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ بستر پر مرجھایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر سونگھا۔ اس میں اب بھی کچھ بھینی بھینی خوشبو موجود تھی۔

پھر لحاف کے اندر سے نکل کر رتنا کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ان طویل برسوں میں جب بھی اکیلی ہوتی، ایک سوال میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ یہ سوال مجھ سے پوچھتا۔ میں شادی کیوں نہیں کرلیتی؟ اور جواب کے لیے میں اپنا دل ٹٹولنے لگتی۔ مگر کوئی جواب نہ ملتا۔ پھر آہستہ آہستہ حقیقت مجھ پر آشکار ہونے لگی کہ میں احساس گناہ کی شکار ہوں اور میرا شادی سے انکار ایک قسم کی سزا تھی جو میں نے اپنے آپ کو دے رہی تھی۔ شاید میں اپنے ضمیر کو خوش کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ کس جرم کا ارتکاب کیا ہے؟ اور جواب کے لیے میں نے پھر اپنا دل ٹٹولنا شروع کیا۔ مگر جیسے ایک پتھر کی دیوار میرے سامنے آگئی۔ میرا جواب دیوار کے اس پار تھا۔ مگر میں دیوار نہ پھاند سکی۔ میں دیوار سے سر پٹخ کر رہ گئی۔ میرا جواب مجھے نظر نہیں آیا۔“

اب اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور وہ زاروقطار رونے لگی، لیکن مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں نے اسے کوئی دلاسا نہیں دیا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور کھڑکی سے پرے جھیل پر نظریں گاڑ دیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ تھک گئی تو اس کا رونا کم ہوگیا۔ اس نے لحاف سے سر اٹھایا۔ مگر آنسوؤں سے گیلے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”پچھلے ہفتے جب بلبیر مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں خوف زدہ ہوگئی۔ مجھے خود سے ڈر لگنے لگا۔ کیا میں پاگل تھی؟ مجھے کسی چیز کی تلاش تھی؟ سیکڑوں خیال رہ، رہ کر دماغ میں آتے۔ مگر کچھ نہ سوجھتا اور اسی دبدبے میں ایک شام میں اپنے کمرے میں اکیلی آرام کرسی پر بیٹھی تھی، میرے سامنے ایک کتاب کھلی تھی، مگر میں چھت کو تک رہی تھی ایک نکتے کے لیے میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ یکایک میرا ذہن روشن ہوگیا۔ میں نے وہ دیوار آن کی آن پھاند لی جو اتنے برسوں سے میرے سامنے کھڑی میری بے بسی پر ہنسا کرتی تھی۔ میرا جواب مجھے مل گیا۔ ہاں میں احساس گناہ کا شکار تھی اور میرا گناہ یہ تھا کہ میں نے تم کو مدھو سے الگ کردیا۔ ان دنوں میں خوب جانتی تھی کہ تمہیں مدھو سے عشق ہے اور یہ کہ مدھو مجھ سے نفرت کرتی ہے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے خود کو تم دونوں سے پرے لے جانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر اس رات میں وہاں نہ ہوتی تو آج مدھو تمہاری بیوی ہوتی۔ پھر اس واقعے کے کوئی تین ہفتے بعد تم میرے گھر مجھ سے ملنے آئے۔ مدھو کو کھو کر تمہارے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ تمہیں ہمدردی کی ضرورت تھی۔ مگر میں نے تم سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ میں نے تم سے تعلق ترک کرلیا۔ میرے ضمیر نے مجھ پر یہ ہی دو فردِ جرم عائد کیے تھے اور انہیں نہ جانتے ہوئے بھی میں خود کو سزا دے رہی تھی۔ مگر اب بات صاف ہوگئی تھی۔ میں تمہاری قصوروار تھی۔ صرف تمہیں یہ حق حاصل تھا کہ مجھے جو جی چاہے سزا دے لو۔ میں نے اسی وقت تمہیں ایک خط لکھا اور یہاں بلالیا اور اب تم نے مجھے بہت سزا دے لی ہے۔ اب میرے ضمیر کو اطمینان ہوگیا ہے۔ اب میں بلبیر کے پاس جاؤں گی اور اس نئے گناہ کا اعتراف کرلوں گی۔ وہ ضرور مجھے معاف کردے گا۔ اب مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔“

اس کے بعد مجھے کیا ہوا۔ یہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ بس صرف اتنا احساس ہے کہ میرے دماغ میں کچھ ڈھیلا سا پڑ گیا اور کانوں میں سن سن کی آواز ہونے لگی۔ میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی اور زبان سوکھ گئی۔ غصے سے میں اندھا ہوگیا۔ میں نے اس کا لحاف کھینچ لیا اور اس کے برہنہ پیٹ پر ایک گھونسا جمایا اور پھر میں نے اس کے جسم پر گھونسوں کی بھرمار کردی اور زور کی لات مار کر اسے بستر سے نیچے فرش پر گرادیا اور پھر بستر سے اتر کر لات پر لات مارتا رہا۔ ساتھ ہی میں اسے گالیاں بھی دیتا جاتا۔ وہ فرش پر پڑی درد کی شدت سے چلاتی رہی اور سردی کی شدت سے اس کا برہنہ بدن کپکپاتا رہا۔ لیکن مجھے

اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے مجھے اتنا ذلیل کیا تھا کہ کچھ گھنٹے پہلے میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ تھا۔ آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے کی سوچ بھی سکے۔ اس نے میرے جذبہ خودداری کو ضرب نہیں لگائی تھی، بلکہ اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ رات بھر میرے ساتھ بستر میں پڑی پیار جتاتی رہی تھی اور اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔ اس کے جرم کی سزا ہے۔ اس نے میرے جذبات کو جیسے خاک میں پڑا لوہے کا ایک ٹکڑا یا لکڑی کا کندہ سمجھ لیا تھا، جس کا کوئی استعمال نہیں اور یہ سب کرتے ہوئے وہ میری شخصیت کو نظر انداز کرگئی تھی۔ اگر مجھ سے ملتے ہی اس نے مجھے پوری حقیقت سے آگاہ کردیا ہوتا تو کیا میں اتنا کم ظرف تھا کہ اسی وقت معاف کرکے اسے اس کے عاشق کے پاس نہ بھیج دیتا۔ مانا کہ جرم کا جو احساس اس کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا وہ بے معنی تھا، لیکن صرف اس کے ضمیر کو تسکین پہنچانے کی غرض سے میں نے معاف کرنے کا ڈھونگ رچایا ہوتا اور وہ اپنی راہ پر چلی جاتی۔ افسوس کہ اس نے ایسا نہیں کیا، اس نے میری ایمان داری پر شک کیا اور مجھے وہ زک پہنچائی کہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ یہ سب سوچ کر میں خود کو ایک چھوٹا آدمی نظر آنے لگا اور مجھے نہ صرف اس سے بلکہ خود سے بھی نفرت ہونے لگی۔

میں نے تھک کر ایک کرسی کھینچ لی اور بیٹھ گیا۔

وہ فرش پر پڑی خاموش سسکتی رہی۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ پھر سویرے کی دھندلی روشنی کھڑکی کی راہ داخل ہوکر کمرے میں پھیل گئی۔ ٹھیک نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا، آپریٹر کہہ رہا تھا۔ ''صبح بخیر جناب۔ آپ نے کل دوپہر کو ہدایت کی تھی کہ آج نو بجے آپ کو جگا دیا جائے۔''

میں نے زیرلب جواب دیا۔ ''شکریہ۔''

''آپ پوری طرح جاگ گئے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں، ہاں، شکریہ۔'' اور ریسیور رکھ دیا۔

پانچ منٹ بعد کسی نے دروازے پر دھیرے سے دستک دی اور پھر کچھ سیکنڈ کے وقفے سے پھر ایک بار۔ شاید صبح کی چائے کے لیے۔ لیکن میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد رتنا نے اٹھ کر اپنے شکن آلود کپڑے پہن لیے اور بستر پر ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ لیکن ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ شام چار بجے میں لاؤنج میں چلا آیا۔ سگریٹ کے کچھ پیکٹ خریدے اور کچھ کھا کر ایک پیالی چائے لی۔ شام سات بجے میں لوٹ آیا۔ وہ اب بھی بستر پر اسی انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں منہ پھیر کر بستر پر لیٹا رہا۔ نصف شب کو پیاس سے میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا، وہ اپنی جگہ بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے پانی پی کر روشنی بجھا دی اور سوگیا۔

اگلی صبح سات بجے اٹھ کر میں نے فون کیا اور چائے بھیجنے کی ہدایت کی۔ چائے آگئی، تو میں نے اس سے کہا۔ اب چائے پی لو، کچھ دیر میں تمہیں اپنی چاچی کے پاس جانا ہے۔

وہ پھر سسکنے لگی۔ مگر اس نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

کوئی بارہ بجے تھے۔ جب میں نے اس سے کہا۔ ''چل کر کچھ کھالو۔ پھر تمہیں جانا ہے۔''

اس نے زبان کھولی۔ ''تمہیں معاف کرنا ہوگا۔''

اس پر میں چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا اور کھانا کھا کر باہر ہی ٹہلنے لگا۔ شام ڈھلے میں واپس ہوا اس کے چہرے پر ایک غبار چھایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور بے اختیار رونے لگی۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنے قریب بستر پر بٹھا لیا۔ اس کی جلد جگہ جگہ زخمی ہوگئی تھی، زخموں پر خون منجمد ہوگیا تھا اور چہرے پر کرب کا ایک عجیب عالم تھا۔ ''رتنا، رتنا۔ تمہاری کیا حالت ہورہی تھی۔ میں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ میں تو تمہارے نام کا دیوانہ تھا، میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں، لیکن تمہارا دکھ نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے لیے اب چپ ہوجاؤ، ورنہ میں بھی رو پڑوں گا اور یہ میرے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ہوگی۔ سنو رتنا سنو۔ تمہارے پیروں کی خاک میرے سر آنکھوں پر۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ بس یہ کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ پھر تمہاری دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ پھر تم اپنے بلبیر کے ساتھ اسی طرح ہنسی خوشی رہنا، جیسے بچوں کی کہانی میں راج کمار اور راج کماری ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن پہلے ایک بار مسکرا کر میرا نام تو لے لو...... تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑی اور میری دنیا جاگ اٹھی۔

بالآخر میں نے رتنا کو منالیا۔ اس کی ساڑھی کا آنچل ٹھیک کیا اور ہاتھوں کو ہلکے سے سہلایا اور پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیا اور سہارا دیتا ہوا باہر لاؤنج میں لے آیا اور فلورسٹ کے پاس لے جاکر ایک سفید گلاب کی سوغات پیش کی۔ پھر ہم نے ریلنگ پر جھک کر روز روشن کی شفاف نیلی جھیل کا نظارہ کیا اور جھیل کے کنارے بیٹھ کر سیاہ خوشبودار کافی پی اور موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنوں کے بیچ شمعوں کی دھندلی روشنی میں رات کا کھانا کھایا اور کھانے کے دوران اس نے اس چوہے کی کہانی ازسرنو سننے پر اصرار کیا جو گھڑی پر چڑھ دوڑا تھا اور جسے گھڑی نے ٹن سے بجا کر بھگا دیا تھا اور کہانی سن کر میں نے قہقہہ لگانے پر اصرار کیا اور پھر لاؤنج میں آکر سیاہ خوشبودار کافی کا دوسرا دور اور کچھ دوستانہ گفتگو اور پھر دور...... اور مزید دوستانہ گفتگو، شکریہ رتنا، بہت بہت شکریہ۔

جب رات کا ایک بج گیا تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ لاؤنج سے رخصت ہونے والوں میں ہم سب سے آخری تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور اسے ماڈل سرکل میں اس کی چاچی کے ہاں چھوڑ دیا۔ چاچی کی موجودگی میں رتنا نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور انہیں دبا کر ہلکے سے چوم لیا اور بولی۔ ''وعدہ کرو کہ تم لدھیانے آکر ہم سے ملوگے۔''

میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ ''وعدہ رہا۔''

اس کی چاچی نیند سے اٹھ کر آئی تھی۔ بڑھاپے سے کمر دہری ہوئی جارہی تھی اور کمزور آنکھوں پر چشمہ چڑھائے نہیں چڑھتا تھا۔ تھکی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔ ''آخر ماجرا کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''چاچی! اب اس کے ہاتھ پیلے کردو۔ یہ مان گئی ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''لاؤ سونے سے پہلے ایک پیالی چائے پی لیں۔''

رتنا نے تنک کر کہا۔ ''کتنے بے شرم ہو۔ رات کے دو بجے ہیں۔ پہلی بار چاچی سے مل رہے ہو اور انہیں تکلیف دے رہے ہو۔''

مگر میرے الفاظ سے قطع نظر کرکے ان دونوں نے مل کر خوشی خوشی چائے تیار کی۔ چائے پینے کے بعد میں نے زندگی میں دوسری بار رتنا سے بدلہ لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''وہ شرابی سکھڑا اس لائق نہیں کہ اسے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ تم فوراً اس سے شادی کر ڈالو۔''

اس طرح دلکش رتنا چوتھے خانے سے نکل کر وقتی طور پر پانچویں خانے میں آئی اور وہاں سے نکل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تیسرے خانے میں براجمان ہوگئی۔

یہ داستان میں نے کوئی تین برس قبل تحریر کی تھی۔ ابھی کچھ دن کی بات ہے کہ مجھے اپنی کمپنی کے ایک کام کے سلسلے میں لدھیانے جانا پڑا۔ جیسی کہ میری عادت ہے، میں وہاں کے سب سے شان دار ہوٹل میں ٹھہرا۔ ایک شام میں چہل قدمی کو نکلا تھا کہ ناگہاں رتنا نے دور سے مجھے دیکھ لیا اور میری طرف چلی آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب اس کی عمر بتیس برس ہونی چاہیے۔ مجھے یہ دیکھ کر فکر لاحق ہوئی کہ وہ کچھ دبلی ہوگئی تھی اور اس کی رنگت کچھ پھیکی پڑ گئی تھی۔ اس کی وہ عجیب دلکشی ضرور برقرار تھی، مگر رخ پر

ناکامی اور ہراس کی پھیلی بدلیاں چھا رہی تھی۔ وہ گفتگو کرتے کرتے بات ادھوری چھوڑ کر اچانک رک جاتی اور اس کی نگاہیں ہوا میں ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتیں۔ تمہیں یہ کیا ہو گیا تھا رتنا؟ کیا تم مجھے اپنے گھر بلانے کے بجائے یہ راز نہیں بتا سکتی تھیں؟ مگر شاید تمہارا بلانا ٹھیک ہی ہوا۔ دوسرے دن شام جب میں تمہارے گھر پہنچا تو مجھے تمہارا راز معلوم ہو گیا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دوسرے دن شام کو میں ایک خستہ مکان کے احاطے میں کھڑا تھا۔ مکان کے در و دیوار پر سبزہ اگ رہا تھا اور فرش سے غبار اٹھ رہا تھا۔ ضرور اس کی شرابی کبابی نے باپ کی ساری دولت پھونک دی تھی۔ میں نے رتنا سے صرف ایک سوال کیا۔ ”رتنا! کیا تم ان دنوں کچھ کام کرتی ہو؟“

اس کا جواب مجھے معلوم تھا۔ ”میں کوئی باقاعدہ کام نہیں کرتی، اگرچہ کام آج کل ایک ضرورت بن گیا ہے، کیوں کہ یہاں ایک آرٹ اسکول تک نہیں، مگر ادھر ادھر کمرشل فیلڈ میں کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا ہے اور پھر میرا بھائی خوش بخت سنگھ کبھی کبھی کچھ بھیج دیتا ہے۔“ پھر دور فضا میں گھورتی ہوئی وہ بولی۔ ”دراصل ادھر کچھ دنوں سے بلبیر کی طبیعت ٹھیک نہیں، مگر کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

پھر ہم اوپر جانے کے لیے ایک گرد آلود چوبی زینہ طے کرنے لگے۔ زینہ اس قدر کمزور تھا کہ میرے ہر قدم کے ساتھ احتجاج کرتا، جیسے مدتوں سے اس نے کسی صحت مند انسان کا بوجھ نہ اٹھایا ہو۔ اوپر ایک کھاٹ پر بلبیر لیٹا تھا۔ میں ایمان کی بات کہوں گا کہ اس کے قد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ باقی سب بدل گیا تھا۔ رنگ کچھ پیلا پڑ گیا تھا اور گال پچک گئے تھے سینہ اندر کو دھنس گیا تھا اور سانس کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بہادری سے بستر میں اٹھ بیٹھا، مگر اس کا پھل اسے فوراً مل گیا۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وہ ہانپنے لگا۔ میں نے اس کے سینے پر ایک گھونسا جمایا اور بولا۔

”بلبیر ے..... اب تجھے جلد ہی آرام ہو جائے گا۔“

بلبیر اگھونسے کے اثر سے بے ہوش ہوتا ہوتا بچا، بولا۔ ”مجھ پر واہگورو کی مہربانی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”مگر تجھے ہوا کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”کوئی جگر کی بیماری ہے۔“

رتنا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”بیماری کوئی خاص نہیں۔ مگر ان بیماریوں کے نام لاطینی زبان میں لو تو خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔“

میں نے اپنی جیب سے وہسکی کی ایک بوتل نکالتے ہوئے دریافت کیا۔ بلبیر ے کچھ پیے گا؟“

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ رتنا کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”پہلے اس سے پوچھ لے۔“

رتنا نے ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ سے کہا۔ ”ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ اب سرکار اس دور سے گزر چکے ہیں، جہاں پینے نہ پینے سے کوئی فرق پڑے۔“ اور خالی دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔“

میں نے وہسکی ایک گلاس میں انڈیل دی۔ اس نے غٹاغٹ پی ڈالی۔ میں نے دوبارہ گلاس بھرنا چاہا تو اس نے روک دیا اور بوتل میرے ہاتھ سے چھین کر اپنے سرہانے رکھتا ہوا بولا۔ ”ابھی اتنی بہت ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بلبیر ے..... جب تو مر جائے گا تو تیری بیوی کا کیا ہو گا؟“

وہ بولا۔ ”واہگورو..... واہگورو۔“

”بلبیر ے! تجھ پر خدا کی مار ہو۔“

”واہگورو..... واہگورو۔“

جب رتنا میرے لیے چائے لے آئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”رتنا اس موذی کو میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا لو۔ مجھے اس کی شکل سے نفرت ہے۔“ اور یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا منہ پھیر لیا اور دیوار کی طرف رخ کر کے بے اختیار رو پڑا۔

بلبیر اخاموش اپنی کھلی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ رتنا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا نام لے کر کہا۔ ”ہر جیت..... ہر جیت۔“

اس کے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں تھا۔

پھر میں نے ایک ہزار روپے کے نوٹ بستر کے سرہانے رکھ دیے۔ مجھے یہ کرتے ہوئے ان دونوں نے دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں، خاموش دیکھتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو بلبیر ے نے مجھے گلے لگا لیا اور رونے لگا اور میری پیٹھ تھپتھپا کر بولا۔ ”ہر جیتے، تو فکر نہ کر، واہگورو سب ٹھیک کر دیں گے۔“

پھر گرد آلود چوبی زینے کا وہی احتجاج، پھر احاطے میں در و دیوار پر اگا ہوا وہی سبزہ، پھر رتنا کے وہی الفاظ، لیکن میں رخصت ہونے لگا، تو بولی۔ ”بلبیر کی طبیعت اتنی ٹھیک نہیں۔ مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”ہاں رتنا..... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

اور اس سے زندگی میں تیسری اور آخری بار رخصت لی۔

اپنے ہوٹل جاتے ہوئے میں راستے میں ان دونوں کے متعلق سوچتا رہا۔ دفعتاً مجھے ان دونوں پر غصہ آ گیا اور میں نے انہیں کوسنا شروع کیا۔ بلبیر ابڑا آرٹسٹ بنا پھرتا تھا۔ مگر مدھو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ شراب میں زندگی گھول سکتا تھا، مگر اس کے آگے بالکل صفر تھا۔ بے وقوف، نامراد بلبیر ے۔ میں جانتا ہوں، تو نے کب سے اتنی پینی شروع کی، جب تیری رتنا سے پہلی ملاقات ہوئی۔ تجھے عشق کرنا ہی تھا تو میری مثال سامنے رکھتا۔ میں نے مدھو کو کھو دیا۔ مگر میرا کچھ نہ بگڑا اور تو نے رتنا کو پا لیا، مگر تیرا بھلا نہ ہوا اور تم رتنا! تم نے ہمیشہ زندگی کو سنجیدگی سے لیا، تم نے ہمیشہ زندگی میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کی اور دیکھ لو، زندگی ایک نہ ایک دن سب کو چوٹ دے ہی جاتی ہے۔ اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔ اگر یہ کچھ دے سکی ہے تو صرف وہ ایک لمحہ جو گزر رہا ہے۔ گزرا نہیں ہے۔ مگر تم نے میری ایک نہ مانی۔ تم کو قدرت کے انصاف پر بھروسا تھا۔ اب اس انصاف پر قربان ہو جاؤ۔ مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے تم دونوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں تم دونوں پر خدا کی لعنت بھیجتا ہوں۔ اب میں تم دونوں سے رخصت ہوتا ہوں۔ اب آگے کا سفر تمہیں اکیلے طے کرنا ہو گا۔ میرا تم لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے الوداع میرے دوستو، الوداع!

☆☆

ادب سے......!

ہم کسی سے کم نہیں!

سماجی اور اقتصادی اعتبار سے بھی ہم کسی سے کم نہیں۔ ہمارے یہاں بھی کھانے میں ملاوٹی گھی کا بگھار ہے۔ پیاز مہنگی سہی، پھر بھی چٹنی اور اچار ہے، پہننے کے لیے قمیص اور شلوار ہے، پائل کی جھنکار ہے، دیوانوں کے لیے زلفِ خم دار ہے، رسموں اور رواجوں کا مینار ہے، جہیز شادی بھی ایک بیوپار ہے، سڑکوں پر گندگی اور غبار ہے، بھکاریوں کی بھرمار ہے، پانی کے لیے نلکوں پر قطار ہے، تعلیم بے معیار ہے، نہ صرف پابندی وقت دشوار ہے، بلکہ کام سے بھی فرار ہے۔“ (ڈاکٹر رام آسرا راز)

☆☆

دلہن کا رونا

ہم نے ٹہوکا دیا کہ رخصتی کے وقت دولہن کا رونا رسومات میں داخل ہے۔ انہوں نے بہت پلکیں ٹپٹپائیں، مگر ایک آنسو نہ نکلا۔ پھر کار میں سوار کراتے وقت ہم نے سہرا اپنے چہرے سے ہٹایا۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں! (مشتاق احمد یوسفی)

میں طاہرہ

ثمینہ سید

اسلام سے قبل لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔ لیکن آج غربت، بھوک اور افلاس سے مجبور مائیں اپنی بیٹیوں کو بیچنے پر مجبور ہیں۔ اور معاشرے کے بے حس اور عیاش سوداگران کی بے بسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان افراد کے خلاف ایک عورت کے انتقام کی سرگزشت۔

عزت اور انسانوں کا بیوپار کرنے والے سوداگروں کا انجام

عجیب دردناک سا دن تھا میرے پورے جسم میں درد ہی درد چاپسا ہوا تھا۔ میری حالت کچھ ایسی تھی کہ میں غور بھی کرتی تو اپنے جسم سے کوئی ناخن برابر جگہ بھی ایسی نا ملتی جو پرسکون ہو۔ پچھلے کئی سالوں سے ہر دن ہی اسی طرح کا تھا اور رات......رات تو میرے مقدر پہ چھائی ہوئی تھی کالی گہری مکمل تاریک رات۔ گزشتہ رات بھی اسی طرح کی تھی فرہاد نے گدھ کی طرح میرے بدن کو نوچا کھسوٹا تمام رات مجھے ادھر سے ادھر پٹختا رہا اور پوچھتا رہا ''تمہیں اچھا تو لگ رہا ہے ناں'' پھر خود ہی جواب دیتا ''اچھا کیوں نہیں لگے گا تم جیسی معمولی سی شکل کی عورت کو میرے جیسا جوان مرد مل گیا شکر کیا کرو۔'' اور میں ہر صبح اٹھ کر نہا دھو کر وضو کر کے نماز پڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرتی۔ نجانے کس بات کا شکر۔ شاید شکر ادا کرنے کا فرض نبھاتی میری ماں نے عادت جوڑ الی تھی ہر سانس کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کیا کرو وہ کیسی کیسی نعمتوں سے ہمیں نوازتا ہے۔ اور میں شکر ادا کرتی تیار ہو کر اسکول کے لیے نکل آتی۔ طاہرہ نام ہے میرا میرے وجود سے آپ کو جتنی بھی گھن آئے نام تو نہیں بدل سکتا ناں۔''

طاہرہ اپنے بارے میں بتاتی ہانپنے لگی، چند لمحے چپ رہی پھر کسی معمول کی طرح خود بخود بولنے لگی۔

''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میرا بدن درد سے نیلو نیل تھا میں بمشکل کرسی سنبھال کے بیٹھی تو میری کلاس کی بچی میرے پاس چلی آئی اور کتاب سے مجھے ہوا دینے لگی۔ مجھے لگا وہ بغور مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے الجھی سی نگاہوں سے اسے دیکھا تو سرگوشی میں بولی۔

''ٹیچر وہ آپ سے بہت پیار کرتا ہے؟''

''کون؟'' میں سٹپٹا کے بولی تو وہ ہنسی اور اپنی انگلی کی پور سے میرے کان کے پاس بنے نشان کو چھو کر بولی۔ ''یہ کیا ہے؟''

میں نے جلدی سے بالوں کی لٹ درست کر کے اسے چھپانا چاہا تو وہ ایک ادا سے بولی۔ ''ٹیچر اریبہ آپ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتی ہے کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ اور......وہ بھی۔ پھر بولی'' وہ کہتی ہے اس کے خان چاچا بھی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اسے اور اس کی سہیلیوں کو باہر لے جاتے ہیں گھماتے پھراتے ہیں آئسکریم کھلاتے ہیں اور کئی گھنٹے اپنے پاس رکھتے ہیں واپسی پہ پانچ سو روپے بھی دیتے ہیں۔'' میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

میرے کمزور وجود کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ میں کوئی ردعمل نہ کر سکی پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس معصوم کو دیکھ کر انداز و کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ جو بول رہی ہے اسے سمجھتی بھی ہے یا نہیں۔

''تم بھی گئیں اریبہ کے ساتھ؟''

''نہیں ٹیچر ابھی تو نہیں۔''

''جانا بھی نہیں۔ اریبہ کو میرے پاس بھیجو اور سنو۔ یہ سب جو تم نے مجھے بتایا یہ اریبہ سے نہ کہنا۔''

میرے جلتے بلتے وجود میں ایک چیز بہت کام کی تھی۔ میرا دماغ جب میں پریشانی کے ہاتھوں بے بس ہو جاتی تو وہ مجھے سنبھالتا بہت سہارا دیتا اس وقت بھی دماغ کام کر رہا تھا۔ میں نے اریبہ سے یہ سب پوچھا یہ سب شرمناک سی باتیں جو میرے منہ سے ادا بھی نہ ہو رہی تھیں۔ میں نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی تھی۔ باقی بچیوں کو کچھ دیر باہر کھڑے ہونے کو کہا۔ کمرے میں اریبہ اور اس جیسی پانچ لڑکیاں تھیں صرف۔ میں نے خود کو بہت مشکل سے سنبھال کر ایک ایک بات احتیاط سے جاننا چاہی میں نے کہا کہ میں بھی اریبہ کے چاچو سے ملنا چاہتی ہوں سنا ہے وہ بہت اچھے انسان ہیں وہ کچھ دیر مکرتی رہی آنسو بھر بھر کے بھی یقین دلانے کی کوشش کی لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ میں جان کے رہوں گی اور خود بھی اس کے چاچو سے ملنا چاہتی ہوں تو ہر بات مان گئی۔ کیا کیا راز دفن تھے میری ان کو کھ جلی بچیوں کے دل میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجھ سے زیادہ بھی دکھی

اور بے بس لوگ ہیں اس دنیا میں۔ اریبہ نے بتایا اس کا سوتیلا باپ اس کی امی سے بہت پیار کرتا ہے لیکن اس سے بھی اتنا ہی پیار کرتا ہے خان چاچو ابا کا دوست ہے وہ مجھے اور امی کو سیر کرانے لے جاتا ہے بہت کپڑے جوتے لے کے دیتا ہے وہ بتا رہی تھی اگر خان چاچا نہ ہو تو ہم بھوکے ہی مر جائیں۔ ''تمہاری ماں کو پتا ہے کہ تمہارا باپ اور یہ خان چاچا تم سے......'' مجھ سے فقرہ پورا نہ ہوا وہ جھٹ سے بولی ''ہاں جی لیکن دکھاتی ایسے ہی ہے جیسے کچھ پتا نہیں۔ خود مجھے پیسے لینے بھیجتی ہے جب برتن خالی ہوتے ہیں۔ چولہا ٹھنڈا پڑا ہوتا ہے تو...... کہتی ہے جا چاچے سے پیسے لے آ۔''

''میں کس کرب سے گزری تھی آپ کو بتا نہیں سکتی۔ لفظ ایسے معاملوں میں ساتھ ہی نہیں دیتے مجھے ایک دم اپنا آپ معتبر لگا زندگی کا کچھ مقصد سمجھ میں آنے لگا شاید میرا اللہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔''

''پہلے بھی یہ سب باتیں سنی سنائی تھیں لیکن اب تو یہ مجھ پہ بیت رہی ہیں میں گونگی بہری کیسے بنتی۔ فرہاد تو جیسا بھی تھا میرا شوہر تھا کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کرتا تھا لیکن اپنی جوانی پہ بہت ناز تھا اسے۔ وہ جانتا تھا مجھے جیسے بھی رکھے میں طلاق لے کے پانچ کنواری بہنوں والے گھر میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی وہ میرے جملہ حقوق کا مالک میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ میری بہت ساری کولیگز اور جاننے والی خواتین کے کم و بیش ایسے ہی شوہر تھے۔ میں نے تو صبر کر لیا تھا۔ پھر مجھ پہ بانجھ کا ٹھپہ بھی لگ چکا تھا لیکن آج کے اس سارے معاملے نے میرے اندر جو ممتا جگا دی تھی وہ تڑپ رہی تھی کلبلا رہی تھی۔ میری سوچ سمجھ مفلوج ہو رہی تھی لیکن میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔''

''تو پھر آپ نے اس سنگین مسئلے کا کیا حل نکالا؟'' مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر یحییٰ نے بمشکل پوچھا۔ طاہرہ کچھ دن سے ان کے پاس لائی جا رہی تھی وہ اس کے جنون اور پاگل پن کی تہہ تک اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میں ان بچیوں کے خان بابا سے ملنے چلی گئی''

''اوہ یہ عجیب حل نکالا۔ آپ قانون کی مدد لیتیں۔''

''گئی تھی میں پولیس اسٹیشن نجانے کس طرح نقاب لپیٹ کے وہاں تک جانے کی ہمت کی تھی۔ تھانیدار نے میری ساری بات سنی پھر ملائی ماری چائے منگوا کے مجھے بھی پینے کی دعوت دی اور بولا بی بی یہاں اندرون کے سینکڑوں گھر اسی طرح چلتے ہیں مرد خود اپنی عورتوں سے یہ دھندا کرواتے ہیں خود بیمار ہیں یا نشئی ہیں زندگی اسی طرح کی ہے یہاں۔ میں نے لمبے چوڑے اخلاقی لیکچر دیے وہ بے تاثر چہرے سے سنتا رہا پھر بولا ''کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟ قانون ثبوت مانگتا ہے۔ میری مانو تو ان جھمیلوں میں نہ پڑو۔ میں اٹھنے لگی تو بازو پھیلا کے بولا قانون آپ کی خدمت کے لیے ہے...... جب جی چاہے آتی جاتی رہیں۔''

ڈاکٹر صاحب حیران نظروں سے اس دلیر عورت کو دیکھ رہے تھے جو دوسروں کی آگ میں جل رہی تھی۔

''کئی جگہ سے مدد مانگی ہر کسی کو ثبوت کی ضرورت تھی کہ زنا بالجبر ہو متاثرہ عورت خود کیس درج کرائے پھر مدد ملے گی کوئی سمجھتا ہی نہیں چاہتا تھا میری بچیوں کا درد۔ اور پھر میں اریبہ کے ساتھ خود چلی آئی وہ سرخ و سفید درندہ نما تگڑا سا مرد خان چاچا مجھے دیکھ کے پاگل ہو رہا تھا شاید اریبہ نے بتا رکھا تھا۔ میں اپنی پوری دلچسپی ظاہر کر رہی تھی کہ یہاں اپنے ذاتی سکون کے لیے آئی ہوں اپنی باتوں سے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی تو وہ بولا ''مس جی آپ کے آنے سے پہلے آپ کا بائیو ڈیٹا جمع کر لیا

ہے فکر ہی نہ کرو اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ یہ تو نہیں چاہیں گی کہ ان رونقوں میں آپ کی بہنیں بھی شامل ہوں۔'' میں دہل کر رہ گئی مجھے احساس ہوا شاید میں غلط راستے پہ نکل آئی ہوں۔ میں ماحول کا جائزہ لینے لگی سہراب خان پشاور سے آیا تھا بتا رہا تھا درآمد برآمد کا دھندہ ہے ادھر کا مال ادھر۔ اس جیسے اور بھی کئی مرد پھرتے تھے کئی نسوانی قہقہے بھی سماعتوں سے ٹکرا رہے تھے اور اریبہ میری بچی میری شاگرد اس شیطان کے کندھوں پہ جھول رہی تھی

''جا چندا مس جی کے لیے جوس لا۔'' سہراب خان نے اریبہ کے ہونٹوں کو چھو کر کہا تو وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ سہراب خان میرے اور قریب آ بیٹھا میرا بدن جلنے لگا مجھے نجانے کیوں ایک دم عورت کے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ عجیب جنس ہے اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتی کبھی بچ نہیں پاتی۔ اور کبھی بچنا نہیں چاہتی'' طاہرہ کانپ رہی تھی ڈاکٹر یحییٰ نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھا تا کہ وہ سنبھل سکے۔

''عورت مرد کے لمس کو ایک پل میں سمجھ پاتی ہے کہ وہ ہمدرد ہے یا لوٹنے والا ہے پھر بھی......

''سہراب خان بڑا فخر محسوس کر رہا تھا کہ میں پڑھی لکھی عورت اس کی زندگی میں خود ہی آ گئی ہوں وہ میرے ناز نخرے اٹھانے لگا وہ مجھے میری مرضی سے چھونا چاہتا تھا۔ اس لیے اس دن جانے دیا۔''

''آپ بچیوں یا ان کی ماں سے ملتیں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ یہ سب جو آپ نے کیا یہ مناسب تو نہیں لگ رہا۔''

''ملی تھی ڈاکٹر صاحب در در گئی سمجھایا ہر کوئی غربت کو جواز بنا کے گندگی اور غلاظت کے گڑھے میں گرا ہوا ہے وہ مجھے سمجھا رہے تھے کہ میں ان کی روزی روٹی برباد نہ کروں۔''

''پھر میں نے سہراب خان سے باہر باہر ملنا شروع کر دیا ایک کوشش اسے بھی سمجھانے کی کی لیکن میں کمزور ثابت ہو رہی تھی ایک رات سہراب خان کے گھر دعوت تھی میرے کہنے پہ ہی رکھی گئی تھی اس کے سارے دوست بلائے گئے بہت صاف ستھرے لباسوں والے غلیظ لوگ جمع تھے میں پلاتی رہی سب پیتے رہے...... جب لڑھکنے لگے تو میں نکل آئی۔ بہت تھک گئی تھی بے تحاشہ...... کون سمجھتا میری تھکن کو۔''

''آپ کے شوہر اس سارے معاملے کو جان نہیں سکے؟ عجیب بات ہے۔'' ڈاکٹر صاحب بولے تو وہ وحشت زدہ آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''میں گھر آئی تو فرہاد گھر پہ ہی تھا۔ آتے ہی مجھ پہ جھپٹا جانور تھا وہ ان گھٹیا اور نیچ لوگوں جیسا شراب کے نشے میں دھت تھا۔ میں نے پہلی بار پوری قوت سے اسے دھکا دیا...... میز میں جا لگا میں روتی رہی اٹھ کے دیکھا نہیں...... میں تھک گئی تھی بہت...... وہ مر گیا۔ اور یہ یہ آپ کے پولیس والے مجھے فرہاد کے قتل کے جرم میں پکڑ لائے...... میں چلاتی ہوں روتی ہوں کہ میں نے فرہاد کا قتل نہیں کیا۔ تو مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔''

ڈاکٹر یحییٰ سر پکڑ کر بیٹھ گئے تبھی وہ ان کا بازو کھینچ کے بولی۔ ''جس رات میں جیل میں آئی اس کی صبح اخبار بھرے پڑے تھے ایک خبر سے کہ اندرون کے ایک گھر میں چالیس مرد عورتیں زہریلی شراب پینے سے مر گئے۔'' وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب ان پولیس والوں سے کہو میرا جرم تو درست لکھیں۔ مجھ سے قسم لے لیں میں طاہرہ اپنے شوہر کی قاتل نہیں ہوں۔'' وہ زور زور سے رونے لگی......

☆☆

انوکھی بساط

سلمان راحت

محبت پر استوار رشتے بہت مضبوط بھی ہوتے ہیں اور بے حد نازک بھی۔ کبھی تو یہ بڑے بڑے طوفانوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور کبھی ذرا سی ٹھیس ان کی شکستگی کا سبب بن جاتی ہے۔ کشادہ دلی اور اعتماد کا متقاضی شاید ہی کوئی اور رشتہ ہوتا ہو۔ لیکن محبت کے تیور بھی نرالے ہوا کرتے ہیں۔ کبھی یہ صحرا میں گل کھلاتی ہے اور کہیں کس کا ہرا بھرا گلشن پھونکنے کے درپے ہوجاتی ہے۔

وفا، محبت اور اعتماد کے نت نئے زاویوں کی رونمائی کرتی ایک بے مثل کتھا۔

سروری نے شفاف ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے برتن سجانے شروع کیے بشریٰ اس کے ساتھ مصروف تھی، کچھ ہی لمحوں میں عرفان احمد کمرے میں داخل ہوگئے۔ سروری ناشتے کا سامان لینے باہر نکل گئی۔ عرفان احمد کے بیٹھنے کے بعد بشریٰ نے ان کے سامنے پلیٹیں لگائیں۔ اسی وقت عرفان اور کئی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں، حالانکہ دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی لیکن ان اٹھی ہوئی منتظر نظروں کا جواب مل گیا صائم اور نمرہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ عرفان احمد کے ہونٹوں پر ایک اعتماد بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے اپنے بچوں کے لیے میں دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

چار افراد کا پرسکون گھر روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگیا گھر کسی ایک فرد سے نہیں بنتا سب ہی اسے مل کر مکمل کرتے ہیں۔ عرفان احمد ناشتے کے ساتھ اخبار پڑھتے تھے اور اہم خبریں پڑھ کر کسی کو مخاطب کیے بغیر اخبار پر نظریں جمائے ان پر تبصرہ کرتے جاتے تھے، لیکن اگر کبھی اتفاق سے ان کی نظر ان کی طرف اٹھ جاتی جن تصور کر کے وہ خبریں سناتے تھے تو انہیں کبھی مایوسی نہ ہوئی کیونکہ سب ہی ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ناشتا خاموشی سے جاری رہا۔ یہ خاموشی اس وقت تک طاری رہتی تھی جب تک عرفان احمد کی اخبار بینی جاری رہتی جونہی وہ اہم خبریں پڑھ کر اخبار رکھتے تو خاموشی ٹوٹ جاتی تھی۔

''آج آپ نے ناشتے کی میز پر تین غلطیاں کیں ڈیڈی شوخ نمرہ نیم شریر مسکراہٹ سے کیا۔

''اوہو۔ کیا۔!''

''آپ نے پراٹھے پر مکھن لگانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد۔

''بری بات نمرہ۔ وہ غلطی نہیں۔ ڈیڈی کا اخبار میں انہماک تھا۔'' صائم نے بہن کو ٹوکا۔

''بڑے حمایتی ہیں اس گھر میں آپ کے ڈیڈی۔ نمرہ نے منہ بنا کر کیا۔

''ہاں صائم تمہارے اس دوست کا کیا حال ہے جس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔

کافی بہتر ہے ڈیڈی! ہاں میں آپ کو بتانے والا تھا کہ آج کالج سے آف کے بعد میں اپنے دوستوں کے ساتھ توفیق کو دیکھنے اسپتال جاؤں گا، نمرہ اپنی سہیلی افرا کے ساتھ رکشا میں آجائیں گی۔

''میں گاڑی بھیج دوں نمرہ۔'' یہ عرفان احمد نے کہا۔

''نہیں ڈیڈی میں رکشا سے آجاؤں گی۔''

ناشتہ ختم ہوگیا: بچے تیار ہو کر کالج چلے گیے، عرفان احمد بھی ضروری تیاریوں کے بعد فائل اٹھا کر جانے کے لیے تیار ہوئے۔ بشریٰ احمد انہیں معمول کے مطابق باہر تک چھوڑنے آئیں، مستعد کھڑے ڈرائیور نے کار کا پہلا دروازہ کھولا اور عرفان احمد کے بیٹھنے کے بعد خود بھی اسٹیرنگ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھادی۔

بشریٰ دور تک کار کو جاتے دیکھتی رہی، پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو گہری سانس لے کر واپس اندر چل پڑی، راستے میں سروری کھڑی نظر آئی۔

''دوپہر کے لیے پوچھ رہی تھی، بیگم جی کیا پکانا ہے۔''

''کوئی بھی سبزی بنالو سروری، بچے شوق سے کھا لیتے ہیں۔ فیصلہ تم خود کرلو۔'' بشریٰ نے کاہلی سے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو بستر پر اس کے موبائل کا ڈائل چمک رہا تھا۔ کوئی میسج یا کال آئی تھی موبائل سیلنٹ پر تھا۔ تمہارے لیے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ اس نے موبائل اٹھایا ہی تھا کہ کال آنے لگی۔ اس نے اٹھا کر نمبر دیکھا اور اسے پہچان لیا جو اس کے ماموں زاد بھائی کا تھا۔

''ہیلو اقبال بھائی۔ میں بشریٰ بول رہی ہوں کیسے ہیں آپ۔''

''بالکل ٹھیک، اور تم لوگ۔''

''سب بالکل ٹھیک ہیں، عرفان ابھی ابھی آفس گیے ہیں انہیں آپ کے فون کا انتظار تھا۔

''ہاں، میرے پاس ان کے آفس کا نمبر مس ہوگیا ہے، مجھے ان کا نمبر دے دو، ویسے میں بہت جلد تم لوگوں کے پاس آرہا ہوں، بہت عرصہ ہوگیا تم سے ملے ہوئے۔

''سر آنکھوں پر!'' بشریٰ نے کہا اور اقبال ہنس پڑا۔''

''کیوں۔'' بشریٰ سے پوچھا۔ آپ ہنسے کیوں۔

''عجیب محاورہ ہے، کوئی کسی کے سر آنکھوں پر کیسے آتا ہے۔''

''آپ کی یہ عادت کبھی نہیں بدلے گی۔'' بشریٰ نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''شاید۔!'' اقبال نے ہنس کر فون بند کردیا۔

انیس سال ہوگئے تھے بشریٰ اور عرفان احمد کی شادی کو انیس سال پہلے جب بشریٰ کی شادی عرفان سے ہوئی تھی تو اس کی عمر انیس سال تھی۔ اس نے تھرڈ ایر کا ایگزام کلیئر کیا تھا کہ دونوں کے والدین نے اچانک ان کی شادی کا فیصلہ کیا اور اپنے بچوں کی رائے لیے بغیر انہیں ایک دوسرے سے منسلک کردیا۔ دونوں کے والدین خوش نصیب تھے کہ بچوں نے کوئی ری ایکشن نہیں دیا حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے کسی نے کسی کو خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا لیکن شاید دونوں کا کوئی مطمع نظر بھی نہیں تھا اس لیے نبھ گئی۔ شادی کے بعد مفاہمت کا سفر ہوتا ہے بعض اوقات یہ سفر عمر کی آخری منزل تک جاری رہتا ہے اور کبھی کبھی کسی بھی عمر میں جا کر کوئی ایسا جھٹکا لگتا ہے کہ سب کچھ اتھل پتھل ہوجاتا ہے۔

شادی سے پہلے انہوں نے صرف تین بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا، پہلی بار اس وقت جب لڑکے والے لڑکی دیکھنے آئے تھے، عرفان احمد بھی ساتھ تھے، ان کے والدین نے فوری لڑکی پسند کرلی تھی، بشریٰ بے حد خوب صورت تو نہیں تھی لیکن پرکشش تھی سرخ وسفید رنگت کی مالک سبک نقوش والی تھی، اسی طرح بشریٰ کے گھر والوں کو بھی عرفان احمد آئے تھے۔ ان کی اپنی فرم تھی' مناسب حیثیت تھی' خاندان بھی چھوٹا تھا ایک بہن جس کا نام نشرہ تھا عرفان سے دو سال بڑی تھی شادی ہوچکی تھی شوہر کا نام علی تھا جو ایک بینک میں اے وی پی لگا ہوا تھا۔

دوسری بار اس وقت جب عرفان کے گھر والے باقاعدہ پیغام لے کر آئے تھے تیسری بار جب عرفان نے اسے منگنی کی انگوٹھی پہنائی، پھر ان کی شادی ہوگئی، شادی کے بعد ان کی زندگی روایتی سی گزرتی رہی۔ چھوٹے موٹے اختلاف بھی رہے لیکن یہ سب معمول سے جدا نہیں تھا، ایک سال کے بعد ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے صائم رکھا زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی دونوں نے محسوس کی اور دونوں کی نیت میں ایک استحکام نمودار ہوگیا۔ کس کے دل میں کیا ہے اس کا کبھی اظہار نہیں ہوا تھا' نہ ہی کبھی ان کے اندر کوئی طوفانی محبت جاگی تھی۔ پھر دو سال کے بعد نمرہ اس دنیا میں آئی اور ایک آئیڈیل خاندان وجود میں آگیا، دونوں نے اس مختصر خاندان تک ہی رہنے کا فیصلہ کیا اور بچے پڑھے لکھے ماں باپ کی آغوش میں پروان چڑھنے لگے۔

عرفان احمد ایک ذہین انسان تھا، گھر کی حالت اطمینان بخش تھی اس کی پوری توجہ اپنے کاروبار کی طرف تھی اس لیے کاروبار بھی خوب ترقی کر رہا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور داستانیں بدل رہی تھیں، بزرگ داغ مفارقت دے چکے تھے اس طرح انیس سال گزر گئے اب یہ لوگ کافی دولت مند ہو چکے تھے، مکان بھی بدل لیا گیا تھا اور اب وہ ایک بے حد خوب صورت دو منزلہ مکان میں رہتے تھے چار افراد کا کنبہ تھا نچلی منزل ان کے لیے کافی تھی اوپر کا گھر خالی پڑا رہتا تھا۔

صائم اب اٹھارہ سال کا تھا، اس نے دو سال پہلے میٹرک کرلیا تھا اور اب وہ انٹر سائنس کر کے کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا، اسے اس لائن سے دلچسپی تھی جبکہ نمرہ ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ماں باپ نے دونوں

کے رجحانات کی پذیرائی کی تھی اور انہیں ان کے مستقبل کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔

اقبال حسین بشریٰ کے ماموں کا بیٹا تھا، عمر میں اس سے تین سال بڑا تھا، اس نے کراچی میں تعلیم حاصل کی تھی والدین معمولی حیثیت رکھتے تھے اس نے خود ہی وسائل اکٹھے کیے اور امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے تعلیم وغیرہ بھی حاصل کی اور نوکری بھی کرتا رہا پھر اس نے وہیں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے گرین کارڈ بھی حاصل کرلیا اور وہاں رہتا رہا۔ کوئی سات سال پہلے وہ امریکہ سے آیا تھا تو اس نے ان لوگوں کے ساتھ ہی قیام کیا تھا۔ اس کی امریکن بیوی مارتھا یہاں آکر بے حد خوش ہوئی تھی اقبال بھی اس کے ساتھ بہت خوش نظر آتا تھا، پھر وہ امریکہ چلے گئے اور شکر گزاری کے طور پر انہوں نے فون پر کافی دن تک ان سے رابطہ رکھا پھر رفتہ رفتہ وہ معروف ہوگئے۔

پھر ایک دن اچانک اقبال کا فون آیا ایک دوسرے کی خیر وعافیت کے دوران اقبال نے بشریٰ کو بتایا۔ میں نے مارتھا کو طلاق دے دی ہے۔

''ایں؟'' بشریٰ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''ہاں تمہارے لیے یہ حیران کن خبر ہے لیکن امریکی معاشرے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''آپ کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔''

''خدا کا شکر ہے نہیں، ویسے ایک بات یقینی ہے بشریٰ، پاکستانی معاشرہ ایک خوب صورت روایت رکھتا ہے، اس میں ہر رشتے کا ایک حسن ہے، میں نہ وہاں رہ کر تم دونوں کو دیکھا ہے اور اس پر رشک کیا ہے۔''

''پھر کیا خیال ہے اقبال بھائی، تلاش کروں آپ کے لیے کوئی لڑکی۔؟''

''ارے نہیں، اب تو میں امریکن ہوں۔ اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔'' بات آئی گئی ہوگئی۔

☆☆☆

بشریٰ کا اقبال سے کوئی زمینی رابطہ نہیں تھا، طویل عرصہ تک اقبال سے کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ایک دن ان کا پھر فون آگیا، اس دن اس کی عرفان سے بات ہوئی۔

''عرفان بھائی میں پاکستان میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کر رہا ہوں اس کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے، آپ سے زیادہ میرے لیے اور کون ہوسکتا ہے اگر آپ مجھے قبول کریں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں اقبال بھائی میں حاضر ہوں۔ عرفان نے کہا۔

''مجھے کسی ایسی پاکستانی پارٹی کی ضرورت ہے جو میرے لیے قابل اعتماد ہو میرے لیے آپ سے زیادہ باعث اطمینان اور کون ہوسکتا ہے، آپ کے جواب کے لیے بہت خوشی دی ہے۔''

''ٹھیک ہے اقبال صاحب، آپ مجھے بتائیے کیا کرنا ہے۔''

''آپ کی فرم بھی یہی کام کرتی ہے، آپ کو اس کا بہترین تجربہ ہے۔ آپ میرے لیے قابل احترام بھی ہیں کیونکہ میرے بہنوئی ہیں، اس قربت سے ہمارے رابطے اور مضبوط ہوں گے۔''

''بلاشبہ''

''آپ کے پاس وقت ہے میں آپ سے تھوڑی سی تفصیلی بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔'' عرفان احمد نے خوش دلی سے کیا۔

دونوں دیر تک ان اشیاء کے بارے میں باتیں کرتے رہے جن کی امریکہ کی مارکیٹ میں کھپت تھی۔ اقبال نے کہا۔

''میں کافی دن سے یہاں سروے کر رہا ہوں اور میں نے بہت دور دور تک کا جائزہ لیا ہے۔'' بہت دیر تک یہ لوگ کاروباری باتیں کرتے رہے پھر دوبارہ رابطے کے وعدے کیے گئے اور فون بند ہوگیا عرفان احمد نے پوری تفصیل بشریٰ کو بتائی، پھر بولا۔

''میں بہت عرصہ سے اپنے کاروبار کو بیرون

ملک پھیلانے کے بارے میں سوچ رہا تھا، یہ تو میرا بہت پرانا خواب پورا ہو رہا ہے، ہمارے لیے اقبال حسین سے زیادہ قابل اعتماد اور کون ہوسکتا ہے، ویسے ساری باتوں سے الگ اقبال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔''

''میں آپ کو بتاؤں ان لوگوں سے ہمارے کبھی زیادہ تعلقات نہیں رہے اقبال حسین کے والد مقبول حسین ہمارے دور کے ماموں تھے وہ بہت خشک مزاج اور قدرے لیے دیے رہنے والے تھے۔ بس شادی بیاہوں میں ہی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی، بلکہ سب سے زیادہ تفصیلی ملاقات اس وقت رہی تھی جب وہ اپنی امریکی بیوی مارتھا کے ساتھ آئے تھے۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ ان کے ساتھ کام کیا جائے یا نہیں''

''آپ باہر کی دنیا سے واقف ہیں، جو کریں سوچ سمجھ کر کریں۔''

اس گفتگو کو کوئی دس دن گزر گئے عرفان احمد نے بہت غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ انہیں یہ کر لینا چاہیے لیکن وہ اپنا وقار رکھنا چاہتے تھے اس نے انہوں نے اقبال ہی کے فون کا انتظار کیا، پھر انہیں اقبال کا فون موصول ہوگیا اس نے عرفان احمد کے آفس کیا تھا، بعد دونوں میں بڑی تفصیلی باتیں ہوئیں، عرفان احمد نے اس شام گھر آکر بڑے خوش گوار لہجے میں بشریٰ کو تفصیل بتائی۔

''اگر یہ سب خوش اسلوبی سے ہوا تو ہم بہت اعلیٰ پیمانے پر اس کام کو فروغ دے سکیں گے۔''

☆☆☆

پھر اس کام کا آغاز ہوگیا، اقبال نے امریکہ میں کے نام سے فرم قائم کی۔ اور بہت اچھے انداز میں کام شروع ہوگیا، کچھ ہی عرصہ میں عرفان احمد کو لاکھوں روپے کا فائدہ ہونے لگا اور اقبال کی اس گھر میں بڑی اہمیت ہوگئی۔ ان لوگوں کا فون پر روزانہ رابطہ رہتا تھا، اقبال بشریٰ کو گھر پر الگ سے فون کرتا تھا اور کی بڑی تعریفیں کرتا تھا جن سے بشریٰ کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے بشریٰ چاہے ایک فون کے بارے میں عرفان احمد کو بتاتی تھی باقی گول کر جاتی تھی اس میں سے وہ اپنے بارے میں کسی تعریفی باتوں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔

تقریباً ایک سال گزر گیا، ان کے کاروبار نے خوب ترقی کی تھی پھر ایک روز اقبال کے فون پر کہا کہ وہ پاکستان آرہا ہے۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے ہم انتظار کریں گے''

''لیکن اس کے علاوہ ایک اور خبر ہے۔''

''وہ کیا۔؟''

''میں مستقل طور پر پاکستان آنا چاہتا ہوں۔ عرفان کو بہت شاک لگا لیکن اس نے خود کو سنبھال کرلیا۔

''مزید خوشی کی بات ہے، وہاں کا کام کون سنبھالے گا۔''

''مکمل بندوبست کر کے آؤں گا کام ایسے ہی جاری رہے گا۔ بس دیار غیر سے دل اکتا گیا ہے، اپنا دیس اپنا ہی ہوتا ہے ویسے بھی میں نے اندازہ کیا ہے کام پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے گا۔

''ضرور کب تک آرہے ہو۔''

''آپ کو اطلاع کردوں گا، وہی بات ہے آپ لوگوں کے سوا یہاں میرا اور کون ہے، اپنے اس پاس کہیں کرائے کا گھر دلوا دیجیے گا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں عرفان نے کہا''

☆☆☆

گھر آکر عرفان نے بشریٰ کو پوری بات بتائی!

میری تر جمان ہی نکل گئی تھی وہ تو تنہا انسان ہے بے شمار دولت کما چکا ہے لیکن ہم بال بچوں والے ہیں کاروبار بہترین ہو چکا ہے، مجھے تو بڑی امید ہوگئی ہے کہ ہم کروڑ پتی بن جائیں گے ہمارے بچے کروڑ پتی ماں باپ کی اولاد کہلائیں گے، اور ہم اپنے بچوں کو کیا دے سکتے ہیں، بس ہم پلہ گھرانے میں اپنی نمرہ کی شادی۔ صائم کی بہترین تعلیم۔''

''پھر۔'' بشریٰ نے پوچھا۔''

"نہیں یہ میرا خدشہ بے بنیاد نکلا"
"کیسے؟"
"ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کا مکمل بندوبست کر کے رہیں گے، دوسری بات یہ ہے کہ اب وہ کراچی کے بجائے یہیں ہمارے شہر میں قیام کریں گے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے، آپ لوگ قریب رہ کر زیادہ اچھی طرح کام کر سکیں گے اور اگر ضرورت ہو تو آپ ان کے ساتھ امریکہ کا کاروباری دورہ بھی کر سکتے ہیں۔"
"انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مجھے فون کریں گے اور میں کسی پوش علاقے میں ان کے لیے کرائے کے گھر کا بندوبست کر دوں۔"
"یہ مشکل تو نہیں ہوگا، آپ کسی بھی اسٹیٹ ایجنٹ سے۔"
"میرے ذہن ایک اور بات آئی تھی۔"
"کیا۔؟"
"ہم انہیں اپنے گھر میں بھی جگہ دے سکتے ہیں۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی ہے ایک دو کمرے ان کے لیے ڈیکوریٹ کر دیں گے۔"
"اوہ سوچ لیں دوسری ذمے داریاں بھی اٹھانی پڑیں گی کھانے پینے کی بھی۔"
"تنہا انسان کے لیے اتنا سا کچھ کر لینا کون سا مشکل ہے، سروری ایک شخص کا کھانا زیادہ پکائے گی تو کون سی مصیبت آجائے گی۔"
"جیسا آپ چاہیں۔"
"کام کا آدمی ہے بھائی اور پھر تھوڑا بہت رشتہ بھی ہے میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں ہے" عرفان احمد نے ہنستے ہوئے کہا بشریٰ گردن ہلانے لگی۔
یہ لوگ اقبال کے فون کا انتظار کرنے لگے پھر اس کا فون آ گیا "جی عرفان بھائی سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، تفصیل آپ کو میاں آ کر بتاؤں گا، آپ دیکھیں میں وہاں آکر کاروبار میں مزید چار چاند لگا دوں گا۔"
"مجھے اندازہ ہے" عرفان احمد نے کہا۔
"تو اب آپ جلدی سے میرے لیے گھر کا بندوبست کر کے مجھے اطلاع دیں جیسے میں آپ کو گھر مل جائے آپ مجھے اطلاع دیں میں چل پڑوں گا۔"
"بندوبست ہو چکا ہے" عرفان احمد نے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"آپ ہمارے ساتھ رہیں گے، ایک کشادہ گھر کی پہلی منزل پر جس میں چار بیڈ روم ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، چار اٹیچ باتھ اور خوب صورت کشادہ ٹیرس ہے، پھر اوپر کشادہ چھت جس تک جانے کا زینہ بھی ہے۔"
"ارے نہیں، آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔"
"بالکل تکلیف نہیں ہوگی، یہ کیسے ممکن ہے کہ گھر موجود ہے اور آپ کرائے کے گھر میں تنہا رہیں۔"
"میں بے حد شکر گزار ہوں، خیر میں آرہا ہوں آپ کا مہمان رہوں گا باقی فیصلہ بعد میں کر لیں گے۔" اقبال نے کہا

☆☆☆

بیس دن کے بعد وہ آ گیا، اس نے اپنی فلائٹ کے بارے میں اطلاع دے دی تھی اور عرفان اور بشریٰ نے ایئرپورٹ پر اس کا استقبال کیا تھا۔
"آپ لوگوں نے میری بڑی عزت افزائی کی ہے، میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس نے کہا۔"
"آپ کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے"
"کاروبار اپنی جگہ وہاں رہ کر انسان رشتوں سے دور ہو جاتا ہے لیکن رشتوں کا اپنا مقام ہوتا ہے میرا کوئی نہیں تھا لیکن آپ لوگوں کی اپنائیت نے بڑی ڈھارس دی ہے۔"
"ہم آپ کے اپنے ہیں اقبال بھائی۔"
"بچے خیریت سے ہیں۔"
"ہاں۔ آپ کو لینے آتے مگر تعلیم حاصل کرنے کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔"
"نہیں۔ یہ تو اچھی بات ہے۔"
یہ لوگ اقبال کو گھر لے آئے۔ پہلے جب اقبال

مارتھا کے ساتھ آیا تھا تو وہ دوسرا گھر تھا اس گھر کو دیکھ کر اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے، اوپر کی منزل میں اپنی رہائش کی جگہ دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گیا۔
"کتنا خوب صورت گھر ہے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، آپ لوگوں کی جو روٹین ہے آپ پلیز اسے ڈسٹرب نہ کریں اپنے سارے کام اپنے شیڈول کے مطابق کریں، مجھے خوشی ہوگی۔"
بچے آئے، ان سے ملاقات ہوئی، رات کے کھانے کے بعد کاروباری باتیں ہوئیں جو اطمینان بخش تھیں، پھر ذاتی باتیں ہوئیں۔
"بس اب ہم آپ کو امریکہ واپس نہیں جانے دیں گے میں آپ کی اچھی سی لڑکی سے شادی کراؤں گی۔" بشریٰ نے کہا اور اقبال ہنسنے لگا۔
"بوڑھا ہونے جا رہا ہوں۔ اب لڑکی سے شادی کروں گا۔"
"ارے ارے ارے، یہ آپ اچانک بوڑھے کیسے ہو گئے۔" بشریٰ نے پیار سے کہا اور اقبال نے اس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈالی پھر سرد آہ بھر کر بولا۔
"بس...... کبھی کبھی حالات عمر کو بہت آگے لے جاتے ہیں۔"
"ایک پرسنل بات پوچھ رہی ہوں اقبال بھائی! آپ نے مارتھا کو کیوں چھوڑ دیا۔"
"تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ ذہنی طور پر میں پاکستان تھا۔ وہ جس معاشرے سے تعلق رکھتی تھی وہ میرے مزاج سے مختلف تھا۔ ہم دونوں کی نہ بن سکی۔ لیکن...... پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں دوبارہ شادی نہیں کروں گا۔"
"کسی پاکستانی لڑکی سے بھی نہیں؟"
"پتا نہیں۔" اقبال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
اقبال کافی مطمئن تھا۔ ان لوگوں نے اسے بہت محبت اور احترام دیا تھا۔ عرفان نے اس سے کہا تھا کہ ابھی وہ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھے اور آرام کرے، کاروباری معاملات کچھ دن آرام کے بعد دیکھے جائیں گے۔ انہوں نے بشریٰ کو ہدایت کی کہ اقبال کو کمپنی دے۔ دونوں بچوں نے بھی سرسری طور پر اقبال سے سلام، دعا کی تھی۔ وہ اس سے امریکہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔
دوسرے دن عرفان احمد تو کام پر چلا گیا۔ بچوں نے اقبال کے اعزاز میں چھٹی کر لی تھی۔ باہر گھومنے کا فیصلہ کیا گیا اور سب چل پڑے۔ خوب سیر و سیاحت کی گئی۔ کھایا پیا گیا۔ صائم اور نمرہ بھی اقبال سے خوب گھل مل گئے۔ سارا دن گزر گیا اور خاصی رات ہو گئی جب وہ گھر واپس آئے۔ عرفان بھی گھر آ چکا تھا۔ سب کو خوش دیکھ کر اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔
"کیسا دن گزرا اقبال صاحب۔" عرفان نے پوچھا۔
"عجیب سا تاثر ہے۔" اقبال نے کہا۔
"بتایئے۔"
"سچ تو یہ ہے کہ عرفان بھائی کہ لوگ اپنے وطن اپنے ماحول کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلے جاتے ہیں اور خود کو وہاں کے ماحول میں ضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہاں ہمارے اپنے نہیں ہوتے۔ ہمارے دیس کی فضا نہیں ہوتی۔ یہ اس مٹی کی خوشبو نہیں ہوتی۔ اس خوشبو کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ یہاں کی باتیں ہماری اپنی ہوتی ہیں۔ آج مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا بھی ایک گھر ہو۔ میرے اپنے بھی ہیں۔ ان دونوں بچوں نے مجھے بڑی اپنائیت سے روشناس کرایا ہے۔"
"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آپ کا دل نہ لگے اور آپ امریکہ واپس جانے کے بارے میں نہ سوچیں۔"
"نہیں...... لاہور چلے بھی آیا ہوں۔ یہ تو وہ تاریخی شہر ہے جس کی روایات بڑا مقام رکھتی ہیں۔"
رات کو بیڈروم میں عرفان نے بشریٰ سے کہا۔

''اقبال بھائی خاصے خوش نظر آرہے ہیں۔''

''ہاں مزاج کے بھی اچھے ہیں۔ اصل میں پہلے کبھی ساتھ میں نہیں رہا۔ اب قریب آئے ہیں تو طبیعت کا پتا چلا ہے۔'' بشریٰ نے سادگی سے بتایا۔

''کاروباری سلسلے میں بھی ہمیں بڑے مفادات حاصل ہوں گے۔ مجھے تو بڑی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ میرے دیرینہ خواب پورے ہوتے نظر آرہے ہیں۔ یہ ہی خواب دیکھے تھے میں نے کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں میرا کاروبار پھیلا ہو۔''

اقبال بہت خوش تھا۔ اس نے عرفان کے آفس جاکر اس کا سیٹ اپ بھی دیکھا اور بے حد تعریف کی۔ اس نے کہا۔ ''اصل چیز سلیقہ ہوتی ہے عرفان بھائی۔ جب میں مارتھا کے ساتھ آپ کے پاس آیا تھا، تو میں نے آپ کے کاروبار پر غور نہیں کیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن اب آپ کی ذہانت اور کارکردگی دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ میں نے کتنا عمدہ فیصلہ کیا تھا۔''

عرفان رات کو اپنے بیڈ روم میں بشریٰ کو یہ ساری باتیں خوش ہوکر بتاتا اور کہتا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں یہاں ان کا زیادہ سے زیادہ دل لگ جائے۔ ہمارے لیے بڑے فائدے کی بات ہے۔ کچھ عرصہ عرصہ کے بعد میں آفس میں ان کے لیے کمرہ تیار کرادوں گا۔ وہ یہاں کا نظام سنبھال لیں گے اور میں دنیا بھر کے ممالک کے دورے کروں گا۔''

☆☆☆

اقبال کے لیے ایک کار مخصوص کردی گئی تھی، جسے لے کر بشریٰ اور وہ نکل جاتے تھے۔ صائم اور نمرہ کو کالج چھوڑتے، انہیں ساتھ لے آتا، عموماً دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھایا جاتا، البتہ رات کا کھانا سب ساتھ کھاتے تھے۔ یہ سب عرفان کی مرضی سے ہوتا جو کبھی کبھی رات بھر ایک اچھے مستقبل کی پلاننگ کرتا رہتا تھا۔

اس دن بھی وہ ایک خوب صورت ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اقبال سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں اقبال بھائی!''

''بس بشریٰ! اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''سچ لکھا...... کبھی کبھی چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے۔ مجھے اپنی اب تک کی زندگی کے بارے میں سوچ کر خود پر ترس آتا ہے۔ کسی نے مجھے یہ کیوں نہیں سمجھایا کہ اپنا دیس، اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ تم...... صائم، نمرہ جب میرے ساتھ کہیں گھوم رہے ہوتے ہو، تو مجھے عرفان کا خیال بھی نہیں آتا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ ہوں۔ یہ سب میرے اپنے ہوں۔ میں چشم تصور سے ان کیس اتھ دنیا گھوم رہا ہوں۔ امریکہ، لندن، پیرس، سوئٹزر لینڈ اور نہ جانے کہاں کہاں...... سب بے حد خوش ہوں۔ دنیا کے سفر کا لطف اٹھا رہے ہوں۔ اور...... اور......''

''اور کیا......؟'' بے اختیار بشریٰ کے منہ سے نکلا۔

''پھر ان جاگتے خوابوں سے آنکھ کھل جاتی ہے۔'' اقبال نے یاس بھرے لہجے میں کہا اور پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

عام سی بات تھی، لیکن نہ جانے کیوں آج بشریٰ کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ''جیسے میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ ہوں۔ یہ سب میرے اپنے ہوں۔ میں ان کے ساتھ گھوم رہا ہوں۔ امریکہ، لندن، پیرس......'' پھر اسے عرفان کے الفاظ یاد آئے۔ ''وہ یہاں کا نظام سنبھال لیں گے اور میں دنیا بھر کے دورے کروں گا۔ میں صرف میں......'' اس نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ ہم دنیا کے دوسرے ممالک کے دورے کریں گے۔

☆☆☆

دوسرا دن معمول کے مطابق تھا۔ عرفان معمول کے مطابق آفس چلا گیا۔ صائم اور نمرہ کالج چلے گئے۔ گھر میں نوکر اور اقبال اور بشریٰ رہ گئے۔

''جی جناب! کہیں چلا جائے؟'' بشریٰ نے

پوچھا۔

''آج باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' اقبال نے کاہلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' بشریٰ نے خوش دلی سے کہا۔

''بعض اوقات میں بہت بددل ہوجاتا ہوں بشری، عرفان اس بات پر بہت خوش ہیں کہ ہم دونوں مل کر اس کاروبار کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیں گے۔ ان کا سوچنا ایک معنی رکھتا ہے، ان کے بیوی، بچے ہیں، میرا کون ہے، میں کس کے لیے یہ سب سوچوں؟

''میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہوں اقبال بھائی کہ آپ کو شادی کرلینی چاہیے۔'' بشریٰ نے کہا۔

''تمہارے خلوص پر مجھے شبہ نہیں ہے بشریٰ۔ مارتھا سے میں نے بڑے اعتماد سے شادی کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم دونوں اس شادی سے بہت خوش رہیں گے۔

مارتھا کو میں بہت پہلے سے جانتا تھا۔ وہ بہت اچھی خوش مزاج اور تعاون کرنے والی لڑکی۔ لیکن شادی کے بعد اس کے اندر بے مقصد تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ میں نے اس سے بارہا پوچھا کہ ایسی کون سی توقعات ہیں جو پوری نہیں ہورہی۔ لیکن اس اس کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کردیا اور آخرکار مجھے اسے طلاق دینا پڑی۔ کافی عرصہ تک میں اس بات کا تجزیہ کرتا رہا کہ ایسا کیوں ہوا۔ گر میری سمجھ میں آج تک کچھ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ میں شادی سے خوف زدہ ہوگیا۔ بشریٰ میں بری طرح الجھا ہوا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی میرے سینے میں ہو۔ کوئی ایسا، کوئی ایسا جو میرے دل کی گہرائیوں سے واقف ہو۔ کتنی بار میں نے سوچا کہ عرفان کتنے خوش قسمت ہیں کہ انہیں تم جیسی بیوی کا قرب حاصل ہے۔ میں بڑی حسرت سے سوچتا ہوں کہ ایسی ہی کوئی فیملی میری ہوتی، جیسی عرفان کی ہے۔''

اس دن بشریٰ بڑی کھوئی کھوئی رہی۔ اس کے ذہن میں بھنور پڑتے رہے۔ عرفان سے اس کی شادی لو میرج نہیں تھی۔ ماں، باپ کا فیصلہ تھا جو دونوں نے قبول کرلیا تھا اور آج تک اس فیصلے کو نبھا رہے تھے بس...... اس قربت میں کوئی جذباتی کیفیت کبھی شامل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج کی اقبال کی باتوں نے بشری کے دل میں ایک خلش سی بیدار کردی تھی۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہورہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اقبال اس سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔

پھر وہ الجھتی ہی چلی گئی۔ کتنی دن گزر گئے۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر عرفان اور اقبال کاروباری باتیں کرتے، عرفان، اقبال کو کام کی تفصیل بتاتے اور اقبال مسکراتا رہتا۔

''میں خلوص دل سے تسلیم کرتا ہوں عرفان بھائی کہ آپ ایک بہترین کاروباری دماغ رکھتے ہیں۔ میں آپ کی ذہانت کو نہیں چھو سکتا۔ بس آپ مجھے اپنا اسسٹنٹ سمجھیں اور احکامات دیتے رہیں، آپ جب حکم دیں گے بس آفس بیٹھنا شروع کردوں گا، لیکن کچھ روز کے لیے مجھے چھٹی دے دیں۔''

''آپ کیسی باتیں کررہے ہیں اقبال بھائی! آپ جب تک دل چاہے آرام کریں اور جب دل چاہے آفس کو جائیں۔ یہ مرحلہ حل ہوگیا۔ اب اقبال ہوتا اور بشریٰ دونوں ہر لمحہ ساتھ رہتے تھے۔ ان کے درمیان یگانگت بڑھتی جارہی تھی۔ ہر وقت باتیں کرتے رہنے، نمرہ اور صائم کالج چلے جاتے اور دونوں ایک دوسرے میں کھو جاتے، وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ نمرہ اور صائم آجاتے، سب لوگ مل کر کھانا کھاتے۔ کبھی کبھی بشریٰ ان حالات سے خوف زدہ ہوتی۔ یہ کیا ہورہا ہے۔ اقبال اپنا اپنا کیوں ہوتا جارہا ہے۔ وہ ایک غیر مرد ہے۔ لیکن وہ اس کے دل میں اترتا جارہا ہے۔

☆☆☆

جب کافی وقت گزر گیا تو خود اقبال ہی کو خیال

آیا۔ کاروبار سے اس کی اتنی دوری بھی مناسب نہیں تھی۔ اس نے خود ہی عرفان سے کہا۔

''باس میری چھٹیاں ختم ہوگئیں؟''

''کیا مطلب؟'' عرفان نے کہا۔

''مطلب یہ کہ خادم اب ڈیوٹی پر آنا چاہتا ہے۔''

عرفان مسکرا دیا۔ دوسرے دن سے اقبال نے دفتر جانا شروع کردیا۔ عرفان نے اس کے لیے شان دار آفس تیار کرادیا تھا۔ پورے اسٹاف نے اقبال کا احترام کیا اور اقبال بہت خوش ہوا۔ ماحول کی یہ تبدیلی بھی خوش گوار تھی۔ اقبال نے روزانہ آفس جانا شروع کردیا۔ چونکہ ملک سے باہر رہا تھا، اس لیے اصولوں کا پابند تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتے ہی وہ اٹھ جاتا تھا اور سیدھا گھر آجاتا تھا۔ جبکہ عرفان کا شروع ہی سے گھر آنے کے وقت کا تعین نہیں تھا۔ کاروبار میں روز افزوں ترقی ہورہی تھی۔ اقبال نے بہترین سیٹ اپ بنادیا تھا۔ پھر اس نے کچھ اور اقدامات کیے۔ ایک شان دار پلاٹ خرید کر اس پر بے حد خوب صورت مکان بنوانا شروع کردیا۔ اب اس کے اور بشریٰ کے درمیان بے حد اپنائیت دیکھی جاتی تھی۔ اکثر دونوں سر جوڑے بیٹھے۔ باتیں کرتے رہتے تھے۔ بشریٰ اس کا حد سے زیادہ خیال رکھتی تھی۔ دو، تین بار ایک عجیب بات ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ ایک دن نمرہ نے اچانک ان دونوں کو عجیب سے انداز میں دیکھا۔ جوان ہوگئی تھی اور زندگی کے بہت سے رموز سے آشنا ہوگئی تھی۔ دونوں جس کیفیت میں نظر آئے تھے وہ غیر معمولی تھی۔ نمرہ دھک سے رہ گئی۔ پھر اس نے ان کی ٹوہ رکھنا شروع کردی۔ اور کئی بار غیر حقیقی مناظر دیکھے۔ لیکن پھر دوبارہ وہ اس عمل میں پکڑی گئی۔ اقبال نے تو اس سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن بشریٰ کے۔ رویے میں کچھ سختی آگئی اور اس کی وجہ نمرہ کی سمجھ میں آگئی تھی۔ دونوں ماں، بیٹیوں کے رویے میں کچھ کھنچاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ نمرہ اب ہر وقت پریشان سی رہتی تھی، جسے بشریٰ شدت سے محسوس کررہی تھی۔

پھر اس گھر میں پہلا بدترین رونما ہوگیا۔ اس دومنزلہ گھر کی اوپری منزل پر اقبال رہتا تھا۔ اس سے اوپر چھت پر برساتی بنی ہوئی تھی۔ ایک بڑا سا شیڈ جس میں باتھ روم بھی بنایا گیا تھا۔ البتہ باقی چھت سپاٹ تھی، اس کے کناروں پر کوئی گرل وغیرہ نہیں لگائی گئی تھی۔ فی الحال تو ضرورت نہیں تھی، لیکن اس طرح کے انتظامات چھوڑے گئے تھے کہ اگر ضرورت پڑے تو وہاں اور کمرے وغیرہ بنوائے جاسکیں۔ تیز بارش ہوتی تو اکثر یہ لوگ اوپر چلے جاتے اور شیڈ کے نیچے بیٹھ کر بارش انجوائے کرتے۔ اقبال کو بارش بہت پسند تھی۔ اس دن بھی زبردست بارش ہورہی تھی۔ سڑکیں جل تھل ہوگئی تھیں۔ اقبال بارش انجوائے کرنے وقت سے پہلے گھر آگیا تھا۔ بارش موسلا دھار برس رہی تھی اور رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نمرہ چھت پر آگئی۔ وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ صائم اپنے کسی دوست کے ہاں گیا ہوا تھا۔ پہلے جب بارش ہوتی تھی تو عموماً سب اس چھت پر آجاتے تھے۔ خوب کھانا پینا ہوتا تھا، لیکن اب یہاں کی ریت بدل چکی تھی۔ بشریٰ فون کرکے عرفان کو بلا لیتی تھی۔

سروری پکوان پکا رہی ہے۔ جلدی آجایے اور عرفان سارے کام چھوڑ کر آفس سے آجاتا تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ کن گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیا الجھن تھی۔ ایک عجیب سا بوجھ، ایک عجیب سا بوجھ، ایک عجیب سا احساس۔

اس نے گہری سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آہستہ آہستہ کم ہورہی تھی، لیکن اچانک، اچانک اس کے قدم لڑکھڑائے اور دوسرے لمحے کانوں میں سنسناہٹ ابھری اور بس...... اور کچھ نہیں۔

ہاں کچھ ہی لمحوں میں بشریٰ کی دلخراش سوچ ابھری تھی۔ ہائے میری بچی۔ پھر اس کی دلخراش چیخیں آسمان ہلانے لگیں۔ سروری اور دوسرے ملازم نے قریب آکر دیکھا۔ نمرہ کا خون آلود بدن ٹوٹا پھوٹا۔ ٹیڑھا میڑھا، پکے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر پاش

پاش ہوگیا تھا۔ اس کے سر سے ابلنے والے خون میں مغز کی سفیدی بھی شامل تھی۔ اس کی گردن ٹیڑھی ہوگئی تھی اور دایاں ہاتھ پشت کے نیچے دبا ہوا تھا۔

بشریٰ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور اقبال اسے سنبھال رہا تھا۔ عرفان بے چارہ آفس میں تھا۔ اقبال اسے سنبھال کر کمرے میں لایا۔ سروری کو اس کے پاس چھوڑا اور عرفان کو فون کرنے دوڑا۔ عرفان یہ سن کر خود بدحواس ہوگیا۔

''میں آرہا ہوں۔'' بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

ادھر بشریٰ کی دلخراش چیخیں باہر کسی نے سن لیں اور کچھ نہ سمجھ کر پولیس کو فون کردیا کہ دس نمبر کے گھر میں کوئی واردات ہوگئی ہے۔ پولیس موبائل شاید کہیں قریب تھی، اس لیے جلد ہی پہنچ گئی۔

ادھر شہر میں جگہ جگہ بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ڈرائیور کو سست رفتاری سے گاڑی چلانی پڑی۔ چنانچہ جب وہ گھر پہنچا تو پولیس گھر کے اندر موجود تھی اور ضروری کارروائی کررہی تھی۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بھی حواس باختہ ہوگیا۔ ادھر صائم کو بھی خبر کردی گئی تھی۔

پولیس نے پوری تفتیش کی۔ جائے کو دیکھا۔ لاش کی بری حالت کی تصویریں بنائی گئیں اور اس پر چادر ڈال دی گئی۔ بشریٰ پر مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور اس غشی کم ہوتی تو وہ نمرہ کا نام لے کر چیخنے لگی۔ پولیس کے افسران نے اوپر جاکر حادثے کی وجوہات بھی معلوم کی تھیں۔ چھت پر جگہ جگہ پانی جمع تھا اور جمع ہوجانے والی مٹی گیلی ہوکر کیچڑ میں بدل گئی تھی۔ چھت کے کناروں پر کوئی روک نہیں تھی۔ وہ بے دھیانی میں کناروں تک پہنچ گئی اور کیچڑ میں اس کا پاؤں پھسل گیا۔

نمرہ کی دردناک موت نے اس گھر کے در و دیوار ہلا دیے۔ اتنا اچانک اور غیر متوقع حادثہ تھا کہ ہر شخص گنگ ہوکر رہ گیا۔ ایک طرف دونوں ماں، باپ شدت غم سے نڈھال تھے تو دوسری طرف سب سے بری حالت صائم کی تھی۔ دونوں بہن، بھائی ایک دوسرے کی محبت کا مرکز تھے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ایک جان دو قالب تھے۔ ان کا سارا وقت ساتھ گزرتا تھا، ایک کے بعد دوسرا نامکمل تھا۔

اقبال بھی یہاں آکر ان لوگوں میں کھو گیا تھا۔ وہ بھی اس حادثے سے مرجھا کر رہ گیا تھا۔ ایک فرد کی جدائی نے سارے ماحول کو غمزدہ کردیا تھا، لیکن بس...... وقت کی مجبوریاں، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہونے لگا۔ اقبال کی منصوبہ بندیاں بے مثال تھیں، کاروبار طوفانی انداز میں ترقی کررہا تھا۔ نمرہ کی جدائی کبھی نہیں بدلی جاسکتی تھی، لیکن جینا تو تھا۔

☆☆☆

گھر کے معمولات میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ بشریف سب سے پہلے جاگتی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں داخل ہوتی۔ سروری سے اپنی نگرانی میں ناشتا تیار کراتی۔ پھر جب ناشتا میز پر لگ جاتا تو عرفان ناشتے کے کمرے میں داخل ہوتا، اقبال بھی اس کے ساتھ ہی آتا تھا۔ آج بھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ناشتا میز پر آگیا تھا۔ صائم اور اقبال بھی موجود تھے، لیکن عرفان نہیں آیا تھا۔ سرسری گفتگو کرتے ہوئے اقبال نے چونک کر کہا۔

''عرفان نہیں آئے۔ خیریت ہے۔''

''ایں ہاں...... پتا نہیں کہاں رہ گئے۔'' بشریٰ بولی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' اقبال نے پوچھا۔

''ہاں...... مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ صائم جاؤ بیٹے، دیکھو تو سہی، ڈیڈی ابھی تک کیا کررہے ہیں۔'' صائم اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن چند ہی منٹ میں وہ گھبرایا ہوا واپس آگیا۔

''مما...... پتا نہیں، پتا نہیں...... ڈیڈی کو کیا ہوا ہے۔ جلدی چلیں، پتا نہیں، پتا نہیں۔'' صائم کی آواز بری طرح کپکپا رہی تھی۔ اقبال اور بشریٰ گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔

''کیا ہوا، کیا ہوا، بالکل ٹھیک تھے، آرام سے سو رہے تھے۔'' یہ کہتی ہوئی بشریٰ بیڈ روم کی طرف

بھاگی۔ اقبال اور صائم بھی اس کے پیچھے تھے۔

بشریٰ ہانپتی کانپتی بیڈ روم میں گھس گئی۔ تب اس نے عرفان کو دیکھا۔ وہ بڑا بے ترتیب، مسہری پر پڑا تھا۔ گردن مڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں بے نور تھیں، ان میں زندگی کی چمک نہیں تھی۔

''ارے...... یہ......'' اقبال کے منہ سے نکلا۔ اس نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر عرفان کے بدن کو چھو کر دیکھا اور اس کے منہ سے نکلا۔ او مائی گاڈ۔

''کیا ہوا...... کیا ہو گیا۔'' بشریٰ نے بھنچی بھنچی چیخ مار کر کہا اور پھر مسہری پر چڑھ گئی۔ عرفان کے سرد اور اکڑے ہوئے بدن کو دیکھ کر وہ زور، زور سے چیخنے لگی۔ ''کیا ہو گیا۔ ہائے انہیں کیا ہو گیا۔ یہ تو بالکل ٹھیک تھے۔ ارے کیا ہو گیا، کیا ہو گیا۔'' بشریٰ پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ سروری اور دوسرا نوکر بھی چیخ و پکار سن کر اندر آ گئے۔ بشریٰ حلق پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے عاری ہو گئی تھی۔

''صائم! مما کو سنبھالو۔ پتا نہیں یہ کیسے ہو گیا۔'' اقبال نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''اقبال انکل۔'' صائم کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''کسی ڈاکٹر کا نمبر معلوم ہے۔'' اقبال نے پوچھا۔

''ہاں...... ڈاکٹر فیاض! ان کا نمبر انڈیکس میں ہے۔''

انڈیکس میں ڈاکٹر فیاض کا نمبر تلاش کر کے اسے فون کیا گیا اور بیس منٹ کے اندر ڈاکٹر فیاض پہنچ گیا۔ سب لوگ وہیں موجود تھے۔ بشریٰ کی حالت بدستور خراب تھی۔ اسے یہاں سے لے جانے کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بار بار عرفان کی مسہری کی طرف لپک رہی تھی۔ اور چیخ رہی تھی۔

ڈاکٹر فیاض نے دور ہی سے عرفان کو دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ پھر وہ بڑی بے دلی سے آگے بڑھا اور عرفان احمد کے بدن سے آلہ لگا کر اس کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر اس نے سیدھے ہو کر گہری سانس لی اور افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

''ان کے انتقال کو تو کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

بشریٰ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

''لیکن ایسا کیسے ہو گیا ڈاکٹر صاحب۔'' اقبال کی آنسو بھری آواز ابھری۔

''بظاہر ہارٹ اٹیک لگتا ہے۔ ابھی ایک ہفتے پہلے بھی میں نے انہیں وارننگ دی تھی کہ زیادہ محنت نہ کریں، ان کا بلڈ پریشر زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھ دوائیں بھی لکھی تھیں۔ اپنی صحت کی طرف سے وہ لاپروا رہے تھے۔ اس کے علاوہ صاحب زادی کے حادثے نے انہیں بہت دل برداشتہ کر دیا تھا۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! ڈیڈی کو کبھی دل کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' صائم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ ضروری نہیں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو زندگی میں ایک ہی بار دل کا دورہ پڑتا ہے اور وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگ اگر چاہیں تو کسی اور ڈاکٹر کو چیک کرا لیں۔''

اسی وقت بشریٰ ہوش میں آ گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہاں موجود تمام لوگوں کو دیکھا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور مدھم آواز میں رونے لگی، پھر آہستہ سے بولی۔ ''کیا عرفان سچ مچ چلے گئے۔''

''آپ خود کو سنبھالیں ماما!'' صائم نے ماں کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں مانتی۔ وہ تو بالکل ٹھیک تھے۔ ڈاکٹر فیاض آپ بتایئے، وہ کیسے مر گئے۔''

''دل کے دورے سے۔ اگر آپ لوگ مزید تشفی چاہیں تو ان کا پوسٹ مارٹم کرا لیں۔''

''آپ موت کی وجہ کی تصدیق کر رہے ہیں۔''

ان کے فیملی ڈاکٹر ہیں یہ کافی ہے میرے خیال میں بشریٰ بھی ان کی لاش کی بے حرمتی نہیں چاہیں گی۔ ویسے آپ لوگوں کی مرضی ہے۔ کیوں صائم بیٹے۔ تم

بتاؤ۔ اب تو تم ہی اس گھر کے بڑے ہو۔''

''نہیں، میں عرفان کے ساتھ یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔ بشریٰ نے روتے ہوئے کہا۔

''میں خود بھی یہی رائے دیتا ہوں۔ مرحوم اتنے ہی عرصہ کے لیے دنیا میں آئے تھے، چلے گئے۔ زمین کی امانت زمین کو واپس کر دیں۔ بلاوجہ چیر پھاڑ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر فیاض نے کہا۔

ڈاکٹر کی رائے ہی ٹھیک تھی۔ اقبال بھی شدید غم زدہ ہوا۔ وہ بار بار آہیں بھر کر کہہ رہا تھا کہ دیکھو، کتنے خوش تھے عرفان احمد، قوم ترقی پر ترقی کرتی جا رہی ہے وہ اسے ترقی دینے والا اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا۔

ڈاکٹر فیاض چلا گیا۔ اقبال، ماں، بیٹیوں کو تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے بشریٰ سے کہا۔ ''میرے تو اعصاب میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ بشریٰ دل چاہ رہا ہے فوری طور پر پاکستان چھوڑ کر امریکا چلا جاؤں۔ جس کے سہارے یہاں آیا تھا وہی نہ رہا۔''

''ہمیں تنہا چھوڑ دیں گے اقبال۔ صائم اکیلا کیا کر سکے گا۔ وہ ہے ہی کتنا بڑا۔'' بشریٰ نے کہا۔

☆☆☆

عرفان احمد کی موت کی اطلاع اس کے دوستوں، رشتے داروں کو دی گئی۔ اس کی تدفین کے وقت کا تعین ہوا۔ ایک دن پہلے ہنستا بولتا توانا انسان منوں مٹی کے نیچے چلا گیا۔ بس بات ختم ہو گئی، لیکن بات کہاں ختم ہوتی ہے۔ اس گھرانے کے لیے یہ دوسرا بڑا المیہ تھا۔ دن ہی کتنے گزرے تھے ہنستی کھیلتی زندگی سے بھرپور نمرہ چھت سے گر کر مر گئی اور جیتا جاگتا عرفان صرف ایک رات میں دنیا کے لیے اجنبی ہو گیا۔ دونوں بڑے خوف ناک صدمے تھے جنہوں نے بشریٰ اور صائم کو بے جان کر کے رکھ دیا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ماما۔'' صائم نے روتے ہوئے کہا۔

''ہمارا سایہ چھن گیا۔ ہم بے سایہ ہو گئے۔''

''اب کیا ہو گا؟''

''حوصلہ رکھو۔'' بشریٰ نے کہا۔

''صائم بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ زیادہ عمر نہیں تھی، زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ماں کا خیال بھی رکھنا تھا، آگے کے بارے میں بھی سوچنا تھا۔ وہ ہر وقت یہ ہی باتیں کرتا رہتا تھا۔ تب ایک دن اقبال نے کہا۔

''جان بوجھ کر نہیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر تم دونوں کی باتیں میں نے سنی ہیں صائم۔ بیٹے...... میں تمہارا عزیز بھی ہوں۔ اور عرفان کا دوست اور بزنس پارٹنر بھی۔ میں تمہیں پریشان نہیں ہونے دوں گا، بےفکر رہو۔''

''آپ سے بڑی ڈھارس ہے انکل۔'' صائم نے کہا۔ پھر اس نے بشریٰ سے کہا۔

''یہ سچ ہے ماما۔ اقبال انکل ہمارے لیے فرشتہ ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو ہمارا کیا ہوتا۔''

''میں کچھ اور بھی سوچ رہی ہوں۔'' بشریٰ نے کہا۔

''کیا......؟''

''اقبال اچھے انسان ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک تم اپنی تعلیم مکمل نہ کر لو، اور ڈیڈی کا کاروبار سنبھالنے کے قابل نہ ہو جاؤ، میں ان کی سیٹ سنبھال لوں۔''

''آپ......'' صائم نے جھٹ سے کہا۔

''ہاں......''

''وہ کیسے......''

''جیسے کاروبار کیا جاتا ہے۔'' بشریٰ نے بہت دن کے بعد مسکرا کر کہا۔

''لیکن ماما کاروبار کے بارے میں آپ کیا جانتی ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے عرفان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں ہم مل کر آفس کے کام کرتے تھے۔ بعد میں اللہ کے فضل سے ہم نے اسٹاف رکھا تھا۔ اور اب تو اقبال ساتھ ہیں، وہ کتنے اچھے انسان ہیں، تمہیں

معلوم ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی کالج کے بعد آفس آجایا کروں گا۔ آپ دونوں کا ہاتھ بٹاؤں گا۔"

"ارے نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دلجمعی سے تعلیم پوری کرو، بعد میں تمہیں ہی اپنے ڈیڈی کی جگہ سنبھالنی ہے۔"

"او کے ماما۔"

☆☆☆

دن گزرتے رہے۔ ایک معمول بنالیا گیا۔ صائم کالج چلا جاتا۔ بشریٰ اور اقبال ایک ساتھ آفس چلے جاتے۔ گھر کے کام کاج ملازم سنبھالتے۔ شام کو سب جمع ہوجاتے، لیکن اب یہ گھر وہ گھر نہیں رہا تھا۔ نمرہ اور عرفان کی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ کھانے کی میز پر، کمرے کی نشستوں میں، ہر جگہ وہ دونوں نظر آتے اور گھر میں اداسی کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ کوئی زور سے ہنستا بھی نہیں تھا بھی نہیں تھا۔

خاص طور سے سب سے زیادہ صائم متاثر تھا۔ وہ اکثر راتوں کو جاگتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اٹھ کر چھت پر چلا جاتا تھا اور وہاں نمرہ کو یاد کرکے روتا رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات جب پورا چاند کھلا ہوا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ نمرہ کو چودھویں کا چاند بہت پسند تھا اور دونوں بہن، بھائی چھت پر آجاتے تھے۔ صائم، نمرہ کو یاد کرتا ہوا اوپر آگیا۔ لیکن اچانک اسے اوپری چھت پر کچھ آوازیں سنائی دیں اور وہ چونک پڑا۔

کون ہوسکتا ہے چور، لیکن چور چھت پر کیا کرے گا۔ پھر کون ہے۔ دیکھے بغیر سکون کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ لیکن آزادی سے اوپر جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ صائم دبے قدموں اوپر چل پڑا۔ چھت پر بنے ہوئے شیڈ کو عموماً استعمال کیا جاتا تھا اور وہاں پرانا فرنیچر ڈالا گیا تھا۔ جو قابل استعمال تھا۔ شیڈ سیڑھیوں سے زیادہ دور نہیں تھا اور سیڑھیوں کے پاس ایسی آڑ تھی کہ وہاں سے شیڈ کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ صائم نے شیڈ میں نگاہ دوڑائی اور جو کچھ نظر آیا اسے دیکھ کر پتھرا گیا۔ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ انٹرنیٹ ایج میں تھا۔ اسی طرح کے مناظر اجنبی نہیں تھے اس کے لیے، لیکن ماما...... اس کا مان، اس کی کائنات، اس عالم میں......

اقبال اور بشریٰ تھے۔ بشریٰ نے وہ لباس پہنا ہوا تھا جو صرف بیڈ روم میں سوتے وقت پہنا جاسکتا ہے۔ اقبال بھی نائٹ سوٹ میں تھا۔ بشریٰ صوفے پر نیم دراز تھی اور اقبال اس کے زانو پر سر رکھے بیٹھا ہوا تھا۔

"تمہارے منہ سے شراب کی بدبو آرہی ہے۔"

"اگر تم میری بات مان لو، تو اسے بدبو نہ کہو۔ یہ تو زندگی کا حسن ہے۔" اقبال کی لڑکھڑاتی آواز ابھری۔

"چھی چھی، مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"جب مجھ سے شادی کرلوگی تو میرے معمولات کا حصہ بن جاؤ گی۔ پھر تم میرے ہر عمل میں میرا ساتھ دوگی۔ ویسے مجھے تم سے شکایت ہوگئی ہے۔"

"کیوں......؟"

"تمہارے اندر وہ گرم جوشی ہی نہیں رہی۔ مضمحل مضمحل مرجھائی ہوئی۔ ہمارے درمیان یہ معاہدہ تو نہیں تھا۔"

"انسان تو ہوں اقبال۔ عرفان کا اور میرا طویل ساتھ رہا ہے۔ میں اس کے بچوں کی ماں تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ ہم نے بڑا اچھا وقت گزارا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے قتل کردوں گی۔"

اقبال کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔

"ارے بابا! تم نے اسے اپنے ہاتھوں سے کہاں قتل کیا۔ اس کے گلاس میں تو میں نے زہر ملایا تھا۔"

"مت کرو ایسی باتیں اقبال! میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں، لیکن یہ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا۔"

"مجھے پریشان مت کرو بشریٰ۔" تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا ہے، کتنا رومانٹک ہے یہ سب کچھ۔ اس وقت یہ باتیں کرنی ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہم دونوں جس قدر جلد ہو شادی کرلیں۔"

"اتنی جلدی نہ کرو اقبال۔ ایسا نہ ہو کہ صائم کے دل میں کوئی شک پیدا ہوجائے۔ وہ بہت حساس لڑکا ہے۔"

"کمال کرتی ہو۔ وہ حقیقت کو جھٹلا تو نہیں سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا باپ مرچکا ہے۔ اس کی ماں جوان ہے دوسری شادی کرلیتی ہے تو کسی کو کیا اعتراض ہے۔"

"تھوڑا سا صبر کرنا ضروری ہے اقبال۔ ہماری جلد بازی سے اسے یہ شبہ نہ ہوجائے کہ ہم نے عرفان کو زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹایا ہے۔"

"پانچ مہینے سے صبر کررہا ہوں۔ اب اور کتنا صبر کروں۔"

"پھر بھی پلیز۔ اب ہمارے راستے میں کوئی پتھر تو ہے نہیں۔ تھوڑا وقت اور۔" بشریٰ نے عاجزی سے کہا اور اقبال نے اسے خود پر گھسیٹ لیا۔

صائم کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ اس کا سر شعلوں میں گر گیا۔ پاؤں ساتھ چھوڑنے لگے۔ دماغ میں بادل گرج رہے تھے' کانوں میں دھماکے ہورہے تھے۔ اسے پتا نہیں چل سکا کہ وہ کب اور طرح نیچے اترا۔ اپنے کمرے تک پہنچا۔ اپنے بستر پر گر پڑا۔ اس کی مسہری ناچ رہی تھی۔ دل و دماغ میں ہوا کے جھکڑ چل رہے۔ اس بھیانک اور جان لیوا انکشاف نے اس کی جان نکال لی تھی۔

اس کے ذہن میں فلم چلنے لگی۔ ماں، بشریٰ ایک مقدس وجود، تمام فرسودہ روایتوں کے ساتھ، ماں کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس نے ماڈرن دور کا ایک نوجوان ہونے کے باوجود ماں کو تمام مقدس روایتوں کے ساتھ چاہا تھا۔ ماں باپ دونوں کو مرکز حیات سمجھا تھا لیکن ماما۔ ماما۔ ماما نے ڈیڈی کو اقبال کے ساتھ مل کر قتل کیا تھا۔ میرے ڈیڈی دل کے دورے سے نہیں مرے تھے۔ انہیں زہر دے کر قتل کیا گیا تھا۔ قتل ہوئے تھے ڈیڈی۔ وہ جو ہمیشہ مجھے بے حد پیار کرتے تھے۔ میرے مشفق ڈیڈی۔ ایک اجنبی شخص نے انہیں مار دیا تھا اور میری ہوس پرست ماں اس کی شریک کار تھی۔ ماں نہیں۔ بشریٰ ایک بھیانک عورت جس نے میرے باپ کو قتل کردیا۔ سب مرگئے۔ ڈیڈی، ماما، نمرہ، سب مرگئے۔ سارا گھر ختم ہوگیا امریکا سے ایک بھیڑیا آیا اور پورے گھر کو کھا گیا۔ اب وہ زندہ ہے اور ایک عورت جس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بدن کے نیچے بستر جل رہا تھا۔ آنکھوں میں مناظر جل رہے تھے۔ جب تک اقبال نہیں آیا تھا تو زندگی کتنی خوش گوار تھی۔ اس شخص نے آکر سب کچھ جلا دیا تھا۔

وہ تڑپتا رہا۔ سوچتا رہا۔ سلگتا رہا۔ پھر اس نے قدموں کی آوازیں تھیں۔ دونوں سیاہ کار نیچے آگئے تھے۔ وہ جلتا رہا۔ خاموشی چھا گئی تھی جب سکون نہ ملا تو اپنی جگہ سے اٹھا غسل خانے میں جاکر شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ نہ جانے کب تک ٹھنڈا پانی خود پر بہاتا رہا پھر باہر نکلا۔ الماری سے نئے کپڑے نکالے اور انہیں پہننے لگا۔ پھر جوتے پہن کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔

گھر سے باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ بے خیالی کے انداز میں چلتا رہا۔ کافی دور جاکر اسے خیال آیا اور اس نے ایک مخصوص سمت کا رخ کیا کچھ دیر کے بعد وہ اس قبرستان کے سامنے کھڑا تھا جہاں عرفان کو دفن کیا گیا تھا۔ باپ کی قبر کے پاس جاکر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ خاموش نظروں سے باپ کی قبر کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"ڈیڈی...... میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔ میں اب آپ کو پہلے سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ آپ کو آپ کی بیوی اور اس کے کزن نے مل کر قتل کردیا۔ وہ بہت برے ہیں۔ انہیں ان کے اس جرم کی سزا ضرور ملے گی۔ انہیں آپ کی زندگی لینے کے جرم میں

سزائے موت ہوگی اور اگر وہ اپنی چالاکی سے اپنی دولت کے بل پر قانون کے ہاتھوں سے بچ گئے تو۔ ڈیڈی۔ آپ کے صائم کا، آپ کے بیٹے کا وعدہ ہے کہ وہ آپ کے دونوں قاتلوں کو خود سزائے موت دے گا۔ وعدہ ڈیڈی۔ آپ سے صائم کا وعدہ۔''

صبح کی روشنی ہوئی۔ دن چڑھا پھر خوب چہل پہل ہوگئی۔ وہ بیٹھا رہا قبرستان میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہاں کی دنیا سب سے زیادہ پرسکون تھی بس اکا دکا لوگ چلتے پھرتے نظر آجاتے تھے۔ جب خوب دن چڑھ گیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور وہاں سے چل پڑا۔

☆☆☆

''کیا سوچ رہے ہیں سر۔'' صفورا نے کافی کا سپ لے کر ہونٹ خشک کر کے کہا۔

''بڑا عجیب تصور ہے میرے ذہن میں، اب جیسے آپ ہیں مس صفورا۔ پولیس کی وردی میں آپ ایک سخت گیر پولیس والی نظر آتی ہیں آپ خطرناک مجرموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب انہیں خونی نظروں سے گھورتی ہیں تو ان کی پلکیں جھک جاتی ہیں۔ آپ کی شادی ہوگی۔ آپ پھولوں کی سیج پر شرمائی سجائی بیٹھی ہوں گی آپ کے جسم پر پولیس کی وردی کی جگہ آپ کے جسم پر عروسی جوڑا ہوگا پھر جب آپ سے سرتاج صاحب آپ کے پاس آئیں گے آپ کا گھونٹ اٹھائیں گے تو......''

ایڑیاں بجنے کی آواز سن کر شاہ میر نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے حولدار عظمت حسین الرٹ کھڑا تھا اس کے ساتھ ایک معصوم سی شکل کا خوبصورت نوجوان کھڑا تھا جس کے بدن پر قیمتی لباس مسلا کچلا ہوا چہرے پر پیلاہٹ اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ کھڑا ہوا تھا۔

''سر جی۔ یہ لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا ہے بڑا ضروری کام ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ آؤ بیٹے بیٹھو۔'' شاہ میر نے نرم لہجے میں کہا۔ لڑکے کی نوعمری اور اس کے چہرے کی کیفیت نے شاہ میر کو متاثر کیا تھا ورنہ وہ اس وقت صفورا سے چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھا۔ نوجوان شاہ میر کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کافی پیو گے۔'' صفورا نے ہمدری سے پوچھا اور نوجوان چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''نو میم۔ تھینکس۔''

''ہاں بیٹے۔ کیا بات ہے۔'' شاہ میر نے کہا۔

''سر۔ میں آپ کو ایک قتل کی اطلاع دینا چاہتا ہوں۔''

''اوہ۔ قتل، کہاں، کب؟ کیا نام ہے تمہارا۔''

''صائم عرفان احمد۔''

''ٹھیک۔ لاش کہاں ہے کس نے قتل کیا ہے اسے؟''

''سر۔ یہ قتل آج سے پانچ ماہ پہلے ہوا تھا۔ آپ کو میری بات عجیب تو لگے گی لیکن خدارا مجھے پاگل نہ سمجھیں۔ مجھے تو اسی رات میں اس قتل کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔''

''اوہ پریشان مت ہو۔ مجھے بنیادی باتیں بتاؤ۔ کون قتل ہوا تھا پانچ ماہ پہلے اور اسے کس نے قتل کیا تھا۔''

''مقتول میرے والد عرفان احمد تھے اور انہیں میری ماں بشریٰ احمد نے اپنے ایک کزن کے ساتھ مل کر قتل کیا تھا۔'' نوجوان لڑکے نے جس نے اپنا نام صائم بتایا تھا گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

شاہ میر نے صفورا کی طرف دیکھا تو صفورا نے نرم لہجے میں کہا۔

''ہمیں پوری تفصیل بتاؤ صائم۔''

''جی میم۔ میں بتاتا ہوں۔'' صائم نے کہا۔ پھر اس نے ٹھہرے ٹھہرے میں پوری تفصیل لفظ بہ لفظ سنا دی۔

پہلے تو ان دونوں نے نوجوان صائم کو ایک مخبوط الحواس نوجوان سمجھا تھا لیکن اس نے جو روداد سنائی تھی اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ دلدوز داستان اس کی کیفیت کی صحیح غمازی کرتی تھی۔

''ان دونوں کی یہ گفتگو تم نے رات کو سنی تھی؟'' شاہ میر نے پوچھا۔

''جی۔''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا؟''

''ٹہلتا رہا۔ پھر غسل کر کے گھر سے باہر نکل آیا۔ ڈیڈی کی قبر پر پہنچا ان سے معافی مانگتا رہا کہ انہیں اس عورت نے قتل کیا جو میری ماں ہے۔'' صائم رو پڑا۔ ''میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر قانون ان دونوں قاتلوں کو موت کی سزا نہ دے سکا تو پھر میں انہیں سزائے موت دوں گا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں صائم۔ قانون اتنا کمزور نہیں ہے۔ قاتلوں کو سزا ضرور ملے گی۔ رات کی یہ گفتگو آپ کے علاوہ کسی اور نے تو نہیں سنی ہوگی؟''

''اور کوئی نہیں ہے ہمارے گھر میں، سوائے نوکروں کے۔''

''اور بہن بھائی نہیں ہیں۔''

''جی وہ ایک بہن تھی جس کے بارے میں، میں نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہی۔''

''آپ سے کتنی چھوٹی تھی وہ؟''

''صرف دو سال۔ ہم دونوں ساتھ ہی کالج میں پڑھتے تھے۔''

''اوہو۔ وہ بیمار ہوگئی تھی۔''

''نہیں۔ وہ چھت سے گر کر مر گئی تھی۔''

''چھت سے گر کر......؟'' صفورا چونک پڑی۔

''جی۔''

''تفصیل بتاؤ۔'' صفورا نے کہا اور صائم انہیں نمرہ کی موت کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد صفورا نے کہا۔ ''اس وقت تک اقبال تمہارے گھر آچکا تھا۔''

''جی۔ اس واقعے کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔''

''اندازاً کتنا؟'' صفورا نے پوچھا اور صائم نے اسے نمرہ کی موت کی تاریخ بتائی۔ پھر بولا۔

''آپ ضرور حیران ہوں گے کہ ایک بیٹا اپنی ماں کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کرا رہا ہے۔ لیکن جناب اس عورت نے ایک دوسرے شخص کے لیے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔ وہ میری ماں نہیں ہے۔ میں اس پر شرمندہ ہوں کہ مجھے اس نے پیدا کیا ہے۔''

''بیٹے آپ کا کیس بہت کمزور ہے۔ عدالت ہر جرم کا ثبوت مانگتی ہے۔ اور آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ آپ نے اکیلے یہ باتیں سنی اور دیکھی ہیں اور اس کا کوئی گواہ نہیں ہے۔''

''پھر آپ مجھے گرفتار کر کے سزا دے دیجیے کیونکہ میں نے اپنے باپ سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''جذباتی نہ ہو، ہوش سے کام لو۔ اپنے گھر جاؤ۔ کوئی پوچھے تو ان سے کہو کہ تمہیں ڈیڈی یاد آرہے تھے بس تم قبرستان چلے گئے تھے۔ ابھی تمہاری کوئی ایف آئی آر نہیں درج کی جاسکتی لیکن ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ تمہیں کل ہمارے پاس آنا ہے کل تم سے تمہارے خاندانی حالات کے بارے میں پوچھا جائے گا لیکن تم گھر جا کر کوئی ری ایکشن نہیں دو گے ورنہ بات بگڑ جائے گی۔''

صائم نے گردن جھکالی۔ پھر مزید ہدایات دے کر انہوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ صفورا گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاہ میر نے سنجیدگی سے کہا۔

''معمول کے مطابق تم نے اس کی فیس ریڈنگ کی ہوگی۔''

''سادہ لوح اور سچا نوجوان۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔'' صفورا نے پورے اعتماد سے کہا۔

''بدبخت نے حجلہ عروسی پر چھاپہ مارا ہے۔'' شاہ میر نے منہ بنا کر کہا۔

''نہیں سر۔ بڑی عبرت ناک کہانی ہے۔ میرے ذہن میں ایک اور چیز ٹھک ٹھک کر رہی

ہے۔‘‘صفورا نے کہا۔

’’اس کی بہن کی حادثاتی موت۔‘‘ شاہ میر بولا۔

’’آپ نے اندازہ لگالیا۔‘‘صفورا نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

’’ہاں۔میں عموماً تمہاری فیس ریڈنگ کرتا رہتا ہوں۔تم نے خاص طور سے پوچھا تھا کہ کیا اس کی بہن کی موت کے دنوں میں اقبال ان کے گھر میں ہی رہتا تھا۔‘‘

’’ویری گڈ۔‘‘ صفورا نے کہا۔پھر بولی۔’’اپنی نوعیت کا منفرد کیس ہے۔ بیٹا ماں کے خلاف قتل کا کیس درج کرا رہا ہے۔‘‘

☆☆☆

دوسرے دن دیے ہوئے وقت پر صائم پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔یہ دونوں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

’’تم نے ان دونوں کو کسی شبہ کا شکار تو نہیں ہونے دیا؟‘‘

’’نہیں۔لیکن مجھے خود پر جتنا جبر کرنا پڑا میں جانتا ہوں۔‘‘

’’ضروری وقت تک یہ کرنا ہوگا۔‘‘ شاہ میر نے کہا اور صفورا کو اس کے سوالات کے لیے اشارہ کردیا۔صفورا اس سے سوالات کرنے لگی۔اس نے سب سے پہلے اس نے پوچھا کہ’’ کیا اس کی والدہ اور والد کی لو میرج تھی؟‘‘

’’نہیں انہوں نے اپنے والدین کے فیصلے کے مطابق شادی کی تھی۔‘‘

’’دونوں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا؟‘‘

’’میں نے کبھی نہیں سنا۔‘‘

’’اقبال کے آنے سے پہلے ان دونوں کے تعلقات کیسے تھے؟‘‘

’’بہت اچھا ماحول تھا ہمارے گھر کا۔‘‘

’’اب میں آپ سے ایک اہم سوال کر رہی ہوں۔خوب غور کر کے اس کا جواب دیجیے۔‘‘

’’جی۔‘‘

’’آپ نے بتایا کہ اپنی بہن نمرہ سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے آپ لوگ اپنا ہر راز شیئر کرتے تھے؟‘‘

’’جی۔‘‘

’’نمرہ کو کبھی اقبال اور بشریٰ کے تعلقات پر کوئی شک ہوا۔اس نے کبھی ایسی بات کی؟‘‘ صفورا کے اس سوال پر صائم سوچ میں ڈوب گیا۔پھر اس نے گردن اٹھا کر کہا۔

’’پہلے میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا لیکن اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ ایسی کوئی بات تھی جس طرح میں نے ان دونوں کو اس طرح قریب دیکھا ممکن ہے اس طرح اس نے بھی کبھی دیکھ لیا ہو۔‘‘

’’کیسے اندازہ ہوا؟‘‘

’’اپنی موت سے کچھ دن پہلے وہ کس قدر الجھی الجھی اور خاموش رہنے لگی تھی۔میں نے پوچھا بھی تو وہ مصنوعی طریقے سے مسکرا دی۔اس نے کہا کوئی بات نہیں ہے، میں خاموش ہوگیا۔میں نے اس کے الجھے اندازہ کو اپنا وہم سمجھا۔‘‘

’’ہوں۔‘‘

’’لیکن میڈم آپ یہ بات کیوں پوچھ رہی ہیں؟‘‘

’’سب کچھ معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ہم آپ کی اس رپورٹ کے ایک ایک پہلو پر غور کر رہے ہیں۔ہمیں پوری تفتیش کرنی ہے کہ آپ کے والد کو واقعی قتل بھی کیا گیا ہے یا نہیں۔پانچ مہینے کے بعد اگر کیس اٹھایا جاتا ہے تو صرف آپ کے کہنے سے تو بات نہیں بنے گی۔عدالت کو اور اس سے پہلے ہمیں بہت سے ثبوتوں کی ضرورت پڑے گی اس کے بعد ہی ہم قاتلوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔میں اب اس شخص پر غور کر رہا ہوں۔پہلے میں اس پر بہت اعتماد کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ قدرت نے ہمارے لیے ڈیڈی کی موت سے پہلے ایک فرشتہ بھیج دیا جو ہماری سرپرستی کرے گا۔ لیکن۔وہ تو ہمارے لیے زہریلا ناگ نکلا۔‘‘

’’آپ کو تیار رہنا ہوگا۔عدالت میں آپ کو یہ سارے اعترافات کرنے ہوں گے۔‘‘

’’میں اب سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔میری ماں، اب میں اسے ماما نہیں کہنا چاہتا۔میری ماں بری نہیں تھی وہ اس چالاک شخص کے دام میں پھنس گئی اور اس نے آرام سے ہر چیز پر قبضہ کر کے میرے ڈیڈی کو ختم کردیا۔‘‘

’’دوسری بات یہ کہ آپ اپنی ماں کے خلاف کیس درج کرا رہے ہیں۔کسی مرحلے پر یوں نہ ہو کہ آپ کے دل میں ماں کے لیے ہمدردی جاگ اٹھے اس وقت ہماری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔‘‘

’’اوکے ٹھیک ہے۔

’’اب میں آپ سے دوسری بات کہہ رہی ہوں۔‘‘صفورا نے کہا۔’’اور یہ کہ آپ کو کچھ دن تک سخت مشکل مرحلے سے گزرنا ہوگا اور وہیں ان کے پاس رہنا ہوگا۔انہیں کسی طور پر پتا نہ چل سکے کہ آپ کے دل میں ان کے لیے کوئی نفرت ہے یا آپ کسی بات سے واقف ہو چکے ہیں۔میں جانتی ہوں کہ یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ جس کے لیے دل میں اتنی نفرت ہو اسے برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن مجبوری ہے ہم اس دوران تفتیش کر کے ان کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔اس دوران آپ ہم سے فون پر رابطہ رکھیں۔‘‘

’’بہتر ہے۔‘‘صائم نے کہا۔

’’ہر کام حوصلے سے کریں۔‘‘اب آپ جا سکتے ہیں۔‘‘

صائم کے جانے کے بعد شاہ میر اور صفورا اپنے کام کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے اور اس کے بارے میں مشورے کرتے رہے۔تین دن کے بعد انہوں نے اپنے منصوبے کے مطابق صائم کو طلب کرلیا۔

’’جی صائم۔سب ٹھیک ہے؟‘‘

’’جی سر۔‘‘

’’یہ لیجیے۔اس کاغذ کو اچھی طرح غور سے پڑھ لیجیے۔آپ کو اس مضمون کی ایف آئی آر درج کرانی ہے۔‘‘ صائم نے صفورا کا دیا ہوا کاغذ پڑھا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔اس نے سخت اضطراب کے عالم میں کہا۔

’’یہ۔یہ۔کیا یہ میم۔کیا یہ سر؟‘‘

’’یہ آپ کو وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔آپ کو یہی ایف آئی آر درج کرانی ہے۔‘‘

’’کیا یہ سچ ہے۔کیا یہ؟‘‘ صائم کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔آخر کار اس نے ان کی ہدایت کے مطابق ایف آئی آر درج کرادی۔

☆☆☆

دوسرے دن بشریٰ فرم کے منیجنگ ڈائریکٹر کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی کہ پولیس اس کے آفس میں داخل ہوگئی۔اقبال اس وقت آفس میں موجود نہیں تھا۔پولیس کے ساتھ لیڈی کانسٹیبل بھی تھیں۔بشریٰ انہیں دیکھ کر بدحواس ہوگئی تھی۔

اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔’’کیا بات ہے۔آپ کیسے آئے ہیں؟‘‘

’’آپ بشریٰ احمد ہیں؟‘‘

’’جی۔‘‘

’’آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’آپ کی بیٹی نمرہ کی موت کے سلسلے میں پولیس کو کچھ نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔اس بارے میں معلومات کرنی ہیں۔‘‘

آفس کے سارے لوگ بھی حیران تھے۔بشریٰ کو ان کے ساتھ جانا پڑا۔اس نے اپنے لوگوں کو ہدایت کی کہ اقبال کو فون کر کے اطلاع دیں کہ پولیس مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گئی ہے۔

تھانے میں اسے کئی بڑے افسروں کے سامنے پیش کیا گیا۔اسے ایک دیوار کے سہارے کھڑا کردیا گیا۔بڑے افسران کی تعداد کافی تھی سپاٹ چہرے اور سرد آنکھوں والے پولیس آفیسر جن کی چبھتی

آنکھیں بشریٰ کے دل کو لرزا رہی تھیں۔
''جی بشریٰ عرفان احمد۔'' ایک افسر کی سرد آواز ابھری۔ ''تم نے اپنی نوجوان بیٹی نمرہ احمد کو اس لیے قتل کر دیا کہ اسے تمہارے اور تمہارے کزن اقبال حسین کے معاشقے کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔''

خوف و دہشت کی شدید لہر بشریٰ کے جسم میں اترتی چلی گئی۔ یہ ہولناک انکشاف موت کی طرح بھیانک تھا۔

''جواب دیجیے بشری احمد۔'' افسر کی پھنکار ابھری۔

''نہیں۔ نہیں۔ میں نے نہیں۔ وہ تو۔ وہ تو چھت سے گر پڑی تھی۔ اس کا پیر پھسل گیا تھا۔

''جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔ آپ نے اسے چھت سے دھکا دیا تھا۔ آپ نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا کیونکہ اسے آپ کے معاشقے کا پتا چل گیا تھا۔''

''یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔''

''آپ کے خلاف اس قتل کی ایف آئی آر آپ کے بیٹے صائم عرفان نے درج کرائی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ آپ نے اپنے محبوب اقبال حسین کی خاطر اپنی بیٹی نمرہ کو چھت پر سے دھکا دے کر ہلاک کر دیا۔ اس واقع کا ایک عینی گواہ بھی ہے۔''

بشریٰ کو جیسے کسی نے گولی مار دی۔ اس کے پورے بدن میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔ اگر دیوار کے سہارے نہ کھڑی ہوتی تو زمین پر گر پڑی ہوتی۔ کیا واقعی۔ کیا واقعی صائم نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی ہے۔ صائم نے۔ اس کے بیٹے نے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پولیس افسروں کی تیز سرد اور بے رحم نگاہیں نفرت سے اس پر پڑ رہی تھیں۔

''آپ اعتراف کریں بشریٰ احمد، اپنے جرم کا اعتراف کریں۔ یہ کام آپ شرافت سے کر لیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ پولیس اپنے انداز میں آپ کی زبان کھلوائے گی۔''

''اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ تمہارا شریک کار اور تمہارا عاشق بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔'' دوسرے پولیس افسر نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ اس قتل کے جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اسے بھی تمہارے ساتھ پھانسی دی جائے گی۔ وہ بھی اب تک گرفتار ہو چکا ہوگا۔ اچھا ہے تم سچ بول دو۔ تمہارے اس جرم کا ایک عینی گواہ ہمارے پاس موجود ہے جس نے تمہیں نمرہ کو چھت سے دھکا دیتے دیکھا ہے۔''

بشریٰ کو چاروں طرف سے گھیرا جا رہا تھا اور اس کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ ''جواب دو۔ تم نے معصوم نمرہ کو چھت سے دھکا دیا تھا کہ نہیں۔ جواب دو۔ جواب دو۔''

''میں نے اسے دھکا نہیں دیا۔ اسے تو۔ اسے تو۔'' وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولی۔

''اقبال نے دھکا دیا تھا۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم لیکن اس کے ساتھ تم بھی تھیں۔ تم دونوں نے مل کر پہلے نمرہ کو قتل کیا اس کے بعد عرفان احمد کو۔ ظاہر ہے اس کی موت کے بغیر آپ اپنے عاشق کے ساتھ گلچھرے کیسے اڑا سکتی تھیں۔''

بشریٰ کا دل دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا۔

''زبان کھول دو بشریٰ۔ ورنہ پولیس تمہاری زبان کھلوانے کے لیے تیار ہے اس کے بعد جو کچھ ہوگا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم دونوں نے مل کر پہلے مظلوم نمرہ کو قتل کیا اس کے بعد بے گناہ عرفان احمد کو۔ بشریٰ تم ایک بدکار عورت ہو جس نے اپنی ناپاک ہوس کے لیے بیٹی اور شوہر کو قتل کر دیا۔''

''جواب دو۔'' ایک افسر گرجا۔ ''کون سا زہر استعمال کیا تھا تم نے عرفان کو ہلاک کرنے میں۔ کام کیسے لیا تھا۔ کسی کھانے کی چیز میں یا انجکشن کے ذریعے۔''

بشریٰ کا حوصلہ پست ہو گیا۔ ان خوف ناک آوازوں کے سامنے وہ بے بس ہو گئی۔ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے پولیس کو۔ سب کچھ۔ اور پھر یہ چیز اس کے لیے موت سے زیادہ تکلیف دہ تھی کہ اس کے خلاف ایف آئی آر اس کے بیٹے نے کرائی ہے جسے وہ جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ اس کے بیٹے صائم نے۔ آہ وہ یعنی شاہد کون ہے۔ کیا صائم؟

شرم ذلت اور جرم کے شدید احساس نے بشریٰ کو کچل کر رکھ دیا۔ کیا کر دیا یہ میں نے۔ کیا کر دیا۔ ایک پولیس آفیسر نے اسے ایف آئی آر کی کاپی دکھائی اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے پڑھنے لگی۔ اس سے زیادہ ذلیل و خوار اور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے نوجوان بیٹے کی نظروں میں فاحشہ بن چکی تھی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس کی زبان کھل گئی۔ اس نے سب کچھ اگلنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

شادی سے قبل اس کا کسی سے رومان نہیں تھا۔ وہ سادہ لوح لڑکی تھی۔ ہاں فطری طور پر اور عمر کے لحاظ سے اس کی آنکھوں میں بھی جوانی کے خواب سجے ہوئے تھے لیکن خوابوں کے شہزادے کے نقوش اس کے ذہن میں واضح نہیں تھے۔ پھر جب عرفان احمد کو اس کے سامنے لایا گیا تو وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ البتہ فیصلہ والدین نے کر دیا۔ اس نے کوئی ری ایکشن نہیں دیا اور عرفان کے ساتھ ایک مطمئن اور خوش حال زندگی گزارنے لگی۔ اگر اقبال اس کے گھر نہ آتا اور اتنی آزادی سے نہ رہتا تو شاید اس کی پوری زندگی اسی سکون سے گزر جاتی لیکن اقبال آ گیا اور اس نے اس کے خیالات میں تبدیلیاں لانی شروع کر دیں۔ وہ ایک نئے تجربے سے گزرنے لگی۔ اقبال ایک تجربے کار مرد تھا اس نے بشریٰ کو رجھانا شروع کر دیا۔ اس نے عرفان سے مختلف انداز اختیار کا جو بشریٰ کو لبھانے لگا۔ اقبال اس کے حواس پر چھاتا چلا گیا اور وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہو گئی۔ اقبال اس کی روح میں اتر گیا اور عرفان اس کے دل سے دور ہوتا گیا۔ ایک جادوئی حصار تھا جس میں وہ جکڑ گئی اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ گزری ہوئی زندگی سے اسے نفرت ہو گئی تھی اب وہ ہر لمحہ اقبال کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ عرفان کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اقبال بھی اس جذبے کا اظہار کرتا تھا۔ بس الجھن تھی تو دونوں بچے۔ وہ جوان تھے سمجھ دار تھے۔ اگر وہ عرفان سے طلاق لینا چاہتی تو اس کا جواز کیا ہوتا۔ اقبال اور وہ ہر وقت اس موضوع پر باتیں کرتے رہتے تھے۔

''مجھے تم سے ایک لمحے کی دوری گوارہ نہیں ہے۔ میں پہلے ہی ایک المیے سے گزر چکا ہوں۔ اگر مجھے تم سے دور رہنا پڑا تو میں امریکا واپس چلا جاؤں گا۔''

''مجھے بتاؤ۔ کیا کروں۔''

اقبال نے اسے جو حل بتایا اسے سن کر وہ کانپ گئی۔ ''نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ خوف سے کانپ کر بولی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن اقبال۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو......؟''

''اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق کیا تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔'' وہ اسے اپنا منصوبہ بتانے لگا۔ بشریٰ کو لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ عرفان کو ختم کیے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لیے، باقی خوش حال زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ عرفان کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ عرفان زندہ رہا تو وہ خود زندہ نہیں رہ سکے گی۔

یہ باتیں وہ بہت رازداری سے کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے ایک دن نمرہ نے ان کی قربتیں دیکھ لیں کچھ باتیں بھی سن لیں پھر ایک دن وہ ماں کے سامنے آ گئی۔

''ماما۔ آپ جو کر رہی ہیں آپ کو اس کے نتیجے کا اندازہ ہے۔ آپ اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہ کرنا

چاہتی ہیں۔ اس سے زیادہ شرمناک عمل اور کوئی ہوسکتا ہے۔ ڈیڈی کتنے اچھے انسان ہیں۔ آپ ایک اجنبی کے لیے ڈیڈی کے اعتماد کو دھوکا دے رہی ہیں۔''

بشریٰ سناٹے میں آ گئی۔ چھوٹی سی نمرہ ایک دم کتنی بڑی ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے وہ کہا تھا جس سے گریز اب بشریٰ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اقبال اب اس کی کائنات تھا تاہم اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''کیا بکواس کررہی ہو تم۔''

''آپ جانتی ہیں میں کیا بکواس کررہی ہوں اور آپ غور کرلیں میں بے شک آپ کی بیٹی ہوں لیکن افسوس جس انداز میں آپ کو اس شخص کے ساتھ دیکھ چکی ہوں بہت دن سے اس پر غور کررہی ہوں۔ بہت سی باتیں سنی ہیں میں نے آپ کی اور اب پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے۔ اپنی اور اس گھر کی بقا کے لیے مجھے آپ سے بڑا ہونا پڑے گا۔''

بشریٰ کے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ کتنا سنا ہے اس نے۔ کہیں اقبال کی کہی ہوئی دوسری باتیں تو نہیں سن لی اس نے۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ خود کو زمین میں دھنستا محسوس کرنے لگی۔

''میں آپ کو وارننگ دے رہی ہوں ماما۔ میں اس گھر کی تباہی نہیں چاہتی۔ اگر آپ اپنے آپ کو سدھارنے کا وعدہ کریں تو میں زبان بند رکھنے کا وعدہ کرتی ہوں لیکن آپ کو ہوش میں آنا پڑے گا اور اس منحوس انسان کو کسی طریقے سے فوراً باہر نکالنا ہوگا۔ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کھیل ختم نہیں ہوا اور اقبال یہاں سے چلا نہ گیا تو میں ڈیڈی اور صائم بھائی کو سب کچھ بتادوں گی۔''

یہ کہہ کر نمرہ باہر نکل گئی۔ لیکن بشریٰ کے ہوش و حواس رخصت ہوگئے۔ کیا کچھ سن لیا ہے نمرہ نے۔ کیا عرفان کے قتل کا منصوبہ بھی...... موقع ملتے ہی اس نے اقبال سے بات کی اور اسے ساری صورت حال بتادی۔ ایک لمحے کے لیے اقبال کے چہرے پر تغیر نمودار ہوا پھر اس نے بے دردی سے کہا۔

''یہ بہت برا ہوا ہے۔ کون جانے اس نے کیا کیا سن لیا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمارے منصوبے سے واقف ہوکر پولیس تک جا پہنچے۔ وہ ہمارے لیے زبردست خطرہ بن چکی ہے اور مجبوری ہے بشریٰ کہ عرفان سے پہلے اسے راستے سے ہٹانا پڑے بلکہ یہ ضروری ہے۔''

''کیا۔ کیا؟'' بشریٰ دہشت سے کانپ گئی۔

''ہم دونوں کی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے۔'' اقبال نے سرد لہجے میں کہا۔

''لیکن۔''

''میں جب ٹھیک کرلوں گا، بس تم میرا ساتھ دو۔'' بشریٰ کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس محبت کی اسے اتنی بھاری قیمت دینی پڑے گی۔ نمرہ اس کے کلیجے کا ٹکڑا، اس کی بیٹی، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آخرکار اس کی کشمکش ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔

ادھر نمرہ بے حد پریشان تھی۔ اس نے ماں کو نوٹس دے دیا تھا اور اب انتظار کررہی تھی۔ اس نے اپنی پریشانی صائم کو بھی نہیں بتائی تھی۔ حالانکہ صائم اس کی زندگی تھا۔ ماں کے ساتھ البتہ اس کا رویہ کافی خراب ہوگیا تھا۔

پھر ایک دن تیز بارش ہوئی۔ پورا گھرانہ بارش کا دیوانہ تھا۔ لیکن اب پرانی بات ہوگئی تھی۔ تاہم نمرہ عادت کے مطابق چھت پر پہنچ گئی۔ اس وقت اسے نہیں معلوم تھا کہ بشریٰ بھی اوپر موجود ہے۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی، لیکن اقبال کا شیطانی ذہن اسے دیکھ کر کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ اس نے بشریٰ کو اپنا منصوبہ بتایا اور بشریٰ خوف سے پاگل ہوگئی۔

''نہیں اقبال، پلیز نہیں۔'' اس نے خود کو کہا۔

''پاگل مت بنو۔ یہ میری زندگی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اقبال کی آواز میں ایک قاتل بول رہا تھا۔ اس نے بشریٰ کی ایک نہ سنی۔ شام ہوچکی تھی۔ بادل اتنے گہرے ہوگئے تھے کہ اندھیرا پھیل گیا تھا۔

اقبال دبے قدموں نمرہ کے پاس پہنچا اور پھر اس نے نمرہ کو دودھکا دے دیا۔

نمرہ مرگئی۔ اس کی موت حادثہ ہی سمجھی گئی۔ ماں گھر میں موجود تھی۔ کسی سازش کا کیا امکان تھا۔ بشریٰ غم سے نڈھال تھی۔ لیکن اقبال نے اس سے کہا۔

''اس کی موت کا مجھے افسوس ہے، لیکن وہ زندہ رہتی تو ہم دونوں کو مرنا ہوتا۔ تھوڑے دن کے بعد بشریٰ نارمل ہوگئی۔ اس پر عشق کی دیوانگی طاری تھی۔ اس نے بیٹی کا صدمہ برداشت کرلیا، لیکن اب دونوں بہت محتاط تھے۔ اصل کام ابھی باقی تھا اور اسے پوری ہوشیاری سے سرانجام دینا تھا۔

آخرکار ایک دن اقبال نے بشریٰ سے سرگوشی کی۔ ''میں بڑی مشکل سے یہ دن کاٹ رہا ہوں بشریٰ! اب ہمیں دوسرا کام بھی سرانجام دے لینا چاہیے۔''

مجھے بہت ڈر لگتا ہے اقبال۔ کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔

''میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ تم فکر نہ کرو۔ ساری رکاوٹیں ہٹانے کے بعد ہم شادی کرلیں گے۔ تم خود سوچو، زندگی کتنی مختصر ہوتی ہے۔ اس انتظار میں تو ہم بوڑھے ہوجائیں گے۔ مجھے عرفان سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔'' اقبال نے عرفان کو رائے دی کہ وہ بشریٰ کو بھی کمپنی کے ڈائریکٹروں میں شامل کرلے۔ عرفان نے اس کی بات مان لی اور لکھت پڑھت کے بعد بشریٰ نے آفس بیٹھنا شروع کردیا۔ اقبال اب عرفان کو راستے سے ہٹانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس نے پورے منصوبے سے بشریٰ کو آگاہ کردیا۔ بشریٰ کی زندگی میں اب اقبال کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے ہر احساس سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اقبال نے عرفان کو زہر دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور یہ منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ گھر کے اندر بظاہر کوئی چپقلش نہیں تھی۔ پوسٹ مارٹم وغیرہ کی نوبت آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

رات کو کھانے کے بعد عرفان بلیک کافی پینے کا عادی تھا۔ دوسرے لوگ ملک کافی پیتے تھے۔ صرف اسے اس کی پسند کے مطابق بلیک کافی دی جاتی تھی۔ چنانچہ بڑے اطمینان سے عرفان کو بلیک کافی میں خاص قسم کا زہر دے دیا گیا۔ جو اس نے بڑے اطمینان سے پی لیا اور اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔ کافی کے برتن جوں کے توں رہنے دیے گئے۔ بس وہ پیالی مکمل طور سے ذرائع کو دی گئی اور اس کی جگہ دوسری پیالی میں تھوڑی کافی چھوڑ دی، تاکہ پتا چلے کہ عرفان نے صاف ستھری کافی پی لی۔ یہ ذہانت اقبال کی تھی۔

پھر کافی دیر کے بعد عرفان کا جائزہ لیا گیا اس کا کام تمام ہوچکا تھا۔ بشریٰ خوف سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔ ''تم کمزوری کا مظاہرہ کررہی ہو بشریٰ! ہم ایک خوف ناک کام سرانجام دے چکے ہیں۔ ذرا اس کمزوری موت کا پھندا ہماری گردن میں ڈال دے گی۔''

''میں کیا کروں۔'' بشریٰ نے کانپتے ہوئے کہا۔

''بس تھوڑے وقت ہمت کرو۔ صبح کو جب عرفان کی لاش مل جائے گی تو تمہاری یہ کیفیت کو شوہر کی موت کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔''

''میں اس کی لاش کے ساتھ کمرے میں نہیں رہوں گی۔''

''صائم سونے جاچکا ہے۔ تم کسی دوسرے کمرے میں سو جاؤ۔''

''مجھے ڈر لگے گا۔ میں تمہارے ساتھ اوپر چلوں؟''

''آج نہیں، احتیاط ضروری ہے۔''

اقبال اسے چھوڑ کر اوپر چلا گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح پورے گھر میں چکراتی پھری۔ ایک بار اس نے بیڈروم میں جھانکا تھا اور عرفان کے بھیانک چہرے کو دیکھ کر لرز گئی تھی۔ صبح کو غسل کرکے کپڑے بدلے۔ اقبال ایک تجربے کار قاتل کی طرح مطمئن نظر آیا۔

بشریٰ کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور اسے پرسکون رہنے کا مشورہ دیا۔ سارے کام معمول کے مطابق ہوئے۔ سروری نے ناشتا لگا دیا۔ پھر خاص طور سے صائم کو عرفان کو بلانے کے لیے بھیجا گیا اور عرفان کی موت کی کہانی منظر عام پر آ گئی۔

یہی پوری کہانی، بشریٰ نے لرزتی آواز میں کہانی کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی۔ پولیس افسران کے چہروں پر الگ الگ تاثرات نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر نے ایک طرف بیٹھے شخص کو اشارہ کیا اور پوچھا۔ ''اس بیان کی ریکارڈنگ کر لی گئی ہے۔''

''جی سر! اطمینان بخش طریقے سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''بشریٰ صاحبہ! آپ کو مسز احمد کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ آپ کو عدالت میں یہی بیان دینا ہے۔ آپ اس بیان سے منحرف تو نہیں ہو جائیں گی۔''

''نہیں...... میں اب جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔ میں اب جینا بھی نہیں چاہتی۔''

''تم اب جی کر اور کیا کرو گی۔ کاش تمہیں کوئی ایسی سزا ملے کہ کائنات تمہاری کیفیت پر لرز اٹھے۔ تم مشرق کی روایات کے چہرے پر ناسور بنی ہو۔ ہم مشرقی عورتیں اپنی روایات کا آسمان ہوتی ہیں۔ ہم تابعدار بیٹی۔ محبت کرنے والی بہن، وفا شعار بیوی اور بے مثال ماں ہوتی ہیں۔ تم نے تمام رشتے غلاظت میں لپیٹ دیے ہیں۔'' صفورا کی غصے سے لرزتی آواز ابھری۔ وہ اپنے احساسات پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

بشریٰ کا بدن پسینے سے اور چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ''مجھے پانی مل سکتا ہے۔'' اسے فوراً پانی پلایا گیا۔

پانی پینے کے بعد وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں پاگل ہو گئی تھی۔ میں نے یہ سب کیسے کر لیا۔ کیوں کر لیا، مجھے نہیں معلوم۔ میری آرزو ہے کہ مجھے بدترین سزا دی جائے۔

بشریٰ کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

بشریٰ کو جب پولیس نے آفس سے اپنی تحویل میں لیا تھا تو اس نے جاتے ہوئے اسٹاف کو ہدایت کی تھی کہ اقبال صاحب کو فون پر اس بارے میں اطلاع دے دی جائے۔ اسٹاف کے لوگوں نے فون پر اس سے رابطہ کیا

''سر میں الیاس خان بول رہا ہوں۔''

''کون الیاس خان۔'' اقبال نے پوچھا۔

''سر، پرچیز آفیسر الیاس خان۔''

''ہاں کہو۔''

''سر یہاں ایک واقعہ ہو گیا ہے۔''

''کہاں؟''

''آفس سے بول رہا ہوں۔''

''بکواس کیے جا رہے ہو، کیا بات ہے، بتاتے کیوں نہیں۔'' اقبال نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''میڈم کو پولیس لے گئی ہے۔''

''بشریٰ میڈم کو۔'' اقبال کا دل دھک سے ہو گیا تھا۔

''جی سر!''

''کیوں......''

''ہمیں نہیں معلوم، جاتے ہوئے میڈم کہہ گئی ہیں کہ آپ کو فوراً خبر کی جائے۔ الیاس خان نے کہا۔

اقبال نے پوری بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ اس کے بدن میں سنسنی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ ابھی معروف تھا، لیکن اس خبر نے اسے اتنا پریشان کیا کہ وہ ساری مصروفیات چھوڑ کر دفتر کی طرف دوڑا۔ اسے چکر آ رہے تھے۔ پولیس کسی سلسلے میں بشریٰ کو تھانے لے گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔

راستے میں کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ کسی نہ کسی طرح وہ آفس پہنچ گیا۔ پورے آفس میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ آفس میں داخل ہوتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔

''منیجر کو بلاؤ۔'' اس اپنے اردلی سے کہا۔ اور عرفان احمد کے زمانے کا عمر رسیدہ منیجر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا ہے منیجر صاحب؟''

''کچھ علم نہیں جناب! بس پولیس بھرا مار کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ لیڈی کانسٹیبل بھی تھیں۔ وہ سیدھے بیگم صاحبہ کے آفس میں گئے۔ ان سے بات کی اور پھر بیگم صاحبہ کے ساتھ باہر نکل آئے۔ بیگم صاحبہ نے جاتے ہوئے کہا کہ آپ کو خبر کر دی جائے۔''

''لیڈی کانسٹیبل بھی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خاص طور سے بشریٰ کی گرفتاری کے لیے آئے تھے۔

اقبال سخت ہیجان کا شکار ہو گیا۔ مجرم ضمیر تھا۔ طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ چالاک آدمی تھا۔ فوراً تھانے کی طرف نہیں دوڑا۔ پہلے اپنے وکیل اشرف بیگ کو فون کر کے تفصیل بتائی اور اس سے کہا کہ وہ متعلقہ تھانے سے گرفتاری کی وجہ معلوم کرے۔

''ٹھیک ہے۔ ایس ایچ او شاہ میر سے میری شناسائی ہے۔ میں جاتا ہوں، آپ فکر مند نہ ہوں۔'' اشرف بیگ نے کہا اور اقبال فون بند کر کے آفس میں جا بیٹھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ وہ دور، دور تک سوچ رہا تھا۔ اشرف بیگ کا فون بہت دیر میں آیا۔ اس کی آواز میں تشویش تھی۔

''اقبال صاحب! یہ تو کوئی بہت لمبا چکر معلوم ہوتا ہے۔''

''کیسا چکر؟'' اقبال کا دل دھک سے ہو گیا۔

''بڑی عجیب تفصیل معلوم ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے پتا چلا ہے کہ بشریٰ صاحبہ کو ان کی سگی بیٹی نمرہ احمد اور شوہر عرفان کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔''

''کیا...... اقبال کے دماغ میں جیسے بم پھٹا تھا۔ اسے بڑے زور کا چکر آ گیا۔ بمشکل تمام اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بیگ صاحب۔''

''جی...... یہ ہی بات ہے۔ بیگم صاحبہ کے خلاف دہرے قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔''

''فون اقبال کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ بمشکل وہ بول پا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اب کیا کریں بیگ صاحب؟''

''قتل کے کیس معمولی نہیں ہوتے اقبال صاحب۔ بہت لمبا سلسلہ ہوتا ہے۔ ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ تھانے سے اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب عدالت میں سے ضمانت کی کوشش کی جا سکتی ہے۔''

اقبال کا سر چکراتا رہا۔ پھر اس نے سہمی ہوئی آواز سے پوچھا۔

''یہ کیس صرف بشریٰ احمد کے خلاف ہی درج ہوا ہے یا ایف آئی آر میں کسی اور کا نام بھی شامل ہے۔''

''یہ نہیں پتا چل سکا۔ شاہ میر بہت سخت آفیسر ہے۔''

''اب بتاؤ میں کیا کروں۔''

''میں کارروائی شروع کرتا ہوں۔ پہلے تو شاہ میر سے بات کر کے بیگم صاحبہ کو لاک اپ میں سہولتیں دلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''انہیں کسی بھی قیمت پر تھانے سے باہر لانا ہے۔''

''نہیں سر! آپ صورت حال کی نزاکت نہیں سمجھ رہے۔ ان پر دہرے قتل کا الزام ہے۔ مذاق نہیں ہے۔ کیس رجسٹر ہو چکا ہے۔ تھانے والے کچھ نہیں کر سکتے۔ جو کچھ بھی ہو گا عدالت سے ہو گا۔''

''اس کا مطلب ہے بشریٰ غیر محدود مدت تک لاک اپ رہیں گی۔''

''میں یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ انہیں تھانے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔'' فون بند ہو گیا۔ اور اب اقبال کے حوصلے بھی پست ہونے لگے۔ بے وقوف نہیں تھا، جانتا تھا کہ بشریٰ عورت ہے۔ زیادہ دیر زبان بند نہیں رکھ سکے گی اور اس کی زبان کھولنے کا مطلب وہ اچھی

☆☆☆

طرح جانتا تھا۔ یہ تو غلط ہوگیا۔ سوچا کیا تھا، کیا ہوگیا۔ حالانکہ اس نے کامیاب منصوبہ بنایا تھا۔ اپنے سارے اثاثے وہ یہاں منتقل کر چکا تھا۔ کاروبار خوب ترقی کر چکا تھا اور اب وہ کروڑوں میں کھیل رہا تھا۔ اس پورے کاروبار پر قبضہ کرنے اور بشریٰ سے شادی کرنے کے خواب کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن اب عین وقت پر کھیل بگڑ گیا تھا۔ بشریٰ ضرور زبان کھولے گی اور اصل قاتل کی حیثیت سے وہ سامنے آ جائے گا۔

زندگی یا دولت۔ اب ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔ دولت زندگی کے لیے ہی ہوتی ہے۔ بھاگو، زندگی بچاؤ، نکل جاؤ، ورنہ زندگی کھو بیٹھو گے۔ پہلے کہیں روپوش ہو جاؤ۔ پھر ملک سے باہر نکل جانے کا بندوبست کرو۔

دفتر میں جتنا کیش تھا، وہ جیبوں میں ٹھونسا۔ اب تو گھر جا کر کچھ اور ساتھ لینے کی کوشش بھی خطرناک تھی۔ چیک بک وغیرہ آفس میں ہی تھی۔ جو اس نے بریف کیس میں رکھی۔ ضروری کاغذات بھی ساتھ رکھے۔ پھر بریف سنبھال کر باہر نکل آیا۔ باہر ڈرائیور کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا تو اقبال نے کہا۔

”نہیں، رہنے دو۔ صائم صاحب کو کار کی ضرورت ہے۔ وہ آنے والے ہیں، ان کی کار خراب ہوگئی ہے۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ سڑک پر آ کر اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا تو وہ رک گئی۔

”اسٹیشن......“ اقبال نے اس کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن کسی نے پیچھے سے اس کا کالر پکڑ کر کھینچ لیا۔

”اسٹیشن نہیں، پولیس اسٹیشن سر!“ اقبال نے سہم کر پیچھے دیکھا۔ وہ ایک ایس آئی تھا۔

”خادم کو زمان شاہ کہتے ہیں۔ آیئے......زمان شاہ نے اسے پیچھے سے گھسیٹ لیا۔ کچھ فاصلے پر پولیس موبائل کھڑی ہوئی تھی۔

پولیس موبائل تھانے میں رکی۔ راستے میں اقبال کو ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔ تھانے میں شاہ میر نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اقبال کا چہرا زرد پڑ گیا تھا۔

”آپ کو عرفان احمد کی بیٹی نمرہ احمد اور عرفان احمد کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے اقبال صاحب۔ جس کا انکشاف بشریٰ احمد نے کیا ہے۔ اس کیس کی ایف آئی آر صائم عرفان احمد نے درج کرائی ہے اور اس کی سگی ماں بشریٰ احمد نے ہمیں پوری تفصیل بتائی ہے۔

شاہ میر نے بشریٰ کے اعترافات کا ٹیپ چلا کر اقبال کو سنایا۔ جسے سن کر اقبال نے کہا۔ ”نہیں انسپکٹر صاحب! اس نے غلط بیانی کی ہے۔ اصل میں وہ خود میرے عشق میں گرفتار تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس کے شوہر کو راستے سے ہٹا کر اس سے شادی کرلوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے خیالات کا علم اس کی بیٹی کو ہوگیا تو اس نے اسے قتل کر دیا۔ پھر اس نے اپنے شوہر کو بھی زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

”یہ کہانی آپ عدالت کو سنائیں گے۔“ شاہ میر نے کہا۔

عدالت میں سارا کچا چٹھا کھل گیا۔ سیدھی سی بات تھی کہ بشریٰ آسانی سے عرفان احمد سے طلاق لے کر اقبال سے شادی کر سکتی تھی، لیکن اقبال نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ کیونکہ اس طرح عرفان کی دولت اور کاروبار اقبال کے ہاتھ نہ آتا۔ عدالت نے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے اقبال کو سزائے موت اور بشریٰ کو عمر قید کی سزا سنا دی۔

☆☆

ایک غیرت مند کا قصہ دل کدار

اعتماد کے رشتے جب دھوکے اور فریب سے منسلک ہوجائیں تو انسان ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ اسے بھی اپنے آپ سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ بھی خود کو ان سیاہ بختوں میں شمار کرتا تھا جن سے زندگی مذاق کرتی ہے۔

درد دل کہاں ٹھہرے

شیخ آصف محمود

شازیہ! جسے میں نے آج سے پہلے ہمیشہ ایک بہن کی نظر سے دیکھا تھا، آج میری دلہن بنی سامنے سیج پر بیٹھی تھی اور میں دور صوفے پر بیٹھا گزرے ماہ و سال کی یادوں پر جمی وقت کی گرد جھاڑنے میں مصروف تھا۔

شازیہ میرے عزیز ترین دوست ظہیر کی بہن تھی۔ وہ چار بہن، بھائی تھے، دو بھائی اور دو بہنیں۔ سب سے بڑی بہن کرن باجی، اس سے چھوٹے ریحان بھائی، ان سے چھوٹا ظہیر، اور سب سے آخر میں شازیہ......

ظہیر کے والد، عباس صاحب اور والدہ میمونہ عباس دونوں ہی ڈاکٹر اور ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتے تھے۔ عباس صاحب کی عمر کوئی لگ بھگ پچاس برس ہوگی، جبکہ میمونہ آنٹی کی عمر تقریباً چالیس اکتالیس سال تھی، لیکن وہ اپنی عمر سے بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔ کرن باجی میڈیکل کالج میں تھیں۔ ریحان بھائی نے بی اے کرنے کے بعد سعودی عرب کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرلی تھی اور پچھلے دو سال سے سعودی عرب میں ہی تھے۔ وہ اپنی خیریت سے مہینے دو مہینے میں فون کرکے ضرور آگاہ کردیا کرتے تھے اور شازیہ...... وہ ان دنوں میٹرک میں تھی۔ سب بہن، بھائیوں کی عمروں میں تقریباً دو، دو سال کا فرق تھا۔ ظہیر میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں نے ابتدائی تعلیم ایک ساتھ، ایک ہی اسکول سے حاصل کی۔ اسکول کے بعد بھی ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن اس نے میڈیکل کا انتخاب کیا اور میں نے انجینئرنگ کا۔ اسکول کے زمانے میں ہم دونوں صبح سے شام تک تقریباً ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ صبح ایک ساتھ اسکول جاتے اور واپسی بھی ایک ساتھ ہی ہوتی۔ ایک کلاس میں ہونے کی وجہ سے اسکول کے وقت میں تو ہم ساتھ ہوتے ہی تھے لیکن اسکول کے بعد بھی ہم دونوں ایک دوسرے کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔ اسکول سے واپسی کے بعد گھر جا کر کھانا وغیرہ کھانے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد چار بجے ہم دونوں روزانہ علاقے کے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے پہنچ جایا کرتے۔ کرکٹ کے بعد کبھی اس کے گھر اور کبھی میرے کمرے میں ہم دونوں ساتھ بیٹھ کے ہوم ورک کرتے۔ اسکول ٹائم میں ویسے تو ہمارے اور بھی بہت سے دوست تھے، لیکن ہم دونوں تو جیسے ایک جان دو قالب تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر ایک گھنٹہ گزارنا بھی ہمارے لیے دوبھر ہوا کرتا۔

کالج پہنچتے ہی ہمارے معمولات میں خاصی تبدیلی آگئی۔ ایک ہی کالج میں ہونے کے باوجود اب ہماری ملاقات اکثر یا تو کالج سے واپسی پر ہوتی یا پھر صبح کالج جاتے ہوئے گھر واپسی کے بعد میں کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا اور اس کے بعد کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا۔ کھیل کود کا تو اب موقع ہی نہیں ملتا اور نہ ہی ظہیر کے سات بیٹھ کر اسٹڈی کرنے کا، کیونکہ اس کے مضامین میرے مضامین سے علیحدہ تھے۔ البتہ روز شام کو مغرب کے بعد یا تو میں اس کی طرف چلا جاتا یا پھر وہ ہی مجھے ملنے پہنچ جاتا۔

کالج کا پہلا سال اتنی تیزی سے گزرا کہ کچھ پتا ہی نہ چلا۔ میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ لیکن ظہیر کے دو پیپرز رک گئے۔ ان دنوں ظہیر کچھ پریشان، پریشان سا رہنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ سے زرد پڑتا جارہا تھا اور صحت بھی دن بہ دن گرتی جارہی تھی۔ کافی دن تک تو میں اسی انتظار میں رہا کہ وہ اپنی پریشانی خود ہی مجھ سے شیئر کرے گا، لیکن جب میں ناامید ہونے لگا تو ایک دن کالج سے واپسی پر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”کیوں جوان! کیا بات ہے، آج کل بہت پریشان رہتے ہو۔ کوئی خاص بات ہے؟“

”نہیں یار، بس یوں ہی ذرا پڑھائی کا بوجھ ہے۔“ اس نے مجھے ٹالنا چاہا۔

”کچھ تو ہے...... کہیں کسی سے دل لگی تو نہیں کر بیٹھے؟“

”اسٹاپ اٹ یار...... تمہیں پتا ہے نا کہ مجھے پیار محبت جیسی فضول باتوں سے کس قدر چڑ ہے۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا میری بھی دو بہنیں ہیں۔ اگر آج میں کسی کی بہن کو غلط نظر سے دیکھوں گا تو کل کوئی میری بہن کو بھی اسی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ رہی پیار محبت کی بات تو میں اپنی ساری محبت اپنی بیوی کے لیے بچا کے رکھنا چاہتا ہوں۔

”اچھا بابا اچھا! تو جیتا اور میں ہارا“ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے کہا۔ ”دیکھ ظہیر! تو میرا دوست ہی نہیں بھائی بھی ہے۔ میں نے آج تک تجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو بھی مجھ سے کچھ چھپانے کی کبھی کوشش نہ کرے۔ تجھے جو بھی پریشانی ہے مجھے بتا...... ہوسکتا ہے میں تیری کچھ مدد کرسکوں۔“ میں نے اپنا اصل مقصد دہرایا۔

”نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں...... میں بھلا تجھ سے کیوں کچھ چھپانے لگا۔ بس ذرا پڑھائی کا کچھ بوجھ ہے۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”چل چھوڑ! تو اگر نہیں بتانا چاہتا تو میں تجھے مجبور نہیں کروں گا۔ چل آج شام کو کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ تیرا ذہن بھی کچھ ہلکا ہوجائے گا اور تھوڑی سی آؤٹنگ بھی ہوجائے گی۔“ میں نے اس کا موڈ اچھا کرنے کے لیے کہا۔

”نہیں یار میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کبھی۔“ اس نے بڑی خوب صورتی سے مجھے ٹال دیا۔

”چل کھڑا ہو، اپنا اسٹاپ آگیا۔“ بس سے اتر کر میں اور وہ کالج کی دن بھر کی رام کہانی ایک دوسرے کو سناتے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

ظہیر کا گھر ہمارے گھر سے دو گلیاں آگے تھا۔

”چل آجا۔ آج امی نے تیری پسند کی بریانی بنائی ہوگی۔“ اپنے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ تو وہ چپ چاپ بلا تکلف میرے ساتھ گھر میں داخل ہوگیا۔

”خالہ جان! جلدی سے بریانی لے آیے بہت زور کی بھوک لگی ہوئی ہے۔“ اس نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”تم لوگ ہاتھ منہ دھولو...... میں جب تک کھانا لگاتی ہوں۔“ امی کی آواز پر میں نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا اور ظہیر کے پیچھے ہاتھ دھونے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب ہم دونوں ہاتھ منہ دھو کر ٹیبل پر پہنچے تو امی کھانا لگا چکی تھیں۔ کھانے سے دو، دو ہاتھ کرکے وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

آج تین دن ہوگئے تھے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پچھلے تین دن سے کالج سے بھی غائب تھا۔ اس روز اتوار کا دن تھا جب میں اس کے گھر پہنچا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا رنگ پہلے سے بھی زیادہ پیلا ہورہا تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور چہرے سے بھی نقاہت ظاہر ہورہی تھی۔ اپنے کمرے میں نہ جانے کن سوچوں میں گم وہ پلنگ پر لیٹا، کمرے کی چھت کو گھورے جارہا تھا۔ میں کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر غرق تھا کہ اسے میرے کمرے میں آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے میری جان، یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”اوہ...... شبیر تو......“ وہ جیسے مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونک پڑا۔ ”میں ابھی تیرے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ اس نے بے تابی سے کہا۔

وہ پلنگ سے اٹھتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے کہا۔ ”میں نہیں جانتا تھا کہ تو مجھے اتنا غیر سمجھنے لگا ہے کہ اب اپنی پریشانیاں بھی مجھ سے چھپانا شروع کردی ہیں۔“

مجھے اپنے قریب پا کر اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے آج سے پہلے کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بھی اسے رونے دیا یہ سوچ کر کہ اس طرح اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوجائے گا۔ جب وہ جی بھر کے رولیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”چل شبیر کہیں باہر چلتے ہیں، میرا اس کمرے میں دم گھٹ رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے شکن آلود کپڑوں پر ہاتھ پھیرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے اس وقت مزید ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کوئی سوال کیے بغیر اس کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔

اس کی بائیک پر بیٹھ کر ہم دونوں سپر مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ مارکیٹ سے متصل گارڈن میں اسے بٹھا کر میں کچھ لینے مارکیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں واپس آیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی کہ شاید وہ نظر آجائے، لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ کرن باجی ایک اجنبی شخص کے ساتھ ایک بینچ پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھیں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں اس گھٹیا شخص کو ابھی کے ابھی زندہ زمین میں گاڑھ دوں...... اچانک ہی میرے ذہن میں ظہیر کا خیال آیا...... نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہوگا، اس پر کیا گزر رہی ہوگی، اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایسے ہی بہت سے خیالات میرے ذہن میں تیزی سے گردش کرنے لگے۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ کہاں چلا گیا۔ کہیں اس نے یہ جان لیوا منظر دیکھ تو نہیں لیا؟ یہ خیال آتے ہی مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں نے سامنے روڈ سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا اور سیدھا اس کے گھر پہنچا۔ لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کی بائیک باہر ہی کھڑی تھی، جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گھر سے ہو کر گیا ہے۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور خود اس کی تلاش میں گلی گلی بھٹکنے لگا۔ اس وقت تقریباً رات کے آٹھ بج رہے تھے جب میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ناامید ہو کر گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو وہ مجھے ایک گلی کے نکڑ پر نشے میں دھت پڑا ملا ہی گیا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اسے دیکھ کر میرا کلیجہ حلق کو آگیا۔

”یہ تو نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

”کیوں، کیا ہوا ہے مجھے۔“ اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”میری بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔“ میں نے سخت لہجے میں اس سے کہا۔

”اس لیے کہ میرے اندر وہ منظر دیکھنے کی تاب نہیں تھی، کیونکہ وہ میری بہن تھی...... تیری بہن ہوتی تو......“

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ ”بے غیرت...... ذلیل انسان...... تو نے یہ کیسے سوچ لیا۔“ میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ ”آج کے بعد مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔“

پھر میں کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے آگیا۔ شاید یہ ہی میری بہت بڑی غلطی تھی، میں نے اسے اس وقت تنہا چھوڑ دیا تھا، جب اسے میرے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ ہمیشہ کی طرح چند ہی دنوں میں وہ رونی صورت بنائے مجھے منانے آجائے گا۔ لیکن...... جب اس واقعے کو دو ہفتے گزر گئے اور وہ مجھے منانے نہیں آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں خود ہی اسے منانے اس کے گھر پہنچ گیا۔ گھر سے معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ گھر کے علاوہ وہ عام طور پر جن جگہوں پر جاتا تھا۔ ان تمام جگہوں پر بھی میں نے اسے ڈھونڈا، لیکن بے سود...... وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ اس کے گھر کے چکر لگاتے اور جگہ جگہ اسے ڈھونڈتے، یوں ہی چھ ماہ گزر گئے اس کے گھر والے بھی اس کی وجہ سے کافی پریشان تھے۔ کبھی تو وہ دو تین دن میں گھر کا ایک آدھ چکر لگا لیتا تھا، لیکن کبھی

ہفتہ ہفتہ بھر غائب رہتا تھا۔ اس کی یہ آمد بھی گھڑی دو گھڑی کے لیے ہوتی۔ وہ اپنی لت پوری کرنے کے لیے پیسے لینے کے لیے آتا تھا اور پیسے نہ ملنے کی صورت میں گھر کی کوئی قیمتی چیز اٹھاتا اور چلتا بنتا۔

ایک دن جب میں کالج سے واپس آرہا تھا تو وہ مجھے ہمارے علاقے کے بس اسٹاپ سے اندر آنے والی گلی میں ایک خالی پلاٹ کی دیوار کے ساتھ بیٹھا دکھائی دیا۔ اچانک جیسے کسی نے میرے پیروں کو جکڑ لیا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ دیوار سے لگا، ہیروئن کے سفید زہر کو پنے اندر انڈیلنے میں مصروف تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔ بیگ وہیں زمین پر پھینک کر میں اس کی طرف لپکا اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ کھینچ کر دور پھینک دیا۔ وہ کافی دیر مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہا تھا تو......“ میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تجھے نظر نہیں آرہا، میں ”دوا“ پی رہا ہوں۔ دنیا کے تمام دکھوں اور تکلیفوں کی دوا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے کتنی آسانی خوشیوں سے منہ موڑ لیا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی اور اس چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے موت کا سامان کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوا نہیں ہے میرے یار! یہ تو زہر ہے...... سفید زہر...... تو بتا تو سہی، آخر تجھے کیا پریشانی ہے؟ میں تیرے زخموں کی دوا اور تیرے زخموں کا مداوا کروں گا۔ مجھے بتا میرے بھائی...... اگر تو کرن باجی والی بات کو لے کر خود کو موت کے حوالے کر دینا چاہتا ہے تو میں تجھے ایسا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔“

میری بات کے جواب میں بھی وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کرن باجی کو سمجھاؤں گا کہ آج کے بعد اس لڑکے سے کبھی نہ ملیں۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات ہرگز نہیں ٹالیں گی اور اس شخص کو، بس ایک بار مجھے کہیں نظر تو آلینے دے، پھر دیکھنا میں اسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ ساری زندگی باجی سے ملنا تو دور کی بات، وہ ان کے پاس سے گزرنے کی بھی ہمت نہیں کرے گا۔“

وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ زہر ہے، لیکن اگر جینا ہے تو اس کا سہارا تو لینا ہی پڑے گا اور ویسے بھی میں اب جی کر کیا کروں گا جب میرا ان تمام رشتوں سے اعتبار ہی اٹھ گیا جن کے ساتھ میرا جینا مرنا ہے۔“

”کیوں، کیا تجھے مجھ پر بھی بھروسا نہیں رہا؟“ میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

ایک بار پھر اس نے میری بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اپنی ہی دھن میں کہنے لگا۔ ”تو جانتا ہے، زندہ رہنے کی خواہش انسان کے دل سے کیوں ختم ہوجاتی ہے؟ انسان زندگی سے کب فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے...... تو کیسے جان سکتا ہے...... میں تجھے بتاتا ہوں، جب انسان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے، جب اس کے ذہن کے پردے پر، عظمت کی بلندیوں پر کھڑی کوئی ہستی خود اس کی نظروں سے گر جاتی ہے، جب ذلت کے اندھیرے اس کے چاروں طرف چھا جاتے ہیں اور امید کی ایک بھی کرن اسے ان اندھیروں میں دکھائی نہیں دیتی تو زندہ رہنے کا کوئی مقصد اس کے پاس باقی نہیں رہتا۔ تو جو بات جانتا ہے، وہ تو بہت پرانی ہے اور اس زخم کا مرہم تو شاید تیرے پاس ہو سکتا تھا، لیکن جو زخم میری ماں نے مجھے دیا ہے اس میں اٹھنے والی ٹیسوں کی شدت موت سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ میری ماں...... جسے میں پاکیزگی اور وفا کی دیوی سمجھتا تھا، جب میں نے اسپتال کے ایک کمرے میں اسے ڈاکٹر افضل کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دیکھا تو میرے تخیل کی بلندیوں پر کھڑا عظمت کا وہ بت جسے میں نے اعتماد کے سہارے تراشا تھا میرے قدموں

میں گر کر پاش پاش ہوگیا اور اس بت کے ٹوٹنے سے چند کرچیاں میرے دل میں کچھ اس طرح پیوست ہوئیں کہ میرا سانس لینا بھی محال ہو چکا ہے۔ اب میرے لیے زندہ رہنا مر جانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔"

یہ سن کر میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو مجھ سے پوچھتا تھا نہ کہ میں دن بہ دن کمزور کیوں ہوتا جا رہا ہوں، میرا رنگ کیوں پیلا پڑتا جا رہا ہے؟ میں کن خیالوں میں گم رہتا ہوں۔ میرے دوست اس قیامت کو دیکھنے سے پہلے میں اپنی والدہ کو ڈاکٹر افضل کے ساتھ اسپتال کے پارک میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک بینچ پر بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو یہ ہی دلاسا دیتا رہا کہ میری ماں کبھی غلط نہیں ہوسکتی، ڈاکٹروں کے پروفیشن میں یہ ایک عام سی بات ہے۔ وہ لوگ بہت کشادہ دل ہوتے ہیں اور میری ماں...... وہ کبھی ہماری عزت کو یوں سر بازار نہیں اچھال سکتی۔ میں ہر وقت یہ ہی سوچ کر ہلکان ہوتا رہتا تھا کہ اگر میری ماں کا اصل روپ میری سوچ کے مطابق نہ ہوا تو میں کیسے دنیا والوں کا سامنا کروں گا، میں کیسے جی پاؤں گا۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے لائق بھی نہیں رہیں گے۔ لیکن اس سوچ کو میں نے ہمیشہ اپنی خام خیالی قرار دے کر ذہن سے جھٹک دیا اور ہمیشہ خود کو یہ ہی یقین دلاتا رہا ہے کہ میری آنکھوں نے جو دیکھا ہے وہ صرف نظر کا دھوکا ہے۔ میری ماں ایک باکردار عورت ہے۔ وہ ہمیں کبھی رسوا نہیں کرسکتی، لیکن اس دن جب ایک ضروری کام سے میں ان کے اسپتال پہنچا اور ایک نرس سے ان کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے مجھے ڈاکٹر افضل کے کمرے کا رستہ دکھا دیا۔ میں اپنی ہی دھن میں بغیر دروازہ دستک دیے اندر داخل ہوگیا۔ لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر میں......" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"تیری غلطی یہ ہے کہ تو نے کبھی انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ نہ تو تو نے کرن باجی سے یہ پوچھا کہ وہ لڑکا کون ہے؟ وہ اسے کب سے جانتی ہیں۔ اور نہ ہی اپنی والدہ سے......" یہ کہتے ہوئے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن خود مجھ سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکا۔

"تجھے پتا نہیں کرن مجھ سے ہی نہیں بلکہ ریحان بھائی سے بھی بڑی ہے، میں اس سے بھلا کیسے پوچھ سکتا تھا...... اور ماں، اس کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے جھرجھری سی آنے لگتی ہے کہ میں نے اس گھٹیا عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جسے ماں کہتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ میں اگر چاہتا تو اسپتال میں ہی اپنی ماں اور اس ڈاکٹر کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیتا، لیکن میں یہ سوچ کر کچھ نہ کر پایا کہ اس طرح سے ہماری ہی بدنامی ہوگی۔ جب لوگ مجھ سے یہ سوال کرتے کہ تو نے اپنی ماں اور اس ڈاکٹر کو کیوں قتل کیا تو میں انہیں کیا جواب دیتا؟" یہ کہتے ہوئے وہ چند لمحے رکا اور پھر چلایا۔ "چل اب جا میرا دماغ مت کھا۔ دفع ہو جا یہاں سے...... چل اٹھ......"

"میں تجھے اس حال میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ تو میرے ساتھ میرے گھر چلے گا۔ اب میں تجھے اس گھر میں نہیں رہنے دوں گا، اب تو میرے ساتھ رہے گا۔ چل...... اٹھ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش۔

"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"دیکھ تو میرا بھائی ہے نا، تو میرا گھر جیسے میرا ہے، ویسے ہی تیرا بھی ہے، میری ماں، تیری بھی تو ماں ہے۔ چل اگر ایک ماں نے ٹھکرا دیا ہے تو دوسری ماں تجھے ضرور آنچل میں جگہ دے گی۔ چل میرے ساتھ......" میں نے اسے زبردستی اٹھایا اور اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔

امی نے جب اسے اس حالت میں دیکھا تو فوراً اس کی طرف لپکیں۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر مجھ سے کہنے لگیں۔ "کیا ہوا ہے اسے...... اس کی حالت کیا ہوگئی ہے؟" امی نے متحیر انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں امی وہ سمن ہے نا اس کمینے نے اسے نشے پر لگا دیا ہے، خالہ کو پتا چلا تو انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اس لیے میں اسے یہاں لے آیا۔" اس سے پہلے کہ امی مجھ سے مزید کچھ پوچھ پاتیں میں اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سمن پٹھان ہماری گلی میں ہی رہتا تھا۔ وہ شروع سے ہی آوارہ تھا۔ اب اس نے علاقے میں ہی منشیات کا اڈا کھول لیا تھا۔ زندگی سے دور اور موت کے قریب کرنے کے لیے ہر طرح کا سامان اس کے اڈے پر دستیاب تھا۔ رات کو جب ابو گھر پر آئے اور انہیں اس واقعے کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے فوراً اپنے ایک دوست سے رابطہ کر کے اگلے ہی دن ظہیر کو ایدھی سینٹر داخل کروا دیا۔

اس دوران میں جب عباس انکل کو میمونہ آنٹی کے کارناموں کا علم ہوا تو انہوں نے آنٹی کو طلاق دے دی۔ میمونہ آنٹی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ایک دوسرے علاقے میں کرائے کے مکان میں شفٹ ہوگئی تھیں۔ اس کا بات کا علم مجھے ابو کی زبانی ہی ہوا تھا۔ ابو کو یہ باتیں ظہیر کے گھر کام کرنے والے ایک ملازم شفیع محمد نے بتائی تھیں۔ دوسرے دن ابو انکل عباس سے ملنے ان کے گھر چلے گئے۔ وہ کافی پریشان تھے۔ ابو کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ "ایک مہینہ ہوگیا ہے ظہیر کا کوئی پتا نہیں مل رہا نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ بہت دکھی ہو کر یہاں سے گیا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا اس کی ماں کا ہے۔ میں نے اس کی ماں کو تو اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا ہے۔ لیکن وہ دونوں بیٹیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اب تو مجھے ظہیر سے زیادہ ان دونوں کی فکر ستاتی رہتی ہے۔"

ان کی پریشانی دیکھ کر ابو سے رہا نہ گیا اور انہوں نے عباس انکل مطمئن کرنے کے لیے ان سے جھوٹ کہہ دیا کہ ظہیر میرے ساتھ مری گیا ہوا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ آپ کو بتا کر گیا ہے لیکن خیر فکر کی کوئی بات نہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ کل ہی اس سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ آپ بے فکر رہیں۔ ابو انہیں ظہیر کے نشے کی عادت کے بارے میں بتا کر مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہیں اس جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ ظہیر کو نشہ کرتے زیادہ عرصہ تو ہوا نہیں تھا اس لیے وہ جلد ہی اس لت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن اب وہ ہمیشہ مجھے شاکی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ شاید وہ نشہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں اسے اس طرح سسک سسک کر مرنے کے لیے بھی تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

جب ابو نے اسے یہ بتایا کہ اس کے ابو نے اس کی ماں کو طلاق دے دی ہے اور وہ اس کی دونوں بہنوں کو اپنے ساتھ لے کر کسی دوسرے علاقے میں کرائے کے مکان میں چلی گئی ہے، تو اس نے عجیب خالی خالی نظروں سے پہلے ابو کو اور پھر مجھے دیکھا۔ وہ آگہی کے جن طوفانوں سے گزر چکا تھا ان کے مقابلے میں یہ خبر اس کے لیے ایک تیز سی موج سے بڑھ کر نہ تھی۔

اس روز جب ہم اسے لے کر گھر پہنچے تو ابو نے ظہیر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جیسے ہی ظہیر ابو کے کمرے میں داخل ہوا میں دروازے سے کان لگا کر اندر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔ ابو نے اس سے کہا۔ "دیکھو ظہیر میں جانتا ہوں کہ تم جس کرب سے گزر رہے ہو...... اس کا احساس تمہارے علاوہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ بیٹا! میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ اور ایک نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرو۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب بھلانا ناممکن کی حد تک مشکل ہے، لیکن ناممکن نہیں ہے۔" ابو چند لمحے توقف کے بعد پھر بولے۔ "دیکھو ظہیر، تمہاری اس زندگی پر صرف تمہارا ہی حق نہیں ہے۔ بلکہ تمہارے بہن بھائیوں اور ماں باپ کا بھی حق ہے۔ اگر تم نے اس کی حق تلفی کرنے کی کوشش کی اور اپنے

آپ کو خدانا خواستہ کوئی نقصان پہنچا بیٹھے تو تم میں اور تمہاری ماں میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ اس نے تم سے عزت سے جینے کا حق چھینا ہے لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تم اپنے ابو سے ان کے بڑھاپے کا سہارا ہی چھین لو گے۔ تمہارے والد شاید ذلت کے اس بوجھ کو، جو تمہاری ماں ان کے سر پر لاد کر ان کے سر کو سارے زمانے کے آگے جھکا گئی ہے، اٹھانے کی ہمت کر پائیں لیکن تمہارے جنازے کو کندھا دینے کی طاقت ابھی ان کے بازوؤں میں نہیں ہے۔ مصیبت کے اس وقت میں انہیں سب سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ایک غیرت مند انسان ہیں، اس واقعے نے ان کے اندر ایک بھونچال برپا کر دیا ہے۔ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں لیکن تم لوگوں کی خاطر...... اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے جی رہے ہیں۔ اب میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم انہیں اس نقلی مسکراہٹ کے ساتھ زندہ دیکھنا چاہتے ہو یا پھر اصلی مسکراہٹ کے ساتھ منوں مٹی تلے دفن ہوتے......"

ظہیر پر ابو کی باتوں کا کافی گہرا اثر ہوا اور دوسرے ہی دن وہ اپنے گھر لوٹ گیا۔ ظہیر نے خود کو حالات سے سمجھوتا کرنے کے لیے بہت مشکل سے آمادہ کیا تھا۔ اس نے دوبارہ کبھی نشے کو ہاتھ نہیں لگایا اور اپنے باپ کی خوشی کی خاطر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو خوش ظاہر کرنا سیکھ ہی لیا تھا۔

تین سال کچھ اطمینان سے گزرے۔ اس دوران میں بی سی ایس کر چکا تھا اور ایک سوفٹ ویئر ہاؤس میں مجھے بہت اچھی جاب بھی مل گئی تھی۔ لیکن ایک دن ایسا طوفان آیا جس میں بہہ کر میرا دوست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور چلا گیا۔ وہ خبر بجلی بن کر ہمارے سر پر گری تھی۔

اس دن ظہیر پھر نشے میں دھت، میرے پاس آیا اور میرا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "تو کیوں مجھے موت کی ٹھنڈی چھاؤں کی طرف جانے والے راستوں سے اس تپتی، جلتی ذلت اور رسوائی بھری زندگی کی طرف واپس لایا تھا...... مجھے مرنے کیوں نہیں دیا تو نے؟ کیوں......؟"

"کیا ہوا ظہیر......؟"

اور جواب میں جو کچھ میں نے سنا وہ میرے لیے کسی اذیت سے کم نہیں تھا۔ ظہیر نے بتایا کہ اس کی ماں اور بہن کرن زندگی کو اپنے ہی رنگ میں گزارنے میں مصروف ہیں جب کہ شازیہ اس ماحول سے تنگ ہے۔ وہ وہاں سے فرار چاہتی ہے، زہر آلود اور مکدر فضاؤں سے دور ہونا چاہتی ہے۔

ظہیر نے اپنے آنسو پونچھ کر میری طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "شبیر! میرے دوست میرا ایک کام کرے گا؟"

میں جیسے اپنے حواسوں میں واپس آ گیا۔ "ہاں کہو......! تم سے انکار ممکن ہے بھلا؟"

"تم میری بہن شازیہ سے شادی کر لو......"

اس نے بلا تمہید اتنی بڑی بات کہہ دی کہ میں سناٹے میں آ گیا۔

"کیا بکواس کر رہا ہے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ شازیہ کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ گو وہ بہت ریزرو سی لڑکی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ مجھے اس کے معمولات کے بارے میں بہت زیادہ علم نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بے انتہا خوب صورت تھی...... گوری چٹی رنگت، موٹی موٹی سیاہ چمکدار آنکھیں، تیکھے نین نقش، لمبے گھنے بال، سرو قد......اور سب سے بڑھ کر باکردار۔ وہ بے شک ایسی ہی لڑکی تھی جس کی آرزو ہر نوجوان کے دل میں ہوتی ہے۔ لیکن میں نے شازیہ کو ہمیشہ ایک بہن کی نظر سے دیکھا تھا۔

اس سے پہلے کے میں کچھ کہہ پاتا اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیا۔ "تجھے میری قسم ہے شبیر......! میری بہن کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچالے۔ وہ بہت معصوم ہے۔ اگر وہ اس عورت کے ساتھ رہی تو......وہ اس کو بھی اس کرن جیسا بنا دے گی۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، تیرے

پاؤں پڑتا ہوں۔" اور وہ واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا۔ اس کی اس حرکت پر میں لرز کر رہ گیا۔

"ارے پگلے شازیہ جیسی پیاری لڑکی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی ہے......تو فکر نہ کر میں خود اس کے لیے بہت اچھا لڑکا تلاش کروں گا۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ ایک تو ہی ہے جس پر میں اعتبار کر سکتا ہوں اور ابو کی حالت تو تیرے سامنے ہی پچھلے دو سالوں سے تو وہ دواؤں پر چل رہے ہیں...... پھر میرے بعد سے کو کون سنبھالے گا...... یہ کس کے سہارے جیے گی۔ پلیز میرے بھائی، اس خواہش کو میری آخری خواہش سمجھ کر مان لے......اسے ضرور پورا کرنا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ کہے سنے بغیر واپس مڑ گیا۔

ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سن کر میں پلٹا تو میں نے دیکھا پچھلی سڑک کے کونے پر ظہیر خون میں لت پت پڑا تھا۔ ایک ظالم ٹرک اسے اپنے پہیوں تلے روندتا ہوا تیزی سے آگے کی جانب بڑھ چکا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس تک پہنچا اور پاس کھڑی ایک سوزوکی میں ڈال کر اسے انتہائی تشویش ناک حالت میں کسی نہ کسی طرح اسپتال لے آیا۔ پورے راستے میں اس کی زندگی کے لیے دعا کرتا رہا مگر ڈاکٹر کی "آئی ایم سوری......" سے میرا دل بہت دیر تک جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔

اس کے انتقال کے ایک سال بعد ہی انکل بھی چل بسے۔ انکل کے انتقال کے بعد ابو شازیہ کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ ریحان بھائی ایسے گئے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود انہوں نے بھی مڑ کر یہاں کی خبر تک نہ لی۔ پہلے پہل تو کبھی کبھار فون کر لیا کرتے تھے لیکن میمونہ آنٹی والا واقعہ پیش آنے کے بعد تو انہوں نے کبھی فون تک نہ کیا۔ خود میمونہ آنٹی پچھلے دو سال سے کہاں تھیں، کس حال میں تھیں؟ کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ نہ تو وہ ظہیر کے انتقال پر اس طرف آئیں اور نہ ہی انکل کے چلے جانے کا ان پر کچھ اثر ہوا۔

ہنسیے

عدم تحفظ

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا:

"بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔"

خاتون نے پریشان ہو کر کہا:

"لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔"

ایسے حالت میں شازیہ کو ہم کس کے سہارے چھوڑ سکتے تھے۔ ظہیر کی آخری خواہش تھی کہ میں شازیہ سے شادی کر لوں......اسے تحفظ دے دوں، اس کی زندگی کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لوں۔

شازیہ کی زندگی بچانے اور اپنے یار! کی آخری آرزو پوری کرنے کے لیے، آج میں شازیہ کو اپنا چکا ہوں۔ وہ میرے سامنے دلہن بنی عروسی جوڑے میں چاند کی طرح جگمگا رہی ہے۔ خیالات کی یلغار میں، میں نے چونک کر دیکھا گھڑیال کی دستک نے مجھے بتا رہی تھی کہ وقت کا سفر جاری ہے۔ میں نے سوچا اب تک شازیہ جو کرب ناک زندگی گزاری ہے میری محبتیں اس کی تلافی ضرور کریں گی۔ میں نے ماضی کی گرد کو جھاڑا اور شازیہ کے پہلو میں جا بیٹھا۔ کسی شاعر کا شعر میری سماعتوں میں گونج رہا تھا۔

تیرا خیال، تیری طلب، تیری آرزو
اک بھیڑ سی لگی ہے میرے دل کے شہر میں

☆☆

اصلی مجرم

ایم اے راحت

قتل کی ایک واردات۔ حالات و واقعات اسے مجرم ظاہر کر رہے تھے۔
سارے ثبوت اسے قاتل ثابت کرتے تھے لیکن قتل کسی اور نے کیا تھا۔
اصلی مجرم کون تھا؟

قانونی باریکیوں اور نکتہ شناسی میں یکتا ایک تجربہ کار وکیل کا فسانہ نہانت

زمانہ بدل گیا ہے، طور طریقے بدل گئے ہیں زمانے کے، اب لوگ ہر معاملے میں جدید طرز معاشرت کو اہمیت دیتے ہیں، بلکہ بعض گھرانوں میں یہ تک رائج ہوگیا ہے کہ لڑکیوں کو کھلی آزادی دے دی جائے اور وہ اپنی شادی کے سلسلے میں بھی جہاں چاہیں کھل کر بتائیں، وہ جس کو پسند کریں گی، ان کی شادی وہیں کی جائے گی۔ ایسا ہی ایک گھرانہ وحید زمان کا بھی تھا، وحید زمان کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا، بس کسی ذریعے سے اس نے اپنے ملک میں موجود ایک غیر ملکی ایمبیسی میں ملازمت حاصل کرلی تھی، جہاں اس کا کام مہمانوں کی دیکھ بھال تھا، غیر ملکیوں کے طور طریقے دیکھ دیکھ کر وحید زمان کا ذہن بھی تبدیل ہوگیا اور اس نے بھی وہی ماحول اپنے گھر میں بسالیا جو وہ غیر ملکیوں کے ہاں دیکھا کرتا تھا۔

پھر ایک غیر ملکی افسر آیا، وحید علی نے اس کی جی جان سے خدمت اور بدلے میں وہ وحید علی کو اتنا کچھ دے گیا کہ وحید علی کا گھر بھر گیا۔ اس نے غیر ملکی سے کمائی ہوئی دولت سے ایک مناسب کاروبار شروع کیا اور ترقی کرکے ایک صاحب حیثیت شخص بن گیا۔ لیکن پھر ایک دن اس صاحب حیثیت شخص کو تھانے جانا پڑ گیا۔ تھانے دار سے اس نے بڑے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا اور بولا۔

''جناب اس لڑکے کو شکر کرنا چاہیے کہ میں نے اسے جان سے نہیں ماردیا۔''

تھانے دار کو اس طرز تکلم پر غصہ تو بہت آیا تھا، لیکن اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے وحید علی سے سارا واقعہ بیان کرنے کی درخواست کی، واقعہ خاصا دلچسپ تھا۔

شام کے پانچ بجے وحید علی کے بیٹے عامر نے اپنے گھر کی اطلاعی گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھولا تو ایک خوش پوش نوجوان کو دروازے پر کھڑا پایا، اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا، اس نے عامر علی کو سلام کیا اور کہا۔

''میرا نام حمزہ احمد ہے اور میں وحید صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' عامر علی نے نوجوان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اندر جاکر اپنے باپ کو بلایا، وحید علی اندر پہنچا تو حمزہ نے کھڑے ہوکر اس سے ہاتھ ملایا، وحید نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی اور وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا، وحید علی بھی ایک صوفے پر دراز ہوگیا تھا۔

''آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، آپ کا تعارف۔''

''جی میرا نام حمزہ احمد ہے اور میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''اچھا..... اچھا بیٹے کہیے، کیا کام ہے آپ کو مجھ سے۔''

''انکل! اصولاً تو اس کام کے لیے میرے بڑوں کو آپ کے پاس آنا چاہیے تھا، لیکن وہ دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور فی الوقت ان کا آنا ممکن نہیں ہے، مجھے معلوم ہوا کہ آپ آزاد خیال اور زندہ دل آدمی ہیں، اس لیے میں خود ہی آپ کے پاس آیا ہوں، اگر اجازت ہو تو اپنی درخواست پیش کردوں۔''

وحید نے کڑی نگاہوں سے حمزہ کو گھورا، پھر بولا۔ ''بات مختصر کرو، نوجوان چاہتے کیا ہو تم؟''

حمزہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''انکل..... وہ میں آپ کی بیٹی ثانیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی وحید علی اپنی تمام آزاد خیالی اور مغربی افکار بھول گیا اور اس کے خون میں دوڑنے والی مشرقیت جوش میں آگئی، اس نے چیخ کر اپنے بیٹے عامر کو آواز دی اور جب وہ اندر آگیا تو اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''اس نے ہماری عزت پر حملہ کیا ہے عامر، مار مار کر اس کو دنبہ بنادو، کہتا ہے میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، شادی کرنا چاہتا ہے، بتاتا ہوں تجھے۔'' اس کے ساتھ ہی وحید اپنی جگہ سے اٹھ کر حمزہ پر جھپٹا اور اس نے حمزہ کو پکڑ لیا اور عامر علی نے اسے مار مار کر واقعی اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پھر جب وہ دونوں باپ، بیٹے بگڑے ہوئے حلیے کے ساتھ حمزہ

کو باہر لائے تو حمزہ کا ایک دوست باہر موجود تھا، اس نے جب یہ منظر دیکھا تو طیش میں آ گیا، اسی طیش میں حمزہ کے دوست عماد نے وحید سے کہا۔

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا وحید صاحب، اگر آپ کو کوئی بات قبول نہیں تھی تو بات ہاتھ سے بھی کی جاسکتی تھی، لیکن آپ نے میرے دوست کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے، اب آپ ہر اچھی بری بات کے لیے تیار رہیں، ہم تھانے جا رہے ہیں، بھگتنا پڑے گا آپ کو یہ قدم، ضرور بھگتنا پڑے گا۔''

نتیجے میں حمزہ اور عماد تھانے پہنچ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے وحید علی بھی اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، تاکہ تھانے والوں کو اصل صورت بتا سکے۔ حمزہ کے دوست عماد نے تھانے دار سے کہا۔

''جناب! آپ نے ساری بات سن لی ہے اور زخمی آپ کے سامنے ہے، آپ ان لوگوں کے خلاف اقدام قتل کا پرچا کاٹیں اور ضروری کارروائی کریں۔''

''پرچا تو ہم کٹوائیں گے بیٹے، تھانے دار صاحب میں تو چاہتا تھا کہ معاملہ یوں ہی رفع دفع ہو جائے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہماری شرافت پسند نہیں آئی، ٹھیک ہے، پھر یوں ہی سہی، آپ ہماری طرف سے پرچا درج کریں۔''

''آپ کی طرف سے کیا پرچا درج کروں؟'' تھانے دار نے پوچھا۔

''کمال ہے، آپ ساری بات سننے کے بعد بھی پوچھ رہے ہیں کہ کیا رپٹ درج کریں، ذرا سوچیں، اگر کوئی شخص آپ کے دروازے پر آ کر کہے کہ وہ آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟''

تھانے دار اس عجیب سوال پر چند لمحوں تک وحید علی کو گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''وحید صاحب! میرا خیال ہے کہ جب بیٹیوں والے گھر میں کوئی شخص رشتہ مانگنے جاتا ہے تو اہل خانہ خوش ہوتے ہیں، رشتہ دینا یا نہ دینا الگ بات ہے، لیکن رشتہ مانگنا جرم نہیں ہے اور پھر اس کے جواب میں یہ سلوک۔''

''تھانے دار جی انسان کی عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' وحید علی نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''انسان کو اپنی اوقات دیکھ کر بات کرنی چاہیے، اس طرح تو کوئی بھی شخص چاہے وہ بدمعاش ہی کیوں نہ ہو اٹھ کر لڑکی والوں کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دے گا۔''

''انسان کو دوسروں کی اوقات بتانے سے پہلے اپنی اوقات بھی دیکھ لینی چاہیے، غیر ملکیوں کی غلامی ہی کی ہے نا، اب چار پیسے ہاتھ آ گئے تو رئیس ابن رئیس ہو گئے۔''

وحید علی کا بیٹا عامر علی غصے سے عماد پر جھپٹا، مگر حوالدار نے اسے پرے کر دیا۔ ''اوئے زیادہ اوکھا نہ ہو، یہ تھانہ ہے، تھانہ چارج لگا کر اندر کرنے میں منٹ لگتا ہے، دکھاؤں ابھی......''

تھانے دار نے پھر کہا۔ ''میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں وحید صاحب کہ ہر لڑکے کو چاہے وہ اوباش فطرت ہو، اس طرح لڑکی والوں کو گھر جا کر رشتہ نہیں مانگنا چاہیے، مشرقی معاشرے میں اس طریقے کو پسند نہیں کیا جاتا، لیکن یہ بات قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے۔ اگر یہ نوجوان آپ کے گھر آ ہی گیا تو آپ اسے خاموشی سے رخصت کر دیتے، زیادہ سے زیادہ ڈانٹ دیتے، لیکن آپ کی یہ حرکت خلاف قانون اور قابل گرفت ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ ہمارے خلاف پرچا کاٹیں گے۔''

''کرنا تو ہمیں یہ ہی چاہیے، لیکن اگر آپ آپس میں راضی نامہ کر لیں تو بات ختم ہو جائے گی۔''

تھانے دار کی بات پر وحید علی سوچ میں پڑ گیا تھا، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور حمزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''بیٹے آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا، جاؤ معاف کیا؟''

حمزہ نے وحید علی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور بولا۔ ''وحید صاحب! آپ نے تھانے دار

صاحب کی بات غور سے نہیں سنی، معاف آپ نہیں، ہم کریں گے، میں نے آپ کی بیٹی کا رشتہ یوں ہی نہیں مانگا ہے، میرے پاس بہت کچھ ہے۔''

وحید علی کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہو گئے تھے، قدرے توقف کے بعد اس نے حمزہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں تو یہاں تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے لیے آیا تھا۔ اگر آپ راضی نامہ چاہتے ہیں تو آپ کو تسلی سے میری بات سننا پڑے گی۔''

''لاؤ جی لاؤ، میں کرا دیتا ہوں راضی نامہ، سر جی آپ وقت ضائع نہ کریں، آؤ جی میرے ساتھ۔'' حوالدار نے آگے بڑھ کر کہا۔

وحید علی قدرے تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو ہم علیحدگی میں بات کر لیں۔''

تھانے دار نے ان لوگوں کو اجازت دے دی، وہ پندرہ، بیس منٹ تک بات چیت کرتے رہے، مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے، وحید علی کچھ پیسے دے کر بات ختم کرنا چاہتا تھا، مگر حمزہ اس سے شادی کی بات کرنا چاہتا تھا، وحید علی اگر سمجھ داری سے کام لیتا تو اس معاملے کو ختم کر سکتا تھا، مگر اسے نئی نئی دولت ملی تھی اور وہ اس کی طاقت کا مظاہرہ کرنے پر تلا ہوا تھا، ادھر حمزہ کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا اصرار یوں ہی نہیں تھا، غالباً وحید علی کی بیٹی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد تھانے دار نے وحید علی کو تنہائی میں طلب کر لیا۔

''وحید علی! یہ معاملہ طاقت سے حل ہونے والا نہیں ہے، لڑکا اس وقت ضد میں آیا ہوا ہے اور قانونی اعتبار سے اس کی پوزیشن بھی مضبوط ہے۔''

''قانون تو سارا آپ کی مٹھی میں ہے جناب! ہم آپ سے سمجھوتا کر سکتے ہیں، لیکن اس بے ہودہ شخص کے سامنے نہیں جھک سکتے، آپ اسے دو، چار دن کے لیے بند کر دیں اور ذرا چھینٹی شھینٹی لگائیں، سارا عشق رفو چکر ہو جائے گا۔'' وحید نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہم آپ کی ہر طرح سے خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جتنی رقم کہیں گے آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔'' وحید کے ان الفاظ پر تھانے دار کا الٹا ردعمل سامنے آیا تھا، اس نے بیل بجا کر حوالدار کو طلب کیا اور جب وہ کمرے میں آ گیا تو غصے سے بولا۔

''ان دونوں کے خلاف بلوے اور قاتلانہ حملے کا کیس درج کر کے انہیں حوالات میں بند کر دو۔''

''چلو جی صاحب جی دروازہ اس طرف ہے۔'' حوالدار نے وحید سے کہا۔

اسی وقت وحید صاحب رئیس سے واپس اپنی جون میں آ گئے اور گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ ''رحم جناب رحم، غریب لوگ ہیں ہم، کہاں جائیں، کس سے فریاد کریں؟''

''انہیں باہر لے جاؤ اور حمزہ کو بھیجو، لیکن صرف حمزہ کو......''

''جی جناب۔'' حوالدار ان دونوں کو لے کر باہر نکل گیا، حمزہ تھانے دار کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

''دیکھو نوجوان، وحید صاحب تمہارے ساتھ بات چیت کرنے پر تیار ہیں، لیکن یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ تم کسی بزرگ کو ساتھ لے کر ان کے گھر جاؤ اور ہاں، انہوں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے جو حرجانہ وہ تمہیں دیتے ہیں وہ لے لو۔''

کچھ پس و پیش کے بعد حمزہ تھانے دار صاحب کی بات پر راضی ہو گیا تھا، پھر تھانے دار نے فریقین کو سامنے بٹھا کر بات ختم کرائی اور تھانے دار صاحب کے کہنے پر وحید نے کچھ پیسے نکال کر حمزہ کو دیے۔ اس ساری کارروائی کے دوران عامر علی کچھ نہیں بولا تھا، لیکن اس کا چہرا جوش جذبات سے تمتا رہا تھا اور لگتا تھا کہ وہ شدید غصے میں ہے۔

☆☆☆

چند روز کے بعد حمزہ کا دوست عماد ایک پستا قد کے نوجوان کے ساتھ تھانے پہنچا اور درخواست کی کہ وہ حمزہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آیا ہے،

تھانے دار نے چونکتے ہوئے کہا۔

''او...... تم وہ ہی ہو جو کچھ دن پہلے وحید صاحب کے خلاف رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔''

''جی تھانے دار صاحب میں عماد ہوں اور چند دن قبل میں اور میرا دوست حمزہ وحید صاحب کے خلاف رپورٹ درج کرانے آئے تھے، اب درخواست یہ ہے کہ میرا دوست حمزہ دو دن قبل رات کے کھانے کے بعد اپنے گھر سے چہل قدمی کے لیے نکلا تھا، مگر پھر واپس نہیں آیا۔ یہ حمزہ کا دوست عمران عرف مانی ہے، آج کل حمزہ اس کے ساتھ اسی کے گھر میں رہتا تھا۔'' عماد نے مانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تھانے دار فیض علی نے مانی کا جائزہ لیا۔ وہ سانولے رنگ کا بدوضع سا نوجوان تھا۔ اس کے نقوش تیکھے اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اس کی وضع قطع ایسی تھی جیسے اکثر لوگ بسوں یا ٹرینوں میں مختلف چیزیں بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں، فیض علی نے مانی سے پوچھا۔

''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''جی میں کالج میں پڑھتا ہوں، حمزہ کا آبائی گھر دوسرے شہر میں ہے اور حمزہ پڑھنے کے لیے اس شہر میں آیا ہوا تھا اور بجائے ہوسٹل کے میرے گھر کے ایک کمرے میں رہتا تھا اور کھانا وغیرہ بھی میرے ساتھ ہی کھاتا تھا، ہم دونوں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ اس طرح مجھے بھی پڑھائی میں کچھ مدد مل جاتی تھی، کیونکہ وہ پڑھنے میں بہت اچھا تھا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ ہوسٹل کے بجائے تمہارے گھر ہی رہتا تھا، لیکن تمہارے گھر والے اس بات پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔''

''نہیں جناب! میرے گھر میں میرے والد کے علاوہ کوئی نہیں ہے، ماں کا انتقال ہو چکا ہے، ابو بھی نوکری کی وجہ سے زیادہ تر شہر سے باہر رہتے ہیں، سال چھ مہینے میں ایک آدھ بار چکر لگا لیتے ہیں، لیکن پیسے ہر مہینے باقاعدگی سے بھیجتے ہیں، گھر میں ایک ملازمہ ہے جو کھانا وغیرہ بھی پکا دیتی ہے، بس یہ ہے تمام بات...... اور اب میرا دوست دو دن سے غائب ہے، میں نے اس کی اطلاع عماد کو دی اور عماد مجھے لے کر یہاں آ گیا۔''

''ہوسکتا ہے حمزہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہو۔''

''وہ بتائے بغیر واپس جانے والا آدمی نہیں ہے اور مانی نے بتایا ہے کہ اس کے کپڑے بھی ادھر ہی ہیں۔''

''تمہارا اس سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا تھا۔''

''جھگڑا تو نہیں ہوا تھا، ویسے وہ غصے کا تیز تھا، ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا تھا۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ تمہاری کسی بات پر ناراض ہو کر واپس چلا گیا ہو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہو تو سکتا ہے۔''

''ذرا سوچ کر بتاؤ، پرسوں جب وہ سیر کے لیے نکلا تھا تو اس وقت تمہارا اس سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا۔''

اس نے چند لمحے سوچا، پھر بولا۔ ''میں اس وقت تھکا ہوا تھا اور سیر کرنے نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن وہ مجھے ساتھ لے جانے کی ضد کرنے لگا، میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا اکیلا ہی چلا گیا۔''

''یہ بات مجھے تم نے کیوں نہیں بتائی۔ اگر وہ غصے میں گیا ہے تو ہوسکتا ہے واپس گھر چلا گیا ہو۔'' عماد نے مانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس بات پر تھانے دار فیض علی سوچ میں پڑ گیا تھا، پھر اس نے کہا۔

''ابھی میں کوئی رپورٹ نہیں لکھ رہا، ایک بات بتائیں اس کے گھر کا کوئی فون نمبر یا موبائل نمبر وغیرہ ہے آپ کے پاس۔''

''نہیں جناب! میں نے کئی بار اس سے یہ بات پوچھی کہ خدانخواستہ کسی ہنگامی صورت حال میں تمہارا کوئی اتا پتا، فون نمبر ہونا چاہیے، لیکن اس نے نہ جانے کس نظریے کے تحت مجھے کبھی اپنے گھر کا کوئی نمبر نہیں دیا، ہاں البتہ پتا ضرور ہے میرے پاس۔''

''فی الحال میں رپورٹ نہیں لکھ رہا، البتہ تم لوگ ایک کام کرو، اس کے گھر والوں سے رابطہ کر کے پتا کرو کہ کہیں وہ گھر واپس تو نہیں گیا۔ اگر وہاں سے منفی جواب ملتا ہے تو پھر آگے کی کارروائی کریں گے۔''

دونوں نے تھانے دار کی بات سے اتفاق کیا تھا اور واپس چلے گئے تھے۔

☆☆☆

اکتوبر کی نو تاریخ کو تھانے میں ایک لاش کی برآمدگی کی اطلاع ملی اور تھانے دار فیض علی چند سپاہیوں کو لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ لاش کو جھاڑیوں کے درمیان نرم زمین میں دبایا گیا تھا، گڑھا مشکل سے ڈیڑھ دو فٹ گہرا ہوگا، جسے آوارہ کتوں نے مردہ جسم کی بو پا کر کھود ڈالا تھا، اگر ایک راہ گیر کی نظر نہ پڑ جاتی تو کتے لاش کو نکال کر کھا جاتے۔ دو سپاہیوں نے مٹی ہٹا کر لاش کو باہر نکالا اور ایک چارپائی پر ڈال دیا، چہرا اگرچہ بدوضع کی چوٹ کا نشان تھا جو دہنی کنپٹی سے سر کے پچھلے حصے کی طرف چلی گئی تھی، واضح طور پر چوٹ عقب سے لگائی گئی تھی۔

آس پاس قدموں کے نشانات تلاش کرنا بے سود تھا، کیونکہ تین روز پہلے بارش ہوئی تھی اور سارے نشانات دھل گئے تھے۔ فیض علی نے موقع پر ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ اور دو سپاہیوں کو وحید علی کے گھر بھیج دیا کہ تھانے دار فیض علی نے یاد کیا ہے۔ حمزہ جس دن وحید علی کے خلاف رپورٹ درج کرانے آیا تھا اس کے ٹھیک آٹھ دن بعد وہ غائب ہو گیا اور پھر اب اس کی لاش ملی تھی۔ تھانے دار یہ ہی تمام باتیں سوچ رہا تھا کہ اسے وحید علی اور اس کے بیٹے کے آنے کی خبر ملی، وحید نے انہیں اپنے کمرے میں بٹھایا اور چند منٹ تک رسمی باتیں کرتا رہا، اس دوران فیض علی کی نظریں عامر پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اس وجہ سے کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا تھا، وحید نے پوچھا۔

''فیض علی صاحب کوئی خاص بات ہے یا آپ نے صرف خیریت پوچھنے کے لیے ہمیں بلایا ہے۔''

''حمزہ سے آپ کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟'' فیض علی نے اب سیدھا سا سوال کر ڈالا۔

''فیض علی صاحب! میرا زیادہ وقت انگریزوں کے ساتھ گزرا ہے اور میں انگریزوں کے طور طریقے پسند کرتا ہوں، میں نے حمزہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر میری بیٹی نے اس کا رشتہ پسند کیا تو ہم بات آگے بڑھائیں گے، میرا خیال ہے کہ یہ بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔''

''اور آپ کی بیٹی نے اس سلسلے میں کیا جواب دیا ہے؟''

اس پر وحید نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا تو بیٹے نے کہا۔ ''جناب! یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، ہم ذات برادری دیکھ کر رشتہ طے کیا کرتے ہیں۔''

''تم نے اپنے باپ کی بات نہیں سنی، وہ انگریزوں کے طور طریقے پسند کرتا ہے اور بیٹی کی پسند سے شادی کرنا چاہتا ہے اور تم ذات برادری کی بات کر رہے ہو، دونوں میں سے کس کی بات پکی ہے؟''

عامر علی نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے جناب! پر ہم کسی بھی اوباش سے اس کی شادی تو نہیں کر سکتے۔''

''کیا حمزہ اوباش ہے؟'' تھانے دار نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''مم...... میرا مطلب یہ نہیں تھا جی۔''

''میں تمہارا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، تم حمزہ سے آخری بار کب ملے تھے؟''

''ایک ملاقات تو ادھر تھانے ہی میں ہوئی تھی، اس کے بعد وہ صرف ایک دفعہ ہمارے گھر آیا تھا۔''

''اور اس روز کیا تاریخ تھی؟''

''یاد نہیں جناب۔''

''ہوں...... اور تم اس کے گھر کتنی مرتبہ گئے تھے؟''

''میں......'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''میں تم ہی سے بات کر رہا ہوں۔''

''اس کا گھر تو شاید دوسرے شہر میں ہے جناب!''

''میں اس کے گھر کی بات نہیں کر رہا، کالج کی پڑھائی کی وجہ سے وہ اسی شہر میں اپنے ایک دوست کے پاس رہا کرتا تھا۔ کیا تمہیں یہ بات نہیں یاد، اگر نہیں تو میرے پاس کئی طریقے ہیں یاد کروانے کے۔''

عامر علی تھانے دار کی بات سے گھبرا گیا تھا، پھر اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں تو اس سے ملنے کا روادار نہیں تھا، مگر ابا جی نے زبردستی بھیج دیا تھا۔''

وحید علی نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں نے حمزہ کے اصرار پر اسے دوبارہ گھر آنے کی اجازت دے دی تھی، مگر گھر کے دیگر افراد اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ وہ ہمارے گھر آئے، اس لیے میں نے عامر علی کو اس کے پاس بھیج دیا، تاکہ یہ اسے ادھر سے ہی ٹال دے۔''

''یہ کس تاریخ کی بات ہے؟''

''شاید آٹھ تاریخ تھی۔''

''نہیں، وہ آٹھ نہیں، نو تاریخ تھی۔'' فیض علی نے کہا۔

وحید علی کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہو گئے، اس نے فیض علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب اصل بات کیا ہے، کہیں آپ ہمیں کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟''

''پھنس تو آپ چکے ہیں وحید صاحب! اس شہر میں ان کی کسی سے پرخاش تھی تو وہ صرف آپ اور آپ کا بیٹا عامر تھا، آپ لوگوں سے دشمنی تھی اس کی، چنانچہ اور کسی پر شک بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

''تھانے دار صاحب بہت ہو گیا۔'' وحید علی جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ''ہم عزت دار لوگ ہیں، آپ سوچ سمجھ کر ہمارے ساتھ بات کریں، ہمیں اس چوہے کے ساتھ دشمنی کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو ہم آپ کے کہنے پر نرم پڑ گئے، ورنہ اس کو دوبارہ ہماری دہلیز پر قدم رکھنے کی جرات نہ ہوتی۔''

''ابا جی! ذرا حوصلہ کریں، پہلے پتا تو چلے کہ اصل بات کیا ہے، تھانے دار صاحب، کیا حمزہ نے ہمارے خلاف کوئی اور افسانہ تراشا ہے۔'' عامر کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے اسے کچھ پتا نہ ہو۔

''بیٹھ جاؤ۔'' فیض علی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تم دونوں زیر حراست ہو؟''

''آپ ہمیں بلاوجہ حراست میں نہیں لے سکتے۔'' وحید علی نے چیخ کر کہا۔ ''میں آپ کے اوپر حبس بے جا کا کیس کر دوں گا۔ بہت تھانے دار دیکھے ہیں میں نے آپ جیسے۔''

''تم نے دور سے ہی دیکھا ہوگا تھانے داروں کو وحید علی، تمہیں نزدیک کا تجربہ نہیں ہے، پہلے بھی میں نے تمہارے خلاف پرچا نہیں کاٹا تھا، لیکن حمزہ کی رپورٹ روزنامچے میں درج کر لی تھی اور تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ہم نے حمزہ کی لاش کو برآمد کر لیا ہے، تم دونوں کو اس کے قتل کے شبہے میں حراست میں لے لیا گیا ہے۔''

''لاش برآمد کر لی ہے۔'' وحید علی کا چہرا دھلے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا، اس نے پریشان نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو کہ اوہ نادان تو نے یہ کیا کر دیا، پھر وہ تھانے دار سے مخاطب ہوا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ فیض علی صاحب؟''

''لاش تھوڑی دیر پہلے برآمد کر لی گئی ہے، کل تک اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل جائے گی۔''

''فیض علی صاحب! یقین کریں ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وحید نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''میں یہ مانتا ہوں کہ رشتے والی بات پر اس نے ہمیں اشتعال دلا دیا تھا، لیکن ہم نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔''

''وحید علی ہو سکتا ہے کہ تمہیں اصل حقیقت

معلوم نہ ہو، لیکن تمہارا بیٹا بہت کچھ جانتا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے، آپ بغیر کسی ثبوت کے مجھ پر الزام لگا رہے ہیں ابا جی! آپ فوراً کسی وکیل کا انتظام کریں، مجھے ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔''

فیض علی نے عامر علی کو حوالات میں بند کر دیا اور وحید علی سے کہا۔ ''میں تمہاری بیٹی ثانیہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''یہ سارا ہنگامہ اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' فیض علی نے کہا۔ ''یاد ہے آپ کو تھانے میں اس کے الفاظ، اس نے کہا تھا کہ اس نے آپ کی بیٹی کا رشتہ یوں ہی نہیں مانگا ہے، اس کے پاس بہت کچھ ہے، یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ پس پردہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔''

وحید علی، ثانیہ کو اس معاملے سے دور رکھنا چاہتا تھا اور اس کی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ تھی جسے تھانے دار نے صاف محسوس کر لیا تھا، پھر تھانے دار فیض علی نے زیادہ زور دیا تو وحید نے کہا۔

''آپ کل کسی وقت آ جائیں، مگر سادہ کپڑوں میں آئیں۔''

فیض علی نے اسی وقت ٹوپی سر پر رکھی اور اسسٹنٹ کو ساتھ لے کر وحید کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وحید علی اندر جانا چاہتا تھا، لیکن فیض علی نے اسے جانے نہیں دیا، پولیس کی آمد سے گھر میں اضطراب پھیل گیا تھا، فیض علی نے اندر پیغام بھجوا دیا کہ ثانیہ کو ڈرائنگ روم میں بھیج دیا جائے۔

چند منٹ بعد ایک گوری چٹی لڑکی ایک معمر عورت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، وہ شوخ اور حسین لڑکی تھی، اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے۔ اس کی وضع قطع کافی حد تک ماڈرن لڑکیوں جیسی تھی، تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ ثانیہ تھی اور معمر عورت اس کی ماں تھی۔ ثانیہ کی ماں ایک سیدھی سادی دیہاتی عورت لگتی تھی۔ فیض علی نے ثانیہ سے کہا۔

''میں تم سے حمزہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، تم علیحدگی میں بات چیت کرو گی یا سب کے سامنے۔''

''مجھے کیا پتا آپ کس قسم کی باتیں پوچھنا چاہتے ہیں۔'' اس نے بلاجھجک کہا۔

وحید علی نے لڑکی کو اشارہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''فیض علی صاحب میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ کسی حمزہ کو نہیں جانتی۔''

''بہتر ہوگا مسٹر وحید کہ آپ کچھ دیر کے لیے اندر چلے جائیں۔'' فیض علی نے کہا۔ ''آپ کی موجودگی میں لڑکی کھل کر بات نہیں کر سکے گی۔''

''پر جی بات کیا ہے؟'' لڑکی کی ماں نے کہا ''ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔''

وحید اٹھ کر اندر چلا گیا، فیض علی نے اسسٹنٹ کو ڈیوڑھی میں بھیج دیا، اب کمرے میں ثانیہ اس کی ماں اور فیض علی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، فیض علی نے ثانیہ سے کہا۔

''بی بی یہ تو تمہیں پتہ ہی ہوگا کہ حمزہ تمہارے ابا کے خلاف رپورٹ درج کرانے تھانے آیا تھا، لیکن میں نے صلح صفائی کرا دی تھی۔''

''میں نے یہ بات سنی تھی۔''

''حمزہ نے تمہارے اور اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔'' میں نے لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ بولا ''میں صرف ان باتوں کی تصدیق کرنے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں، اگر تم کوئی بات چھپاؤ گی تو اپنے لیے مشکلات پیدا کرو گی۔ اور کچھ نہیں۔''

آئے ہائے بات کیا ہے۔'' ثانیہ کی ماں بولی۔

''آپ صبر سے بیٹھیں اماں جی، بات ابھی آپ کے سامنے آ جائے گی۔'' فیض علی نے کہا پھر ثانیہ سے مخاطب ہوا۔ ''حمزہ سے تمہاری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔''

اس نے یوں چونک کر فیض علی کی طرف دیکھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، ''پ...... پہلی ملاقات......''

"میں نے پہلی ملاقات کے بارے میں ہی پوچھا ہے۔"

"یہ کوئی سات آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

ثانیہ نے چور نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

"اپنی دوست ماریہ کے گھر، ماریہ حمزہ کے دوست کی کزن ہے اور اس کے برابر والے گھر میں رہتی ہے۔"

"ماریہ کے کزن کا نام عمران تو نہیں ہے۔"

"جی یہی نام ہے۔"

"اور جی پولیس والوں کا اس بات سے کیا تعلق ہے۔ آپ ہمیں بدنام کرنا چاہتے ہیں۔" ثانیہ کی ماں بولی۔

فیض علی نے کہا "اس میں بدنامی کی کیا بات ہے، میں نے سنا ہے کہ وحید علی بڑا آزاد خیال آدمی ہے۔ ابھی چند روز پہلے وہ بتا رہا تھا کہ اس کے گھر میں انگریزی سسٹم چلتا ہے۔"

عورت نے ناگواری سے کہا "کافروں کی نوکریاں کرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے، میں نے اس کو بہت سمجھایا تھا کہ لڑکیوں کو آزادی نہ دے، مگر میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اب بھگت رہا ہے۔"

فیض علی نے اپنے لہجے میں ہمدردی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ابا نے میرے سامنے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ تمہاری شادی تمہاری مرضی سے کریں گے اور میں نے سنا ہے کہ تم حمزہ کو پسند کرتی ہو، کیا یہ سچ ہے؟"

اس نے آنکھیں نیچی کرلیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کی بات چھوڑیں جی، اس کی پسند تو ہر چھ مہینے بعد بدل جاتی ہے۔"

"حمزہ سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"تقریباً سات آٹھ دن پہلے۔"

"اطمینان سے کھل کر جواب دو، اس معاملے میں، میں بھی بہت آزاد خیال ہوں، یہ ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

اس نے چور نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر قدرے تذبذب کے بعد بولی "مم...... ملاقات تو نہیں ہوئی تھی، یونہی سلام دعا ہوئی تھی، میں اپنی دوست ماریہ کے گھر گئی تھی تو وہاں حمزہ سے سامنا ہوگیا تھا۔"

"تمہیں تو پتا ہے کہ حمزہ اس روز کے بعد سے نظر نہیں آیا۔" فیض علی نے کہا "کیا اس نے اپنے پروگرام کے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تھا؟"

"نن...... نہیں...... مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا حمزہ نے۔"

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ حمزہ کو کسی نے قتل کردیا ہے تو......"

"اللہ نہ کرے" اس نے تیزی سے سانس اندر کھینچا اور پریشان نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" لڑکی کی ماں بھی پریشان نظر آنے لگی تھی "وہ تو بھلا چنگا تھا، میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"جب آپ نے دیکھا تھا اس وقت یقیناً بھلا چنگا ہوگا، انسان کی جان نکلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"سچ بتائیں......" ثانیہ نے کہا "آپ مذاق کررہے ہیں نا، حمزہ خیریت سے تو ہے نا......"

"میں مذاق نہیں کررہا، حمزہ کو کسی نے قتل کردیا ہے، اس کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہے۔"

ثانیہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ "یہ نہیں ہوسکتا، حمزہ بہت اچھا آدمی تھا، اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔"

کچھ دیر کے بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو فیض علی نے پوچھا۔ "بی بی تمہارے خیال میں یہ قتل کس نے کیا ہوگا؟"

"پتا نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں مجھے تو اس کی موت پر یقین نہیں آرہا۔"

فیض علی سمجھ گیا کہ وہ اپنے بھائی پر شک ظاہر نہیں کرے گی، پھر فیض علی نے کہا "ہم نے تمہارے بھائی کو اس قتل کے الزام میں حراست میں لے لیا ہے، تمہیں معلوم ہوگا کہ اس نے کچھ دن پہلے حمزہ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن میں نے رپورٹ لکھنے کے بجائے صلح صفائی کرادی تھی۔"

"تھانے دار صاحب، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا بیٹا اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

"کوئی ماں اپنے بیٹے کو قاتل نہیں سمجھتی، لیکن ہر قاتل کسی نہ کسی ماں کا بیٹا ضرور ہوتا ہے، یہ بات تفتیش کے بعد ہی معلوم ہوگی کہ عامر قاتل ہے یا بے گناہ۔"

ثانیہ کی ماں نے اس کی کمر پر ایک ہاتھ جمایا اور غصے سے بولی "یہ سب تیرے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔"

"میں نے کیا کیا ہے، مجھے کیوں مار رہی ہیں آپ۔" ثانیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"سب تیرا کیا دھرا ہے، ہم تو اس منحوس کو جانتے تک نہیں تھے، اب تھانے دار صاحب کے سامنے صفائی پیش کر ان کی منت کر کہ وہ تیرے بھائی کو چھوڑ دیں۔"

"عامر بھائی نے خود غلطی کی تھی ان کو حمزہ پر ہاتھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی، سمجھدار لوگ گھر آئے دشمن کی بھی عزت کرتے ہیں، یاد ہے آپ کو حمزہ جو مٹھائی لایا تھا عامر بھائی نے اسے کوڑے میں پھینک دیا تھا۔"

"ہاں ہاں اور گنا اپنے بھائی کی برائیاں۔"

ثانیہ کی ماں نے ایک اور ہاتھ جمایا "یہ کیوں نہیں کہہ دیتی کہ تیرے عاشق کو تیرے بھائی نے قتل کیا ہے، تجھے تو ٹھنڈ اس وقت پڑے گی جب وہ سولی پر چڑھ جائے گا۔"

ماں بیٹی دیر تک ایک دوسرے پر طعنوں کے تیر چلاتی رہیں، بالآخر وحید علی کمرے میں آیا اور اپنی بیوی کا بازو پکڑ کر اسے اندر لے گیا، ثانیہ دیر تک روتی رہی پھر اچانک ہی سر اٹھا کر پوچھا۔

"یہ واقعہ کب پیش آیا۔"

"شاید اسی دن جب اس کی تم سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔"

"جب ہی تو......" اس نے بے خیالی میں کہنا شروع کیا، مگر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"رک کیوں گئیں، بے خوف ہوکر بات کرو کیا تم نہیں چاہتیں کہ حمزہ کا قاتل پکڑا جائے۔"

"مم...... مجھے کچھ نہیں پتا......" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "میرا دماغ بالکل کام نہیں کررہا۔" اس نے دوبارہ رونا شروع کردیا۔

☆☆☆

وہاں سے واپسی پر فیض علی سیدھا مانی کے گھر پہنچا تھا، ایک عورت دروازے پر آئی اور پولیس کو دیکھ کر چپ چاپ واپس چلی گئی، کچھ دیر کے بعد مانی واپس آیا اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور قمیص کے بٹن بند کررہا تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چیچک زدہ چہرے پر گھبراہٹ سی نظر آرہی تھی، فیض علی نے اس بات پر زیادہ توجہ دی تھی کیونکہ پولیس کو دیکھ کر اکثر لوگ گھبرا جایا کرتے ہیں۔ عمران نے فیض علی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"آئیں جناب فیض علی صاحب، میرے یار کا کچھ پتا چلا۔"

"ہاں تمہارے یار کا پتا چل گیا ہے، ہم اسی سلسلے میں تمہارے پاس آئے ہیں۔"

"اچھا جی، یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے، آپ رکیں، میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔" اس کے چہرے پر کوئی خوشی نظر نہیں آئی تھی، جسے فیض علی نے اچھی طرح محسوس کیا تھا، اس نے فوراً ہی کہا۔

"نہیں بیٹھک کا دروازہ ابھی بند ہی رہنے دو اور ہمیں اس کمرے کی طرف لے چلو، جہاں حمزہ رہائش پذیر تھا۔"

''اچھا جی! آپ ادھر چلیں اس کوٹھے کی طرف، میں اندر سے دروازہ کھولتا ہوں۔'' اس نے گلی کے زیریں حصے کی طرف اشارہ کیا، وہاں مکان کے کشادہ صحن کے کونے پر ایک الگ تھلگ کمرہ بنا ہوا تھا، فیض علی جلدی سے وہاں پہنچ گیا، اس نے صاف محسوس کیا کہ اندر سے چیزیں سرکنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں، اس کا مطلب ہے کہ اندر کوئی ہے جو چیزیں ادھر ادھر کر رہا ہے۔ فیض علی کو شک ہوا کہ مانی اندر چیزیں ادھر ادھر کر رہا ہے، چند لمحوں کے بعد آوازیں معدوم ہوگئیں۔ کمرے میں جو کوئی بھی تھا وہ باہر نکل گیا تھا، تب ہی فیض علی کو خیال آیا کہ اس نے مانی کو مہلت دے کر اچھا نہیں کیا، یہ لوگ وہاں تفتیش کرنے گئے تھے، دعوت کھانے نہیں آئے تھے۔ فیض علی نے زور سے دروازے پر دستک دی۔

''آیا جی۔'' صحن کی طرف سے آواز آئی، آواز کا رخ بتا رہا تھا کہ وہ تیزی سے واپس آرہا ہے، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کچھ چیزیں کمرے سے اٹھا کر لے گیا تھا، لمحہ بھر کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور پولیس والوں کے داخل ہونے کے لیے راستہ چھوڑ دیا، اس کی سانس کی رفتار معمول کے مطابق نہیں تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اندازہ ہوا کہ کمرے میں ابتری پھیلی ہوئی ہے، فیض علی نے مانی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا اس کمرے میں کوئی قابل اعتراض چیز رکھی تھی؟''

''وہ دھوپ نہیں نکل رہی آج کل، اس لیے میری کزن نے کچھ کپڑے وغیرہ سکھانے کے لیے پنکھے کے نیچے رکھے ہوئے تھے، وہی ہٹائے ہیں۔''

اس کا طرز تکلم کچھ غیر یقینی سا تھا، لیکن اس پر شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، اس لیے میں نے اپنی بات پر زور نہیں دیا، چارپائی کے نیچے جو سوٹ کیس رکھا تھا اس کے متعلق مانی نے بتایا کہ وہ حمزہ کا تھا، فیض علی نے اسے اٹھا کر چارپائی کے اوپر رکھا اور دیکھا کہ اس میں تالا وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا، اندر چند جوڑے کپڑے اور کچھ کتابیں بھی رکھی تھیں، تھوڑے سے پیسے اور شیونگ کا سامان تھا۔ فیض علی نے مانی سے پوچھا۔

''حمزہ کا باقی سامان کہاں ہے؟''

''بس جی یہ ہی سامان ہے، یہ ایک دو جوڑے میلے پڑے ہیں، یہ چپلیں بھی اسی کی ہیں، اس نے ایک کونے میں رکھی ہوئی چپلوں کی طرف اشارہ کیا، اس کے علاوہ ان کتابوں میں سے کچھ حمزہ کی ہیں اور کچھ میری۔''

''بس یا کچھ اور......''

''اس کے کچھ پیسے بھی ہیں جو اس نے میری ماں کے پاس رکھوائے تھے۔''

''ابھی اپنی ماں سے پیسے لے آؤ، بلکہ ان کو بھی بلالو، اس کے علاوہ تمام چیزیں اور پیسے وغیرہ بھی ان کے سوٹ کیس میں رکھ دو، فوری طور پر یہ تمام کام مکمل کرلو جلدی۔'' فیض علی کا لہجہ کافی حد تک سخت تھا جسے مانی نے محسوس کیا تھا، فیض علی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''تم اس کے پیچھے جاؤ، جلدی۔''

''جی سر......'' ماتحت جلدی سے اس کے پیچھے دوڑ گیا تھا، پھر کچھ لمحوں کے بعد مانی، اس کی ماں اور سپاہی بھی ساتھ آ گیا تھا، مانی نے آتے ہی کہا۔

''جناب آپ کی ساری کارروائیاں بجا ہیں، لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حمزہ اس وقت ہے کہاں؟''

''مردہ خانے میں۔''

''جی۔۔۔؟'' مانی کی لرزتی ہوئی آواز ابھری، اس کی ماں بھی اپنی جگہ ساکن ہوگئی تھی۔

''ہاں۔۔۔ کسی نے اسے قتل کردیا ہے۔''

مانی کے قدم لرز رہے تھے، وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور روہانسے لہجے میں بولا ''بہت برا ہوا، بہت ہی برا ہوا ہے۔''

''حمزہ سیر کرنے کس طرف جاتا تھا۔؟''

''کوئی خاص جگہ نہیں تھی، بعض دفعہ کافی دور نکل جاتا تھا وہ، میں اکثر منع کرتا تھا اسے اتنی دور جانے سے، مگر وہ من موجی آدمی تھا۔''

''تمہارے خیال میں اس کا کوئی دشمن ہوسکتا ہے۔''

''دشمن تو کوئی نہیں تھا اس کا جناب، یہاں کچھ دن پہلے اس کی وحید علی سے کچھ ان بن ہوئی تھی، میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ وہ اس طرح پیغام نہ لے جائے، مگر وہ میری بات نہیں مانا۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ حمزہ کے قتل میں وحید علی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔''

''نہ جی، میں ایسی جرأت کیسے کرسکتا ہوں، جتنی بات مجھے معلوم تھی وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔''

''میں نے سنا ہے کہ حمزہ وحید علی کی بیٹی سے محبت کرتا تھا اور ان کی محبت تمہارے پڑوس والے گھر سے شروع ہوئی تھی۔''

اب تک مانی کی ممانی خاموش کھڑی تھی، وہ جلدی سے بول پڑی۔

''جی آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں مانی کی ممانی ہوں، ثانیہ میری بیٹی کی دوست ہے، وہ اکثر میری بیٹی سے ملنے کے لئے آتی رہتی ہے، اللہ معاف کرے کسی کی چغلی تو نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ لڑکی آفت ہے آفت، وہ حمزہ تو کیا کسی سے بھی عشق کرسکتی ہے، اس کی صرف حمزہ سے دوستی نہیں تھی بلکہ وہ کئی اور لڑکوں کو بھی بے وقوف بنا چکی ہے۔''

''جس روز حمزہ غائب ہوا تھا، کیا اس روز ثانیہ آپ کے پاس آئی تھی؟''

''ہاں آئی تھی اور اس کی حمزہ سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔''

''کیا دونوں چھپ چھپ کر بھی ملاقاتیں کیا کرتے تھے؟''

''یہ بات نہیں معلوم۔''

''حمزہ نے تمہیں یہ بات ضرور بتائی ہوگی۔'' فیض علی نے مانی سے پوچھا۔

''دوست تو واقعی وہ گہرا تھا، لیکن اس نے کبھی مجھے خفیہ ملاقاتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''کیا آپ مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کی اجازت دے سکتی ہیں؟''

''جی بالکل۔'' مانی کی ممانی نے بلا تامل کہا اور اپنی بیٹی کو بلا لائی۔ ایک قبول صورت پروقار سی لڑکی تھی، فیض علی نے اس سے پوچھا۔

''بی بی کیا تمہیں ان کی خفیہ ملاقاتوں کے بارے میں پتا ہے؟''

''جی جناب، دونوں کی خفیہ ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔''

''اس جدید دور میں بھی۔''

''بس جی، کیا کہا جائے۔'' ممانی جلدی سے بولی اور تھانے دار فیض علی چونک گیا۔ پھر جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ لوگ شہر سے باہر نہیں جاسکتے، کسی بھی وقت آپ لوگوں کی ضرورت پڑسکتی ہے، امید ہے کہ آپ اچھے شہری کی طرح پولیس سے تعاون کریں گے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''

''او کے۔'' فیض علی نے ساتھی کو اشارہ کیا اور دونوں باہر نکل گئے، باہر نکل کر اسسٹنٹ نے فیض علی سے پوچھا۔

''سر خیریت، آپ بڑی عجلت میں ہیں۔''

''او ہم سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور شاید اس لڑکی ثانیہ کو بھی اس کا ادراک نہ ہوا ہو، جلدی چلو کہیں دیر نہ ہوجائے۔''

''سر کچھ بتائیں گے مجھے۔'' اسسٹنٹ نے کہا۔

''او جدید دور ہے، ضرور موبائل ہوگا لڑکی کے پاس، اس کو تھوڑا ڈرا کر ہم اس کا موبائل نمبر لیں گے۔ ہوسکتا ہے اس کے موبائل سے کچھ مدد مل جائے۔''

''لیکن سر حمزہ کے پاس بھی تو موبائل فون ہوگا۔''

''اب نہیں ملے گا۔''

''کیوں؟''

''وہ لڑکا مانی اس کی چیزیں غائب کر چکا ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ ہمیں کسی طرح اس لڑکی کا موبائل فون نمبر حاصل ہو جائے۔''

''جی سر۔'' اور پھر وہ دونوں وحید علی کے گھر جا دھمکے، اتفاق سے اس وقت وحید علی گھر میں نہیں تھا، پولیس کے دوبارہ آنے پر ماں بیٹیاں ذرا پریشان سی ہوگئیں، لیکن پھر بھی دونوں ان کے سامنے آگئیں۔ فیض علی نے تمہید کے بغیر کہا۔

''بی بی اپنا موبائل نمبر بتاؤ۔''

''جی۔۔۔وہ میرے پاس۔''

''دیکھو ہم تمہاری سہیلی کے گھر سے آرہے ہیں اور ہمیں تمہارے بارے میں کافی معلومات مل چکی ہیں، اب سیدھی شرافت سے اپنا اور اپنے گھر والوں کے تمام نمبر بتا دو، ورنہ تمہارا بھائی سیدھا سیدھا اس کیس میں مجرم قرار پائے گا۔'' فیض علی کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور ان دونوں نے گھر کے افراد کے زیر استعمال تمام افراد کے موبائل نمبر ان کو لکھوا دیے جنہیں فیض علی کے اسسٹنٹ نے نوٹ کر لیا تھا۔ پھر فیض علی نے کہا۔

''ہمیں ان سے کافی مدد مل سکے گی، دیکھیں ہمیں اصل قاتل تک پہنچنا ہے، ابھی تک آپ کا بیٹا عامر علی ملزم ہے مجرم نہیں، یہ سب کارروائی ایک طرح سے عامر کی بے گناہی بھی ثابت کر سکتی ہے، آپ لوگوں کے تعاون کا شکریہ۔'' یہ کہہ کر دونوں وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

واپس تھانے پہنچ کر ان تمام موبائل نمبروں کا رکارڈ نکلوایا جانے لگا اور ان لوگوں کو اس سے کافی مدد مل گئی۔ جو موبائل نمبر وحید کے پاس تھا، اس پر ایک نمبر سے متواتر کالیں آتی رہی تھیں، اس نمبر کے بارے میں پتا کیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ نمبر عمران کے نام پر ہے، پتا نکلوایا گیا اور فیض علی چونک گیا۔

''یہ پتا تو وہی ہے جہاں وہ لڑکا عمران رہتا ہے۔''

''جی سر۔''

''پھر کیا کریں۔''

''سر ان فون کالوں کا اس کیس کا اس بات سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے، اس لڑکے عمران کو اٹھا لاتے ہیں۔''

اس دوران حمزہ کے گھر والے روتے پیٹتے تھانے پہنچ گئے تھے، ظاہر ہے انہیں اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔ پھر عمران کو تھانے لے آیا گیا، وہ عادی مجرم نہیں تھا، اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم وحید علی کے موبائل پر کالیں کرتے تھے اور اس کے ہمدرد بن کر اس کے گھر گئے تھے اور حمزہ اور ثانیہ کی خفیہ ملاقاتوں کے بارے میں اسے بتایا تھا۔''

''مم۔۔۔ مجھے وحید علی کی عزت کا خیال آگیا تھا۔''

''عزت کی بات چھوڑ ہاں یا نہ میں جواب دے۔''

''ہاں جی بتایا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تو اپنے یار کے ساتھ مخلص نہیں تھا، اب ایک بات سچ سچ بتا کیا تو بھی ثانیہ سے محبت کرتا تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فیض علی مسلسل اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا اور اسے کامیابی مل رہی تھی۔

''اب یہ بتا کہ تو نے حمزہ کو کس طرح قتل کیا؟''

''حمزہ میرا دوست تھا جی میں نے اسے قتل نہیں کیا۔''

''چل بھئی سپاہی شروع ہو جا۔'' فیض علی نے حوالدار سے کہا اور حوالدار لتر لے آیا اور شروع ہو گیا، مانی کی چیخیں اس طرح بلند ہونے لگیں جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہوں۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر فیض علی کے پاؤں پکڑ لیے۔

''بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔''

فیض علی کے اشارے پر سپاہی نے ہاتھ روک

لیا۔

''جناب میرے پاس ثانیہ کے وہ خط موجود ہیں ان خطوں میں اس نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے کہ عامر حمزہ کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔'' وہ بری طرح ہانپ رہا تھا،'' میں آپ کو وہ خط دکھا سکتا ہوں۔''

''کیا ثانیہ تمہیں خط لکھتی تھی؟''

''نن۔۔۔نہیں جی، یہ خط اس نے حمزہ کو لکھے تھے۔''

''یہ تمہارے پاس کہاں سے آگئے؟''

''میں نے یہ خط حمزہ کے سوٹ کیس سے نکالے تھے، آپ انہیں میرے گھر سے حاصل کر سکتے ہیں۔''

''ہوں اس کا مطلب ہے کہ تم نے ان خطوط کی وجہ سے وحید علی کو بلیک میل کرنا چاہا تھا، اور یہ کوئی ثبوت نہیں ہے، عامر نے اپنے بیان میں یہ ضرور کہا تھا کہ وہ حمزہ کو جان سے مار دینا چاہتا تھا لیکن باپ کے سمجھانے پر وہ اپنی اس حرکت سے باز رہا تھا۔''

''لیکن مجھے یقین تھا کہ عامر حمزہ کو نہیں چھوڑے گا اس لیے میرے پروگرام میں تھا کہ اگر حمزہ قتل ہو جاتا ہے تو میں وحید علی کو بلیک میل کر کے ثانیہ سے شادی کر لوں گا، یہی وجہ تھی کہ جب حمزہ ثانیہ سے ملنے گھر سے نکلا تو میں اس کے پیچھے چل پڑا، لیکن جب وہ ثانیہ کے گھر پہنچا تو اس کے باپ اور بھائی نے ڈرا دھمکا کر اسے بھگا دیا، بھاگنے کے دوران وہ ایک جگہ بڑی زور سے گرا اور اسے خاصی چوٹ بھی آئی تھی، جب حمزہ ان کے چنگل سے نکل کر بھاگ آیا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کس طرح حمزہ کا کام تمام کروں، پھر مجھے ایک ترکیب سوجھی، میں نے حمزہ کو سمجھایا کہ جس طرح تم ان کے گھر گئے ہو اب وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے اس لیے تمہیں یہاں سے غائب ہو جانا چاہیے، وہ لوگ آنے ہی والے ہوں گے، حمزہ سخت خوف زدہ تھا، اس کچھ نہیں سوجھ رہا تھا، میرے کہنے پر وہ میرے ساتھ باہر

نکل گیا، میں نے کمرے سے اپنا بیٹ بھی اٹھا لیا تھا، پھر میں حمزہ کو آبادی سے باہر لے گیا اور بیٹ کے ایک ہی وار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔''

عمران نے جب بات ختم کی تو فیض علی نے پوچھا'' وہ بیٹ کہاں ہے؟''

''بیٹ گھر میں چھپا کر رکھا ہے۔''

فیض علی نے اسی وقت عمران کو ساتھ لیا اور اس کے گھر سے بیٹ کے علاوہ ثانیہ کے خطوط بھی برآمد کر لیے، جب تھانے واپس پہنچا تو وحید علی کو اپنا منتظر پایا۔

''وحید علی، جب تمہارے بیٹے نے حمزہ کو قتل نہیں کیا تو تم نے اصل بات کیوں چھپائی۔

''ہم حمزہ کے قتل کی خبر سن کر خوف زدہ ہو گئے تھے، ہمارے خیال میں جب حمزہ نے ہمارے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو ہماری دخل اندازی کی وجہ سے وہ بری طرح گرا تھا اور اسے چوٹ بھی لگی تھی۔ ہمیں خوف تھا کہ کہیں وہ اس چوٹ کی وجہ سے تو نہیں مارا گیا، لیکن اب تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے فیض علی صاحب کہ آپ کی ذاتی دلچسپی اور محنت کے باعث یہ کیس حل ہوا ہے ورنہ میرا بیٹا ۔۔ میرا بیٹا تو پھانسی چڑھ جاتا اور ہم بھی بے موت مارے جاتے۔''

''نہیں جناب وحید صاحب، قانون بہر حال قانون ہوتا ہے، آپ کا بیٹا ملزم ضرور تھا، لیکن اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھا اور جب سارے ثبوت مل گئے ہیں اور قاتل نے اقرار جرم بھی کر لیا ہے تو آپ کا بیٹا آزاد ہے۔''

وحید صاحب اور عامر ممنون نگاہوں سے تھانے دار کو دیکھنے لگے تھے۔

☆☆

اب بھلا دو مجھے

محمد حفیظ

اعتبار کی ٹھنڈی چھاؤں میں چلتے چلتے اس کے پاؤں جلنے لگے۔ ایک معصوم دوشیزہ کا فسانہ عبرت، محبت کا گیت گاتے گاتے اس کی آواز ڈوب گئی۔

انتقام کی آگ میں جلتے جلتے ایک وحشی کی کہانی

ٹکر اتنی اچانک تھی کہ میں بوکھلا گئی۔ کتابیں میرے اطراف بکھر گئیں، میرے جھکنے سے پہلے دو گورے ہاتھوں نے انہیں سمیٹ لیا۔ ''سوری......! میں بہت جلدی میں تھا۔''

میں اندر تک سہم گئی۔ زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب کسی اجنبی کی نگاہوں نے میرے اندر رہنے کے لیے کسی گمنام گوشے کی تلاش شروع کی تھی اور سچ تو یہ تھا کہ ان بادامی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں انہیں دل دروازے تک خود ہی چھوڑنے چلی آئی تھی۔

وہ لمحے بھر میں کتابیں سمیٹ کر نہ جانے کہاں بھیڑ میں گم ہوگیا اور میں اس کی ''سوری'' کی بازگشت لیے ایک عجیب سے احساس کے ساتھ کلاس کی راہ داری سے ہوتی کلاس روم میں داخل ہوئی تو ایک خوشگوار سا تاثر میرے چہرے پر اپنا رنگ جما چکا تھا۔

شگفتہ اس سارے منظر کو محویت سے دیکھ چکی تھی جب ہی میرے قریب آتے ہی اس کی شوخیاں، پھلجھڑیاں بن گئیں۔ ''سنو...... ویسے تھا بہت اسمارٹ ......!''

میں نے مصنوعی بے اعتنائی سے کہا۔ ''میرا انجر پنجر ہل گیا اور تمہیں موصوف کے سراپے کی خوبیاں سوجھ رہی ہیں۔''

''ہاں...... دل کے ہلنے کی آواز تو یہاں تک آرہی ہے، شاید دل کے کواڑ بڑی زور سے کھلے ہیں۔'' شگفتہ کی کھنکتی ہنسی نے میری چوری پکڑ لی تھی۔ سچ بھی یہ ہی تھا کہ لاکھ بدحواسیوں کے باوجود مجھے وہ نوجوان اچھا لگا تھا۔

شگفتہ کالج سے گھر تک مجھے چھیڑتی رہی، نہ جانے کیوں مجھے اس کا اس طرح بولنا بھی اچھا لگ رہا تھا، ورنہ ہماری دوستی کے سفر میں ایسے مواقع کم ہی آئے کہ میں خاموش اور شگفتہ بولتی رہی ہو۔

شگفتہ کی اور میری دوستی پانچویں کلاس سے تھی۔ محبت و خلاص میں وہ عام لوگوں سے بڑھ کر تھی۔ میرے اور اس کے درمیان ایک ایسا رشتہ تھا جسے وقت کے دھارے کچھ ایسا بندھن نے ہر دور میں نئی توانائی عطا کی تھی۔ وہ میری ہم راز اور ہم مزاج تھی۔ میری محبت، میری زندگی تھی۔ ہمارے درمیان کچھ ایسا بندھن تھا جس کی کھوج میں نے لگائی نہ شگفتہ نے، لیکن جو کچھ بھی تھا بہت لطیف اور پاکیزہ تھا۔ اس اعتبار و یقین میں مجھے اس کے گھر رہنے اور اس کے میرے یہاں ٹھہرنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ گھروں میں چند گلیوں کے فاصلے کے سبب یہ رشتہ کچھ اور بھی مضبوط رہا اور ہمارے والدین کے درمیان بھی محبت اور دوستی کے جذبے بڑے مضبوط رہے۔

میں اور شگفتہ ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب تھے۔ ہمارا ظاہر اور باطن ایک دوسرے کے لیے ایک شفاف آئینے جیسے تھا، جس کے ایک طرف میں اور دوسری طرف سے شگفتہ جھلکتی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ہمارے درمیان کوئی خوابوں کا شہزادہ بھی نہیں تھا۔ میں اور وہ زندگی کو آسانیوں کے ساتھ بسر کرنے کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے۔ شیریں فرہاد کے قصے لاکھ دل نشیں و خواب آفریں سہی، مگر عملی طور پر ہم دونوں ایک ہی مزاج رکھتے تھیں۔ ''وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ جو نہیں ملا اسے بھول جا۔'' کے فلسفے پر ہمارے دل اب تک کسی غم کی چوٹ سے محفوظ تھے لیکن اس چھوٹے سے واقعے نے مجھے نہ جانے کیوں بڑا سرشار کردیا تھا۔ نگاہوں میں بار بار وہی چہرہ اور لفظوں کی گونج سماعتوں میں رس گھولتی رہی۔

اس سرشاری و مستی میں اگلے دن جب میں کالج کے رستے میں تھی تو غیر ارادی طور پر مجھے ہر آہٹ پر یہی گماں ہوتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اس کا دیدار ہوجائے اور دماغ کہتا تھا کہ خود کو ایک ہنگامے سے آشنا نہ کروں۔

کالج کے گیٹ پر دل ہار گیا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا، دماغ نے سمجھانے کی دوبارہ کوشش کی کہ ضروری نہیں یہ کیفیات دوسری طرف بھی ہوں۔ اسے ایک دلچسپ حادثہ سمجھ کر بھول جاؤ مگر بھلانے کی اس کوشش میں مجھے یوں لگا جیسے میں اسے اور بھی یاد کرنے لگی ہوں۔

کالج میں مصروفیات کے باوجود دل کے کسی ایک گوشے میں ایک شور سا برپا رہا اور پھر کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ ان گزرتے دنوں کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں اسے واقعی بھول گئی اور وہ شور بھی اس کے ساتھ تھم گیا۔ لیکن یہ خاموشی ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی جو بہت جلد آنے والا تھا۔

اس روز جب میں شگفتہ کے ساتھ کالج سے گھر واپسی کے لیے نکلی تو وہ کالج کے گیٹ کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری حالت ایک مرتبہ پھر غیر ہونے لگی۔ وہ بڑی محویت سے میری جانب ہی دیکھ رہا تھا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ کالج سے گھر تک میں اس کی نگاہوں کی تپش اپنے رخساروں پر محسوس کرتی رہی۔ یہ تو شکر ہوا کہ شگفتہ کی تیز نظریں میرے چہرے کے تغیرات کو نہ بھانپ سکیں کیوں کہ وہ اس وقت کسی اور ہی سوچ میں گم تھیں۔

اف اس کی آنکھوں میں ایسا کیا تھا جسے دیکھ کر میرا دل بے قابو ہوا جا رہا تھا؟ گھر پہنچ کر، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو یہی سوچ مجھے گھیرے ہوئے تھی۔ میں بہت دیر تک اسی کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی دیر سے کیوں اس کے بارے میں ہی سوچے چلی جا رہی ہوں پھر اس خیال نے کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں، آ کر میرے دل میں ہلچل سی مچا دی۔ دھنک کے سارے رنگ میرے چہرے پر آ کر گزرنے لگے۔

محبت بھی عجیب احساس ہے اگر دونوں طرف ہو تو مزا دیتی ہے اور ایک طرف ہو تو سزا۔ یہ جذبہ اگر اس یقین کے ساتھ آشکار ہو کہ آگ دونوں برابر لگی ہوئی ہے تو یہ آگ بھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا معلوم ہوتی لیکن اگر سامنے کے حالات معلوم نہ ہوں تو یہ ایک لٹکتے خنجر کی مانند معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ میں اس کے دل کا حال نہیں جانتی تھی اس لیے میرا دل شدید اضطراب کا شکار تھا۔

اپنے دل میں پوشیدہ اس راز کے آشکار ہونے کے بعد اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ کیا مجھے اس سے اپنے دل کا حال بیان کر دینا چاہیے یا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے؟ لیکن اگر میں ایسا کرنا بھی چاہوں تو یہ میرے لیے کیسے ممکن ہے؟

نہیں...... مجھے کسی صورت بھی پہل نہیں کرنی چاہیے اور اس سے آگے مجھے کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں۔

اگلے دن جب میں ان ہی بادامی آنکھوں کے خمار میں کھوئی شگفتہ کے ساتھ کالج جانے کے لیے بس اسٹاپ کی پہنچی وہی بادامی آنکھیں مجھے کسی کی منتظر نظر آئیں۔ کہیں انہیں میرا ہی انتظار تو نہیں، اس خیال نے میرے اندر ایک سرشاری سی بھر دی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ کھل اٹھا۔ وہ بالکل کل جیسی محویت سے مجھے دیکھے جا رہا تھا اور میں کل سے بھی زیادہ نروس ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے جیسے ہی ہم بس اسٹاپ پر پہنچے تو شگفتہ نے حسب عادت اس پر بھی چوٹ کر دی۔

''لگتا ہے آج تو کوئی گیا کام سے......'' اس نے ایک ادا سے ہاتھ کو لہراتے ہوئے کہا تو میں اپنی ہنسی کو روک نہ سکی اور وہ سر کھجاتا تھوڑا سا شرمندہ ہو کر دوسری دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں بس بھی آ گئی۔ اور ہم بس میں سوار ہو گئے۔

پھر تو یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر روز صبح کالج جاتے ہوئے اور کالج سے واپسی پر مجھے کبھی کالج کے سامنے اور کبھی بس اسٹاپ نظر آنے لگا۔ جب بھی میرا اس سے سامنا ہوتا وہ بس ایک ٹک مجھے ہی دیکھے جاتا۔ آس پاس سے گزرتے لوگ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے لیکن اسے تو شاید ان کا ہوش ہی نہ رہتا تھا۔ اس کی اس ادا پر کبھی میں شرماتی اور کبھی مسکراتی ہوئی اس کے پاس سے خاموشی سے گزر جاتی۔ میرے لیے جو بات سب سے زیادہ اطمینان بخش تھی وہ یہ تھی کہ اس نے کبھی بھی میرا پیچھا کرنے یا ہماری گلی کے چکر لگانے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اب ہر موڑ پر، ہر آہٹ پر اس کا انتظار رہنے لگا۔ مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ آگ دونوں جانب برابر لگی ہوئی ہے۔

اس دن جب میں کالج سے واپسی کے لیے نکلی تو شگفتہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ کیوں کہ اس روز اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ پورے پیریڈ اٹینڈ کیے بغیر ہی گھر چلی گئی تھی۔ جیسے ہی میں کالج سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچی تو اس نے ایک خط میری طرف اچھال دیا۔ خط مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر آ کر گرا، اگرچہ اسٹاپ پر اس وقت کوئی زیادہ لوگ موجود نہیں تھے اس کے باوجود کیوں کہ وہ سامنے کھڑا تھا اس لیے مارے شرم کے مجھ میں وہ خط اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر شاید اسے میری کیفیت کا احساس ہوا تو وہ وہاں سے دور چلا گیا۔ جیسے ہی اس کی پشت میری جانب ہوئی تو میں نے لپک کر وہ خط اٹھا کر بیگ میں ڈال لیا اور جھٹ سے سامنے سے آتی ہوئی بس میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔

میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اس کے دھڑکنے کی آواز مجھے اپنے کانوں تک آتی محسوس ہو رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے، منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا اور امی کو آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنا بیگ کھول کر اس میں سے اپنی زندگی کا پہلا محبت نامہ نکالا اور پڑھنے لگی۔ اس نے لکھا تھا۔

''میری جانِ عزیز!

میں زعفران ہوں، جس کے دل و دماغ پر آپ نے یہ جانے کیا جادو کر دیا ہے کہ دل ہے تو وہ ہر وقت آپ کی آرزو کرتا ہے اور دماغ...... دماغ ہر وقت آپ کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے۔ جس دن سے آپ کو دیکھا ہے آپ کی طرح یہ دنیا بھی مجھے بہت حسین لگنے لگی ہے۔ میں نے آپ کی نظروں میں آنے کے لیے اس دن آپ کے نازک سراپے سے ٹکرا کر جو گستاخی کی، اس کے لیے میں معذرت خواں ہوں۔

میری پہلی تمنا! میں آج اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے نکلتی اس صدا کو کہ ''اے پری جمال میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔'' کو آپ تک پہنچا کر ایک اور گستاخی کرنے جا رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ کو شاید میری یہ گستاخی بھلی لگے۔ اگر بھلی لگے تو اقرار کرنے میں دیر مت لگائیے گا اور اگر بری لگے تو انکار کی تلوار سے میرے دل کے ان ارمانوں کا یہیں قصہ تمام کر دیجیے گا۔

آپ کے فیصلے کا منتظر

زعفران احمد

اس تحریر نے میرے اندر کچھ ایسی سرشاری بھر دی کہ میرا دل جھوم اٹھا۔ مارے خوشی کے میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا کی خوشیاں زعفران نے اس کاغذ کے انمول ٹکڑے میں لکھ کر میرے نام کر دی ہوں۔ اپنے پلنگ پر لیٹی انہیں احساسات میں گھری میں نے دوپہر سے شام کر دی۔

''لگتا ہے ڈر کہ بات یہ دل کی دل میں نہ رہ جائے۔''...... دور کہیں بجتے گانے کے یہ بول مجھے خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئے۔ اسی لمحے میں نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور اپنا حال دل رقم کرنے لگی۔

''میرے زعفران!

آپ کے دل سے نکلتی جس صدا نے آج میرے کانوں تک رسائی پائی ہے، اس صدا کو سننے کے لیے تو میں اس وقت سے بے چین تھی جب کتابیں پکڑتے ہوئے آپ کے خوب صورت ہاتھوں کا لمس میں نے اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کہوں گی کہ جو آپ کا حال ہے میرا بھی وہی حال ہے۔

فقط

آپ کی اور صرف اور صرف آپ کی

صائمہ

خط کو لپیٹ کر اسے ایک کتاب میں رکھا اور کتاب اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

رات کو کھانا کھا کر جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو جو فکر مجھے لاحق تھی وہ یہ تھی کہ یہ خط زعفران تک کیسے پہنچے گا؟ رات دیر تک میں اسی متعلق سوچتی رہی اور پھر شگفتہ کا خیال آتے ہی میں لمبی تان کر سو گئی۔

صبح جب میں اپنے کمرے سے متصل واش روم سے نہا کر نکلی تو شگفتہ میرے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہ خط دیکھ کر میں مسکرائی، شرمائی اس کے پاس پہنچی تو اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"اچھا...... تو اب بات یہاں تک پہنچ چکی اور مجھے کچھ خبر ہی نہیں...... بہت اچھے بھئی!"

"یار...... ایسی کوئی بات نہیں ہے، یہ تو......"

اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کر پاتی وہ بولی۔

"ابھی کوئی بات نہیں ہے تو یہ حال ہے اور اگر کوئی بات ہو گئی تو......؟" وہ شوخی سے بولی۔ "اب تو میں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟" اس نے میرا کان پکڑتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"کل جب میں کالج سے واپس آ رہی تھی تو زعفران نے اپنا حال دل مجھے تھما دیا۔ یہ اسی محبت نامے کا جواب ہے، جو اس وقت تیرے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پہلے نہ تو کبھی میری اس سے کوئی بات ہوئی ہے اور نہ کبھی کہیں ملاقات۔" میں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو آپس میں مسلتے ہوئے کہا۔

"اللہ...... تو کتنی جھوٹی ہے۔ کہتی ہے اس سے پہلے کبھی تیری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی...... یہ جو روزانہ کالج آتے جاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنی ساری باتیں ہوتی ہیں...... مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ ہماری بنو تو اب گئی ہاتھ سے......"

"شگفتہ میری بہن! میرا ایک کام کر دے گی؟" میں نے بنا کسی تمہید کے اپنے مقصد کی طرف بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیسا کام؟"

"تو میرا یہ پیغام اس تک پہنچا دے گی؟" میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"اوں...... ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ میری پیاری بہن! تیرے سوا میں کس سے یہ بات کہہ سکتی ہوں۔ اب تو تیرا ہی آسرا ہے۔ میں تیرا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔" یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

پہلے تو اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اپنا منہ دیکھ آئینے میں...... کیسے رونی صورت بنائی ہے ایک ہی منٹ میں۔" کچھ دیر توقف کے بعد پھر بولی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تو فکر مت کر میں تیرا کام تمام کر دوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ خط اپنے پرس میں رکھ لیا۔ پھر ناشتا کرنے کے بعد جب ہم کالج جانے کے لیے بس اسٹاپ پر پہنچے تو زعفران اسٹاپ سے چند قدم پہلے کھڑا نظر آ گیا۔ آج وہ کچھ پزل دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آج اس کی آنکھوں میں محویت کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ کا بھی عنصر شامل تھا۔ ہم دونوں اس کے پاس سے گزر کر سیدھا اسٹاپ پر جا پہنچے۔

"تو یہیں ٹھہر...... میں ذرا میاں مجنوں سے مل کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر شگفتہ نے اپنے پرس میں سے وہ خط نکالا اور اپنا پرس میرے حوالے کر کے زعفران کی طرف بڑھنے لگی۔

اس وقت میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی کہ اس وقت ابو یا شہباز بھائی کہیں سے یہاں آ گئے اور انہیں اس معاملے کی ذرا سی بھنک پڑ گئی تو وہ تو مجھے قتل ہی کر دیں گے۔ میرے ابو ایک انتہائی غیرت مند آدمی تھے اور ان کے غصے سے تو پورا گھر کانپتا تھا۔ غصے کے معاملے میں شہباز بھائی کسی طور ابو سے کم نہیں تھے معمولی معمولی باتوں پر وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جایا کرتے تھے۔

خدا خدا کر کے کچھ دیر بعد شگفتہ، زعفران کو نہ

جانے کیسے وہ خط دے کر واپس آئی۔ اس وقت میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ کالج پہنچ کر میں نے اسے کلاس روم کی راہداری میں لگے ایک بینچ پر لا بٹھایا۔

"تو نے اسے خط دے دیا نا!" میں نے اپنی تجسس سے مجبور ہو کر فوراً پوچھا۔

"ہاں...... کہہ رہا تھا، آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"پھر......؟"

"پھر کیا میں مینشن ناٹ، کہتی ہوئی واپس آ گئی۔" شگفتہ نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ "صائمہ تو کیا سمجھتی ہے تو جو کر رہی ہے، ٹھیک کر رہی ہے؟ تو نے کبھی یہ سوچا ہے کہ اگر شہباز بھائی کو یا انکل کو تیرے ان کارناموں کی خبر ہوئی تو ان کے دل پر کیا گزرے گی؟"

شاید اب وہ خود کو اس معاملے سے علیحدہ کرنا چاہتی تھی۔

اس کے اس سوال نے مجھے بھی سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھ شگفتہ! زعفران کوئی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہے۔ وہ بہت ہی شریف اور اچھا لڑکا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ بھی کبھی میری رسوائی کا باعث بننا پسند نہیں کرے گا۔"

"تجھے کیسے پتا کہ وہ اچھا ہے، تو اس کو کیا پچاس سال سے جانتی ہے؟" اس نے اب کی بار کچھ جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"تو مانتی ہے نا کہ عورت اپنے اوپر پڑنے والی ہر نگاہ کا مطلب سمجھتی ہے...... ہے نا؟ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے اس کی آنکھوں میں کبھی کسی غلط ارادے کی ہلکی سی پرچھائی بھی نظر نہیں آئی۔" میں نے بہت پیار سے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میری جان محبت اندھی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی محبت نے تیری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہو......؟" شگفتہ نے میرے ہی انداز میں جواب دیا تو میں جھنجلا اٹھی۔

"بس کچھ بھی ہے اب میں نے اپنی زندگی کے لیے ان ہی راہوں کا انتخاب کر لیا ہے، اب چاہے ان راہوں پر کانٹے بچھے ہیں یا پھول میں ان راہوں سے واپس نہیں لوٹ سکتی۔" میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا اور اٹھ کر کلاس روم میں آ گئی۔

☆☆☆

اس دن کے بعد میں نے شگفتہ کے رویے میں ایک واضح تبدیلی محسوس کی۔ اب وہ مجھ سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی لیکن اب میرے پاس سوچنے کے لیے شگفتہ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اس لیے میں نے اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ اب اکثر علیحدہ ہی کالج جایا کرتی، میں نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا کیوں کہ اس میں میرا ہی فائدہ تھا اس طرح میں آسانی سے زعفران سے مل سکتی تھی، اس سے باتیں کر سکتی تھی۔

اب زعفران اکثر مجھے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ایک کریانے کی دکان کے پاس کھڑا ملتا۔ کبھی کبھار ہم دونوں پارک میں بھی جایا کرتے تھے۔ جس دن بھی ہمارا ملنے کا پروگرام ہوتا میں چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے ہی کالج سے نکل آیا کرتی تھی۔

زعفران کی سنگت میں، میں خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی سمجھا کرتی۔ بلاشبہ میں لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ایک تھی لیکن زعفران بھی ایسا ہی لڑکا تھا جس کی شریک حیات بننے کی خواہش لاکھوں نہیں کروڑوں لڑکیوں کے دل میں ہوتی ہے۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بی ایس سی کر رکھا ہے اور اب اس کا اپنا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے والد کا ہری پور میں بسوں کا ایک اڈہ ہے اس کے علاوہ ان کی اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ مال و دولت کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جب زعفران اپنا رشتہ میرے لیے بھیجے گا تو میرے گھر والوں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن میں ڈرتی تھی کہ کہیں زعفران کے گھر والے اس رشتے کی مخالفت نہ کریں۔ اپنے اس خوف کا اظہار

جب میں نے زعفران سے کہا تو اس نے جواب میں مجھ سے کہا کہ بھلا تم میں کس چیز کی کمی ہے جو میرے گھر والوں کو اعتراض ہوگا اور ویسے بھی میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ میری خواہش کو کبھی رد نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

سب کچھ بہت اچھا چل رہا تھا۔ ان ہی دنوں وسیم بھائی کی شادی کا سلسلہ چل نکلا۔ وسیم بھائی ہمارے محلے میں ہی رہتے تھے اور ان کی بہن صابرہ سے میری اچھی خاصی دوستی تھی۔ آج مہندی کی رسم تھی۔ تقریباً سب ہی محلے دار خواتین یہاں موجود تھیں۔ رسم کا اہتمام صابرہ کے گھر کی چھت پر کیا گیا تھا۔ مہندی بڑے زور و شور سے جاری تھی کہ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ میں صابرہ کو کچھ دیر میں واپس لوٹنے کا کہہ کر نیچے کی طرف بڑھ گئی۔ ان کا گھر دو منزلہ تھا۔ جب میں سیڑھیاں اترتی ہوئی گراؤنڈ فلور پر پہنچی تو وہاں حسب توقع بالکل سناٹا تھا کیوں کہ سب لوگ اوپر رسموں میں مصروف تھے۔ جیسے ہی میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا تو سیڑھیوں کے برابر بنے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے پیچھے سے ظاہر ہونے والے چہرے کو دیکھ کر میں ایک دم اچھل پڑی۔

”زعفران تم......؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں میں......ادھر اندر آ جاؤ، مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے کے اندر کھینچ لیا۔

کمرے کے اندر زعفران اور میرے علاوہ کوئی بھی نہیں۔ ایسا موقع میری زندگی میں پہلی بار آیا تھا کہ میں زعفران سے یوں تنہائی میں مل رہی تھی۔ اس سے پہلے ہمارے درمیان جو بھی بات ہوئی وہ یا تو را چلتے میں ہوئی یا پھر اس کریانے کی دکان کے سامنے، اس کے علاوہ ایک دو مرتبہ میں اس سے ایک پارک میں بھی مل چکی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہاں میرا اس کے ساتھ رکنا کسی طور بھی ٹھیک نہیں ہے اس لیے جلد جلد بات ختم کر کے یہاں سے نکلنا ہی مناسب جانا۔

”تم یہاں اس کمرے میں کیا کر رہے ہو؟ مجھے یوں یہاں بلانے کا کیا مطلب ہے؟“ میں نے اس سے کہا۔

”میں وسیم کی طرف سے مدعو تھا۔ جب تم او سے نیچے اتر رہی تھیں تو اسی وقت میں یہاں پہنچا تھا باہر کا دروازہ کیوں کہ کھلا ہی ملا اس لیے میں سید اندر ہی آ گیا اور جب تمہیں سامنے سے آتا دیکھا میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے سوچا ا سے بہتر موقع ہمیں شاید پھر بھی میسر نہ آ سکے...“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

آج اس کی آنکھوں میں مجھے واضح طور بھوک نظر آئی لیکن میں نے اسے اپنی خام خیالی تصو کرتے ہوئے ذہن سے جھٹک دیا۔

”اچھا......اب جلدی جلدی بتاؤ کیا ضرور بات کرنا ہے؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

جواب میں اس نے کچھ کہنے کی بجائے میر ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب کرنا چاہا لیکن میں تیزی س اس کی گرفت سے نکل گئی۔ کچھ دیر پہلے جسے میں اپنی خام خیالی سمجھ کر ذہن سے جھٹکنا چاہا تھا و دراصل حقیقت حال تھی اس بات کا اندازہ ہوتے ہ میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے......“ میں نے برہمی سے کہا۔

”یہی تو پیار ہے......“ اس نے خباثت س مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہٹ جاؤ میرے راستے سے میں جا رہی ہو اور آج کے بعد تمہاری صورت بھی نہیں دیکھوں گی؟“

اس کی اس حرکت نے میرے دل کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ ”اور اگر نہ جانے دوں تو......؟“ اس نے اپنا ایک بازو دروازے اور میرے درمیان حائل کرتے ہوئے کہا۔

”کرن......وسیم بھائی......“ میں زور سے چلائی۔

اس سے پہلے کہ میں دوبارہ مزید زور سے چلاتی، وہ تیزی سے کمرے کی عقبی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس واقعے نے مجھے اس بری طرح جھنجوڑا کہ زعفران کی محبت کا سارا نشہ ایک ہی پل میں کافور ہو گیا لیکن اب زعفران کی محبت کی جگہ میرے دل میں پچھتاوؤں اور مایوسیوں نے گھر کر لیا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی پسند پر دکھ ہو رہا تھا۔ میں جسے ایک شریف اور پرخلوص انسان سمجھتی رہی حقیقت میں وہ ایک بھیڑیا نکلے گا میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ پوری رات میں نے روتے ہوئے جاگ کر گزاری۔ اگلی صبح تیز بخار نے مجھے آ گھیرا۔ جب میں تین دن مسلسل کالج نہ پہنچی تو شگفتہ کو میری فکر لاحق ہوئی اور وہ میرے گھر آن پہنچی۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تو لاکھ کوشش کے باوجود میں خود کو روک نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا میری جان۔“ اس نے مجھے پیار سے بھینچتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں......بس تمہیں اپنے پاس دیکھ کر یوں ہی جی بھر آیا۔“ میں نے اپنے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”تو مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے......دیکھ سچ سچ بتا آخر بات کیا ہے؟“

مجھے غم زدہ دیکھ کر شگفتہ بھی غمگین ہو گئی تھی۔ اس کی ہمدردی پا کر آنسوؤں کا ایک سیلاب میری آنکھوں میں جمع ہو گیا اور میں پھر سے رونے لگی۔ بہت دیر تک وہ خاموش بیٹھی میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتی رہی پھر جب میں جی بھر کر رو لی تو اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ میں سے پانی کا ایک گلاس بھر کے اپنے ہاتھوں سے مجھے پانی پلایا تو میری حالت کچھ بہتر ہوئی۔

”چل اب سب سے پہلے اپنے آنسو پونچھ اور پھر مجھے بتا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟“ اس نے پیار سے میری پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

”تو ٹھیک کہتی تھی......میں نے زعفران کو سمجھنے میں بہت بڑی کی ہے۔ وہ مجھ سے نہیں میرے جسم سے محبت کرتا ہے۔ میں اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی، میں اب اس سے کبھی نہیں ملوں گی اور نہ اس کے لیے روؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فیصلہ کن انداز میں اپنے آنسوؤں کو سختی سے پونچھ ڈالا۔

”آخر بات کیا ہوئی کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟“ اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

جواب میں، میں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے اس رات کے واقعے کی تفصیل اس کے سامنے بیان کر دی۔

”اچھا ہی ہوا جو اس کی اصلیت جلدی ہی کھل کر تیرے سامنے آ گئی، بعد میں تیرے لیے لوٹنا شاید بہت مشکل ہو جاتا۔“ اس نے مجھے تسلی دی۔

اب میں اسے کیا کہتی کہ میں نے ابھی ابھی جو فیصلہ کیا ہے اس پر میں قائم بھی رہ پاؤں گی اس بات کا مجھے خود بھی بھروسا نہیں ہے کیوں کہ اتنی مشکلوں سے تو یہ بات زبان سے ادا کر پائی ہوں اس پر عمل کرنا میرے لیے کتنا مشکل ثابت ہوگا اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا۔

☆☆☆

زندگی ایک بار پھر اپنے معمول پر لوٹنے لگی۔ شگفتہ سے میں نے اپنے رویے کی معافی مانگ لی تھی۔ اب معمولات پھر سے پرانی ڈگر پر آ گئے تھے۔ وہی ایک ساتھ کالج جانا، کالج سے ایک ساتھ واپس آنا۔ کالج سے واپسی کے بعد شام سے رات دیر تک ایک ساتھ اسٹڈی کرنا۔

یوں ہی ایک ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران زعفران سے میرا ابھی سامنا نہیں ہوا۔ پھر ایک دن وہ کالج سے واپسی پر میرے راستے میں آن دھمکا۔ اس کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ بڑھی شیو، بکھرے بال اور آنکھوں میں جیسے ویرانیوں نے بسیرا ڈال رکھے تھے۔

”مجھے معاف کر دو صائمہ! میں بہک گیا تھا۔ یقین کرو، میں اپنی غلطی پر بہت پشیمان ہوں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں......“ اس نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اگر تم نے مجھے

معاف نہ کیا تو خود کشی کرلوں گا۔ پلیز میری اس چھوٹی سی بھول کو معاف کردو۔''

''تم مرو یا جیو...... مجھے اسے کوئی سروکار نہیں......'' میں نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے آگے بڑھ جانا چاہا تو وہ پھر بولا۔

''میری محبت کا یقین کرو...... پلیز! میری محبت بالکل پاکیزہ ہے...... اس دن مجھ سے جو غلطی ہوئی اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اس چھوٹی سی بھول کی مجھے اتنی بڑی سزا تو مت دو......'' پھر وہ کچھ لمحے سوچنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''آج شام کو پانچ بجے تک میں تمہارا پہاڑی پر انتظار کروں گا...... اگر تم نہ آئیں تو پہاڑی سے کود کر جان دے دوں گا شاید اس طرح سے تمہیں میری محبت کا یقین آجائے۔''

''پانچ بجے تک انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ میں کبھی نہیں آؤں گی۔ لہٰذا تم اپنا قیمتی وقت ضائع کیے بغیر یہ کام ابھی کے ابھی کر سکتے ہو۔'' میں نے سنگ دلی سے جواب دیا اور شگفتہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔

گھر میں نے شگفتہ کو خدا حافظ کہنا چاہا تو وہ بولی۔ ''میں کہیں نہیں جارہی...... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے ساتھ گھر میں داخل ہوگئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب میں اور شگفتہ کمرے میں داخل ہوئے تو بلا کسی تمہید کے بولی۔

''صائمہ! تو کیا سمجھتی ہے تو زعفران کے ساتھ جو کررہی ہے وہ ٹھیک ہے؟''

''ہاں...... اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' میں نے غصے سے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ ماضی میں اس کی سوچ غلط رہی ہو...... لیکن مجھے لگتا ہے کہ تیری محبت نے اس کی سوچ کا رخ بدل دیا ہے۔ اس کی حالت دیکھی تو نے، بالکل دیوانہ بنا پھر رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تو اپنے فیصلے پر دوبارہ سے غور کر تیرے لیے یہی بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تجھے اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے۔

''ایک تو مجھے تیری سمجھ میں نہیں آتی...... پل میں تولہ اور پل میں ماشا۔ کل تک تو اس محبت کے خلاف تھی اور آج جب میں اس محبت نام کے فریب کے پنجرے سے آزاد ہو چکی ہوں تو، تو چاہتی ہے کہ میں دوبارہ اسی پنجرے میں قید ہو جاؤں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''میں صرف اور صرف تجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔

جانتی ہے جب سے تو نے زعفران کے ساتھ ترک تعلق کیا ہے، میں نے تیرے لبوں پر کبھی خوشی نہیں دیکھی۔ تو لاکھ کوشش کے باوجود اسے بھلا نہیں پائی...... اگر اب وہ تیری خاطر سدھرنا چاہتا ہے، اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے تجھ سے ملنا چاہتا ہے تو اس میں آخر کیا برائی ہے اور اسی میں تو تیری بھی خوشی ہے۔'' چند لمحے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں...... تیرے پاس صرف دو گھنٹے ہیں اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا۔ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا حافظ۔''

شگفتہ تو چلی گئی لیکن اب مجھے ایک نئی فکر سے دوچار کر گئی اب میں سوچنے لگی کہ شگفتہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ میں یہ کب چاہتی تھی کہ زعفران میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے، میں تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ وہ محبت جیسے پاکیزہ جذبے کی توہین نہ کرے

میں نے گھڑی کی طرف نگاہ اٹھائی تو اس وقت چار بج چکے تھے۔ اسی لمحے میں نے ایک فیصلہ کیا اور منہ ہاتھ دھو کر پہاڑی کی طرف چل دی۔ پہاڑی ہمارے گھر سے تقریباً ایک کلو میٹر دور تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں تیز تیز چلوں تو آدھے گھنٹے میں پہاڑی تک جاؤں گی۔ اس کے باوجود مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

امی سے میں نے صابرہ کے گھر جانے کا کہا اور گھر سے نکل پڑی۔ جب میں وہاں پہنچی تو مجھے دیکھ کر زعفران کا مرجھایا ہوا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی......'' اس نے خوشی سے جھلملاتی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے کہا۔

''اب کی بار تو میں نے تمہیں معاف کردیا لیکن اگر آئندہ تم نے ایسی غلطی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' پیار بھری خفگی کے ساتھ میں نے جواب دیا۔

''میرے باپ کی توبہ......'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو ہم دونوں ہنس دیے۔

☆☆☆

خوشیاں پھر سے میرے زندگی میں لوٹ آئیں۔ اب ہماری ملاقاتیں گلیوں اور پارکوں کی بجائے فاسٹ فوڈ کے ایک ریستوران میں ہونے لگیں کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ یوں پارکوں اور گلیوں میں ملنے سے ہم ابو یا شہباز بھائی کی نظروں میں بھی آسکتے ہیں۔ اب زعفران پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس میں ایک واضح تبدیلی آگئی تھی۔ وہ نہ تو کبھی مجھ سے زیادہ دیر رکنے کی فرمائش کرتا تھا اور نہ کبھی میرے قریب ہونے کی۔ اس کی یہ تبدیلی میرے لیے بہت خوش آئند تھی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا اور گزرتے وقت کے ساتھ میرا زعفران کے خلوص پر اعتماد پختہ ہوتا چلا گیا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے ایک منصوبہ رکھ دیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اسلام آباد اور دیگر نواحی تفریحی مقامات کی سیر پر جانا چاہتا تھا۔ اس تفریحی دورے پر پورا ایک دن صرف ہونا تھا اور پورے دن کے لیے گھر سے باہر اکیلے نکلنا...... شگفتہ کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا کیوں کہ اب زعفران پر مجھے پورا بھروسا تھا اس لیے میں اس کے ساتھ اس تفریحی ٹور پر ضرور جانا چاہتی تھی لہٰذا میں نے شگفتہ کی منت سماجت کر کے بڑی ہی مشکلوں سے اسے اس کام کے لیے راضی کیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے پہلے ہم لوگ لوٹ آئیں گے۔ شگفتہ کو راضی کر لینے کے بعد جب میں گھر کی طرف لوٹنے لگی تو اس نے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''اسے اپنے پاس ہی رکھنا...... ہوسکتا ہے کل تجھے کہیں اس کی ضرورت پیش آجائے۔''

میں نے اسے منع کرنا چاہا لیکن اس کے اصرار کے آگے بالآخر مجھے ہار ماننا ہی پڑی۔

☆☆☆

اس دن میں نے امی سے صبح ہی کہہ دیا کہ میں کالج سے واپسی پر شگفتہ کے گھر چلی جاؤں گی۔ آپ فکر مت کیجیے گا۔ امی کو مطمئن کر کے میں تقریباً سوا سات بجے بس اسٹاپ پر پہنچی تو زعفران میرا منتظر تھا۔ بلیو جینز پر دھاری دار سیاہ ٹی شرٹ پہنے آج وہ بہت ہی خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس نے میری کتابیں لیں اور کریانہ کی دکان پر رکھوا آیا۔ پھر ہم نے وہاں سے ٹیکسی پکڑی اور لاری اڈے کی طرف روانہ ہوگئے۔ اڈے پر پہنچ کر ہم سیدھے اسلام آباد جانے والی بس میں جا بیٹھے۔ بس کے ٹکٹ اس نے پہلے ہی بک کرا رکھے تھے۔ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

جب ہم اسلام آباد پہنچے تو اس وقت 9 بج چکے تھے۔ اسلام آباد پہنچ کر ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اور شاہ فیصل مسجد پہنچے۔ وہاں ہم نے زعفران کے کیمرے سے چند تصویریں ایک ساتھ اور چند ایک دوسرے کی بنائیں۔ پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم چڑیا گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ چڑیا گھر کی سیر کو میں نے خوب انجوائے کیا۔ زعفران کی ضد پر میں نے وہاں گھڑ سواری بھی کی جو میرے لیے ایک انوکھا اور پر مسرت تجربہ تھا۔

جب ہم چڑیا گھر سے نکلے تو اس وقت ساڑھے بارہ کا وقت تھا۔ وہاں سے نکل کر ہمیں دامن کوہ کی طرف جانا تھا لیکن اب مجھے گھر کی پریشانی لاحق ہونے لگی تھی میں نے زعفران سے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے باقی جگہوں کی سیر پھر کبھی موقع ملا تو کرلیں گے لیکن وہ بضد تھا آخر اس کی ضد کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ دامن کوہ کے بارے میں میرے ذہن میں جو تصور ابھرا کرتا تھا اس کے برعکس

وہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی جو کہ اسلام آباد کے بالکل سامنے پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ اس جگہ آ کر مجھے کوئی خاص لطف نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ میری گھر کی طرف سے پریشانی ہو۔ کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد میں نے زعفران کی منت کی اب ہمیں واپس چلنا چاہیے بہت دیر ہو چکی ہے اور واپس ہری پور جانے کے لیے بھی ہمیں دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اگر میں شام ڈھلے شگفتہ کے پاس نہ پہنچی تو وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن زعفران کا اصرار تھا کہ ہم کم از کم شکر پڑیاں تک تو ہو کر ہی جائیں گے۔ اس بار میں نے ہار نہیں مانی اور بالآخر زعفران کو قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ پھر ہم لوگ وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر کراچی کمپنی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے ایک ہوٹل کے سامنے ٹیکسی رکوالی۔

''بس! ہمیں یہیں اتار دو......'' اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

''لیکن جناب ابھی کراچی کمپنی تو نہیں آیا۔'' ڈرائیور نے برجستہ جواب دیا۔

''تمہیں اس سے مطلب......ہم نے کھانا کھانا ہے اس لیے یہاں رکنا چاہتے ہیں۔ تم اپنے پیسے پکڑو اور جاؤ۔'' اس نے سو روپے کا نوٹ ٹیکسی والے کو تھماتے ہوئے کہا۔

مجھے باہر کھڑا کر کے زعفران ہوٹل کے اندر داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل کی اوپری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ ہم یہاں کھانا کھانے کے لیے رکے ہیں......''

''ہاں......میں نے غلط تو نہیں کہا تھا'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم ہال میں کنفیوژ ہو گی اس لیے میں نے ایک کمرا بک کرا لیا ہے۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ ایک ٹیبل لیمپ، انٹرکام اور ایک ٹی وی موجود تھا۔ یہاں آ کر مجھے عیب سے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی زعفران اوندھے منہ بیڈ پر جا لیٹا اور میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

''زعفران......جلدی سے کھانا منگواؤ اور کھانا کھا کر ہم لوگ اب بس واپس چلیں گے۔'' میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کھانے کا آرڈر میں نے دے دیا ہے۔ ویٹر ابھی کھانا لے کر آتا ہی ہوگا۔''

ابھی اس نے بات مکمل کی ہی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ زعفران نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ویٹر کھڑا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کھانے کی ڈشیں پکڑیں اور اسے روانہ کر دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر زعفران نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھا لیا۔ اس کی اس حرکت پر میں سیخ پا ہو گئی۔

''تم جانتے ہو نہ کہ مجھے اس قسم کی حرکتیں کتنی ناپسند ہیں......'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

تو وہ بجائے شرمندہ ہونے کے زبردستی پر اترنے لگا۔ اس نے مجھے اپنے قریب کرنا چاہا تو میں نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی اولڈ فیشنڈ ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور جلد ہی ہماری شادی بھی ہو جائے گی پھر بھلا تمہیں کس بات پر اعتراض ہے۔ تم میری بات کیوں نہیں مان لیتیں۔'' وہ ڈھیٹ بن کر بولا۔

''شادی سے پہلے تم مجھ سے دور ہی رہو تو یہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''اچھا بابا اچھا......اب میں شادی کے بعد ہی تم سے کوئی بات کروں۔ اوکے......اب غصہ تھوک دو......'' مجھے یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

نہا دھو کر کوئی دس منٹ بعد وہ باتھ روم سے نکلا اور مجھے کچھ دیر میں آنے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ لاک کر دیا۔ مجھے رہ رہ کر گھر کا اور اپنی غلطی کا خیال آ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی مجھے زعفران کے ساتھ یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ ایک بار میں کسی طرح اپنے گھر پہنچ جاؤں پھر میں ایسی غلطی دوبارہ کبھی نہیں کروں گی۔ نہ جانے میرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ کہیں وہ مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے شگفتہ کے گھر پہنچ گئے تو پھر کیا ہوگا۔

زعفران کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اس وقت دوپہر کے تین بج چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ کسی سوچ میں گم ہو پاتی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے زعفران کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور کالا سا شخص بھی تھا میں نے یہ سوچ کر کہ ہوٹل کے اسٹاف کا کوئی آدمی ہوگا اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ زعفران نے اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور پھر اس حبشی سے کہنے لگا۔

''تم جاننا نہیں چاہوں گی یہ صاحب جو میرے ساتھ تشریف لائے ہیں کون ہیں......؟'' اس نے مجھے مخاطب کرنا چاہا لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دیر توقف کے بعد وہ خود کہنے لگا۔ ''اچھا ہے......میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔ ان سے میں نے تمہارا 20 ہزار روپے میں سودا کر دیا ہے۔ اب یہ جو چاہیں تمہارے ساتھ کر سکتے ہیں انہیں روکنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔''

یہ سن کر میرے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی اگر میں اس وقت کھڑی ہوئی ہوتی تو یقیناً اب تک گر چکی ہوتی۔

وہ بولتا رہا۔ ''تم یہ تو ضرور جاننا چاہو گی کہ تمہیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ جس طرح خون کا بدلہ صرف خون ہوتا ہے اسی طرح عزت کا بدلہ بھی صرف عزت ہی ہوتی ہے۔ میری بہن نے بھی بالکل تمہاری طرح ایک لڑکے سے محبت کی تھی لیکن اس لڑکے نے اس کی عزت سے کھلواڑ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ میری بہن یہ صدمہ نہ برداشت کر سکی اور اس نے خودکشی کر لی۔ جاننا چاہتی ہو کہ وہ لڑکا کون تھا......وہ تمہارا بھائی شہباز تھا۔ جس دن میری بہن نے خودکشی کی تھی اسی دن میں نے قسم کھائی تھی کہ شہباز کو اس کے کیے کی سزا ضرور دوں گا۔ اس لیے میں نے تمہارے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچایا۔ میں تمہیں اس طرح کسی کے آگے بیچنا ہرگز نہیں چاہتا تھا میں تو تمہارے ساتھ وہی کچھ کرنا چاہتا تھا جو تمہارے بھائی نے میرے بہن کے ساتھ کیا تھا کیوں کہ میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں اس لیے میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکا۔ لیکن یہ خوب صورت حبشی پورا جلاد ہے یہ تمہارا وہ حال کرے گا کہ تم اور تمہارا بھائی ساری زندگی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گے۔''

ابھی نجانے وہ اور کتنا زہر اگلنا چاہتا تھا کہ اس حبشی نے 20 ہزار روپے نکال کے زعفران کے حوالے کیے اور اسے وہاں سے روانہ کر دیا۔

جیسے ہی زعفران کمرے سے باہر نکلا اس کالے حبشی نے میری جانب پیش قدمی شروع کر دی اس کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا تو میں نے زور سے چلانا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ میری آواز ہونٹوں تک پہنچ پاتی اس نے مضبوطی سے میری ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے مجھے اٹھا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ ایک ہاتھ اس نے اب بھی میرے منہ پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو قابو کر رکھا تھا۔ میں اس کی گرفت میں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک لمحے کو اس کا دھیان دستک کی جانب ہوا ہی تھا کہ میں نے ایک جھٹکے سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ کو اٹھا کر اس کے سر پر ایک زوردار ضرب

لگادی۔ ضرب اتنی کاری تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں بجلی کی سی پھرتی سے اٹھی اور لپک کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سامنے دروازے پر ویٹر کھڑا تھا جو شاید برتن لینے واپس آیا تھا۔ اس نے جب میری حالت دیکھی تو اسے اندر پیش آنے والے واقعے کو سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑ کر مجھے وہاں سے بھاگ جانے کو کہا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی ہوٹل سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلتے ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی والے کو میں نے لاری اڈہ چلنے کو کہا لاری اڈہ پر پہنچ کر ٹیکسی والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہوگئی۔ بس میں بیٹھ کر میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو مجھے پتا چلا کہ میرے ہاتھ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس دھینگا مشتی میں میرے ہاتھ کی چوڑیاں ٹوٹ کر میرے بازو میں چبھ گئی تھیں اور میری قمیص بھی بازو سے تھوڑی سے پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی چادر کو پھاڑ کر پہلے اپنے بازو پر باندھا اور پھر چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی جس سے پھٹی ہوئی قمیص چھپ گئی۔

☆☆☆

جس وقت میں شگفتہ کے گھر پہنچی تو وہ کھڑکی میں کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔ خدا کا شکر ہے اس وقت شگفتہ کے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ اس نے میری یہ حالت دیکھی تو پریشان ہوگئی۔ پہلے اس نے میرے کپڑے تبدیل کرائے اور پھر کہنے لگی۔

”تو نے اتنی دیر کردی میں تو بہت پریشان تھی...... ایک گھنٹہ ہوا تیری امی کا فون آیا تھا میں نے کہہ دیا کہ وہ باتھ روم میں ہے جیسے ہی وہ نکلے گی میں اسے بھیج دوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں تیرے گھر سے کوئی آ نہ جائے۔ چل اب سیدھی گھر پہنچ باقی باتیں کل ہوں گی۔“

جب میں گھر پہنچی تو امی خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ ”کہاں رہ گئی تھی تو......“

”میں آپ کو صبح بتا کر تو گئی تھی کہ میں کالج سے واپسی پر شگفتہ کے گھر چلی جاؤں گی۔“ میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”لیکن تو نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ اتنی دیر ہوجائے...... خیر اب جلدی سے کھانا کھالے اور سونے کی تیاری کر۔“

”میں شگفتہ کے گھر سے کھانا کھا کر آئی ہوں۔“ امی کو یہ کہتے ہوئے میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ساری رات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہی کہ اس نے مجھے بحفاظت اس طوفان سے نکال لیا تھا۔ اس دن کے بعد میں تقریباً ایک ہفتہ کالج بھی نہیں گئی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے بھی اب مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں دن بھر گھر پر ہی رہتی اور امی کے ساتھ گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ ان دنوں شہباز بھائی بھی ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے لہٰذا میں کچھ اور بھی زیادہ خوف زدہ رہتی تھی۔ مجھے اب تک زعفران کی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ میرے بھائی کسی لڑکی کے ساتھ اس طرح کی زیادتی کر سکتے ہیں۔ ایک دن جب میں شہباز بھائی کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی تو ان کی الماری میں سے ان کی پانچ ڈائریاں میرے ہاتھ لگ گئیں۔ ان ڈائریوں میں شہباز بھائی کے گزشتہ پانچ سالوں کا روزنامچہ درج تھا۔

ان ڈائریوں کو لے کر میں اپنے کمرے میں آگئی۔ ایک ہفتہ ان کے مطالعے میں صرف کرنے کے بعد جو حاصل مطالعہ ہوا اس کا خلاصہ آپ کی نذر ہے۔

”شہباز بھائی کو آج چار سال قبل ایک فرزانہ نام کی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنا راز دل فرزانہ کے سامنے عیاں کردیا جس کا جواب فرزانہ نے بھی محبت سے دیا۔ وقت گزرتا رہا اور ان کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ فرزانہ اس دوران کئی مرتبہ شہباز بھائی سے تنہائی میں بھی ملی لیکن شہباز بھائی نے اس تنہائی کا کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے

کی کوشش نہیں کی۔ پھر فرزانہ کے میٹرک کے امتحانات ہوگئے۔ امتحانات کے بعد ان دونوں کے درمیان ملاقات کے مواقع ختم ہوگئے جس کا حل شہباز بھائی نے یہ نکالا کہ انہوں نے ایک موبائل فرزانہ کو لے کر دے دیا۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک ذاکر نامی شخص سے شہباز بھائی کی دوستی ہوگئی۔ شہباز بہت ہی کمینہ شخص تھا۔ وہ فرزانہ سے محبت کرتا تھا اور جب اس نے فرزانہ سے اظہار محبت کیا تو فرزانہ نے اسے بری طرح بے عزت کردیا۔ جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ فرزانہ شہباز بھائی سے محبت کرتی ہے تو اس نے فرزانہ سے اپنی بے عزتی کا بدلا لینے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا۔ شہباز بھائی سے دوستی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ شہباز بھائی ایک سیدھے سادے انسان تھے وہ ذاکر کے ارادوں کو بھانپ نہ پائے اور اسے اپنا پرخلوص دوست سمجھنے لگے۔ وہ اپنی اور فرزانہ کی ہر بات اس سے شیئر کرلیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ شہباز بھائی نے فرزانہ کو فون کرکے ایک رات ایک جگہ پر آنے کو کہا۔ فرزانہ کیوں کہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ تنہائی میں مل چکی تھی اس لیے انہیں ان پر پورا بھروسا تھا اور اس لیے اس نے ہمیشہ کی طرح وہاں آنے کی ہامی بھرلی۔ جس وقت سہباز بھائی فرزانہ سے فون پر بات کر رہے تھے اس وقت ذاکر وہیں موجود تھا۔ اس نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اس کے شاطر ذہن نے لمحے کے لمحے میں ایک منصوبہ تیار کرلیا اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ شہباز بھائی سے اجازت لے کر وہاں سے نکل گیا۔

ذاکر نے گن پوائنٹ پر فرزانہ کی ایک سہیلی کے ذریعے شہباز بھائی کو فون کروایا کہ فرزانہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اس لیے اس کے گھر والے اسے لے کر اسپتال گئے ہوئے ہیں اور اس کا موبائل بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ جانے سے پہلے مجھ سے کہہ گئی تھی کہ میں آپ کو فون کرکے بتا دوں کہ وہ آج آپ سے ملنے کے لیے نہیں آئے گی۔ نتیجے میں شہباز بھائی اس رات مقررہ مقام پر نہیں پہنچے لیکن ذاکر اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اسی طے شدہ جگہ پر پہنچ گیا۔ کیوں کہ فرزانہ کو شہباز بھائی نے وہاں بلایا تھا اس لیے اس کو تو اس جگہ پہنچنا ہی تھا اور جیسے ہی وہ وہاں پہنچی ذاکر اور اس کے ساتھیوں نے اسے اٹھا کر ایک گاڑی میں ڈالا اور ایک ویران جگہ پر لے جا کر اس کی عزت کی دھجیاں اڑادیں۔ فرزانہ کے لیے اس حادثے کے بعد زندہ رہنا ناممکن تھا لہٰذا اس نے خودکشی کرلی۔

فرزانہ کے انتقال کے بعد یہ تمام باتیں طاہرہ نے ان کے سامنے بیان کی تھیں۔ اس کے بعد شہباز بھائی نے ذاکر اور اس کے ساتھیوں کو بہت ڈھونڈا لیکن وہ نجانے کہاں چھپ گئے تھے وہ انہیں نہ مل سکے۔

اصل میں فرزانہ ہی زعفران کی بہن تھی...... اور زعفران اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ میرے بھائی نے اس کی بہن کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے۔

اب تو میری بس ایک ہی دعا ہے کہ خدا کرے میری یہ کہانی زعفران کی نظر سے ضرور گزرے تاکہ اسے پڑھ کر اس کی غلط فہمی دور ہوجائے۔ جو کچھ ہوا اس میں غلطی نہ فرزانہ کی ہے نہ شہباز بھائی کی، نہ طاہرہ کی اور دوسری طرف نہ زعفران کی اور نہ ہی میری۔ سب کا مجرم صرف اور صرف ایک ہی شخص ہے ذاکر۔ میری دعا ہے کہ خدا ایسے برے لوگوں سے اپنی خلق کو محفوظ رکھے جو دوسروں کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔

☆☆

میرا گھر

عالیہ سہیل

عورت تا عمر ایک گھر کی محتاج رہتی ہے۔ کبھی باپ کے تو کبھی بیٹے کے۔ اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا جب وہ اپنی عمر گذشتہ کی پونجی پر نظر ڈالتی ہے تو خود کو تہی دست پاتی ہے۔

عورت کا اپنا گھر کیوں نہیں ہوتا دل دکھانے دینے والی آپ بیتی

عورت تا عمر ایک گھر کی محتاج رہتی ہے۔ کبھی باپ کے، تو کبھی بیٹے کے۔ اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ یہ ہی میرے ساتھ ہوا ہے۔ آج جب عمر گزشتہ کی پونجی پر نظر ڈالتی ہوں تو میں خود کو تہی دست پاتی ہوں۔ اس لیے میں سوال بن کر آپ اور قارئین کے سامنے آئی ہوں کہ میرے اس سوال کا جواب دیا جائے کہ عورت کا اپنا گھر کیوں نہیں ہوتا۔ میری یہ سرگزشت ہر عورت کی سرگزشت ہے، اس لیے اسے ضرور شامل اشاعت کریں۔

بچپن سے ہی یہ سنا اور پڑھا کہ عورت کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ جہاں وہ پیدا ہوتی ہے وہ گھر باپ اور بھائیوں کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ بیاہ کر شوہر کے گھر جاتی ہے تو وہ گھر شوہر کا ہوتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد بیٹوں کے در کی محتاج ہو جاتی ہے۔ میں شروع سے نڈر اور ضدی واقع ہوئی تھی۔ جو بات دل میں سما جائے اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی تھی۔ چنانچہ ایسی باتیں سن کر مجھے بھی ضد چڑھ گئی کہ زندگی میں جب بھی موقع ملا تو اپنا گھر ضرور بناؤں گی جو صرف اور صرف میرا ہوگا، جس پر کوئی اپنا حق جتا نہ پائے گا۔

ہمارا ذاتی مکان ناظم آباد میں تھا، جسے ابا جان نے بڑی محنت اور شوق سے بنایا تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور انہیں جہانگیر روڈ پر سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا۔ ہماری فیملی کل چار افراد پر مشتمل تھی، یعنی امی، ابا، میں اور مجھ سے بڑا بھائی عامر، اس لیے ہمارا گزارہ اس کوارٹر میں با آسانی ہو رہا تھا۔ ابا جان نے وہ مکان کرائے پر دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ذاتی مکان میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میں اور عامر دونوں ہی پڑھائی میں تیز تھے اور ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے۔ ابا جان کا خیال تھا کہ وہ عامر کو انجینئر اور مجھے ڈاکٹر بنائیں گے۔ ان کی باتیں سن کر مجھے بھی ڈاکٹر بننے کا شوق ہو گیا، ویسے بھی اپنا مکان بنانے کے لیے ضروری تھا کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی اچھی جاب کرتی۔ اس لیے میں دل لگا کر پڑھ رہی تھی، تاکہ ابا جان کی خواہش اور اپنی آرزو کی تکمیل با آسانی کر سکوں۔

انسان سوچتا کچھ ہے، لیکن ہوتا وہی ہے جو اس کی تقدیر میں ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ زندگی بہت سکون اور آرام سے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک حادثے نے ہماری زندگی میں بھونچال برپا کر دیا۔ ان دنوں میں سیکنڈ ایئر میں اور عامر انجینئرنگ کے دوسرے سال میں تھا کہ اچانک ایک دن ابا جان سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار بس کی زد میں آ گئے اور انہوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ ان کی لاش جب گھر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ امی کو غشی کے دورے پڑنے لگے اور میں سکتے کے عالم میں اس چارپائی کو دیکھتی رہی، جس پر ابا جان کا بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔ عامر غم و یاس کی تصویر بنا تعزیت کے لیے آنے والوں سے گلے مل رہا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر اتنی بڑی ذمے داری آن پڑی تھی۔ جس کے بارے میں سوچ کر ہی کلیجا منہ کو آتا تھا۔ ابا جان اکلوتے تھے اور ان کا کوئی بہن، بھائی نہ تھا جو اس کڑے وقت میں ہماری مدد کے لیے آگے آتا۔ ننھیال میں ایک ماموں اور دو خالائیں تھیں، لیکن وہ لوگ بھی بس اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھے اور ان کی اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ ہماری تھوڑی بہت مالی مدد کر سکتے۔

ابا جان کے چالیسویں کے بعد سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھے، تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کیا جائے۔ ابا جان کی پنشن سے تو گزارہ نہیں ہو سکتا تھا اور بینک میں موجود جمع پونجی چند مہینوں تک ہی ساتھ دے سکتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ مکان کا تھا۔ قواعد کے مطابق ہم زیادہ سے زیادہ چھ ماہ سرکاری کوارٹر میں رہ سکتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں اسے لازما" خالی کرنا پڑتا۔ گو کہ ذاتی مکان موجود تھا اور ہم اس میں شفٹ ہو سکتے تھے، لیکن ایسی صورت میں ہمیں مکان سے ملنے والے کرائے سے محروم ہونا پڑتا جو ان حالات میں قطعی ناقابل برداشت تھا۔ ماموں نے تجویز پیش کی کہ ابا جان کے پراویڈنٹ فنڈ اور گریجویٹی کی مد میں جو رقم ملے اس سے مکان کی پہلی منزل پر دو کمرے تعمیر کر لیے جائیں اور ہم لوگ وہاں شفٹ ہو جائیں۔ اس طرح گراؤنڈ

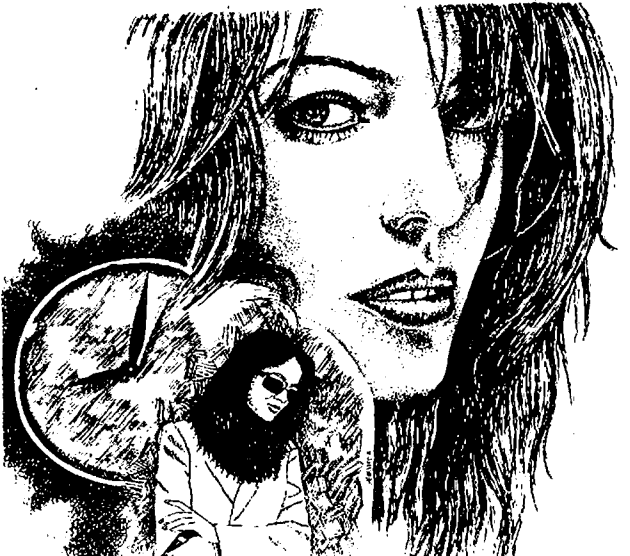

فلور خالی کروانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور ہم کرائے سے بھی محروم نہیں ہوں گے۔ عامر نے اس تجویز کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی، لیکن امی اس کے حق میں نہیں تھیں اور وہ اس رقم کو میری تعلیم اور شادی کے اخراجات کے لیے محفوظ کرنا چاہ رہی تھیں، لیکن جب عامر اور ماموں نے آمدنی اور خرچ کا حساب رکھا تو وہ سناٹے میں آ گئیں۔ مکان کے کرائے سے محرومی کی صورت میں ہمارا واحد ذریعہ آمدنی ابا جان کی پنشن تھی، جس سے ہم بمشکل پندرہ دن اپنا کچن چلا سکتے تھے۔ عامر نے امی کو یقین دلایا کہ میری شادی میں ابھی پانچ چھ سال باقی ہیں۔ اس وقت تک وہ تعلیم مکمل کرکے برسر روزگار ہو چکا ہو گا اور اپنی بہن کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرے گا۔ امی کو مجبوراً یہ تجویز ماننا پڑی۔

میں ان حالات سے بہت دل برداشتہ ہوئی، جس کا اثر میری تعلیم پر بھی پڑا۔ جیسے تیسے امتحان کی تیاری کی، لیکن اتنے نمبر نہ آ سکے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا۔ میں نے آگے پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور سوچا کہ کسی اسکول میں ٹیچر کی جاب کر لوں، تاکہ گھر کے اخراجات پورے ہو سکیں، لیکن عامر اور امی نے ضد کرکے مجھے یونی ورسٹی میں داخلہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے باوجود میں نے کچھ ٹیوشنز کر لیں۔ عامر بھی کالج سے واپس آنے کے بعد ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا۔ اس طرح گھر کی گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

کچھ عرصے بعد حالات نارمل ہوئے، میرے ذہن میں ایک بار پھر اپنے گھر کا تصور انگڑائی لینے لگا۔ اکثر سوچتی کہ جس گھر میں ہم رہ رہے ہیں، یہ ابا جان کی ملکیت تھی۔ ان کے انتقال کے بعد اصولاً تو اس مکان میں ہم دونوں بہن، بھائیوں کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ امی نے بھی باتوں باتوں میں یہ جتا دیا تھا کہ نیچے کا پورشن عامر اور اوپر کا پورشن میری ملکیت ہے۔ اس طرح میں فرسٹ فلور کو ہی اپنا گھر سمجھنے لگی، لیکن اس کی حالت زار دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوتا۔ دو کمروں، ایک باورچی خانہ اور باتھ روم پر مشتمل یہ پورشن نامکمل حالت میں تھا۔ اس کا بیرونی حصہ پلاستر سے محروم تھا جبکہ کھڑکیوں میں شیشے تک نہیں لگے تھے۔ فرنیچر بھی برائے نام تھا۔ ٹی وی اور فریج بہت پرانے ہو چکے تھے، انہیں بدلنے کی ضرورت پیش آ رہی تھی، لیکن ان سب اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، جو ہمارے پاس نہیں تھے۔

اپنے گھر کو مکمل کرنے اور سجانے کا خواب دیکھتے دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ ٹیوشن سے جو پیسے ملتے وہ میرے اپنے اخراجات کے لیے ہی کافی تھے اور یہ بھی غنیمت تھا کہ مجھے اپنی ضرورتوں کے لیے امی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑ رہا تھا۔ یونی ورسٹی کا سیکنڈ ایئر شروع ہوا تو میں نے لڑکیوں کے لیے گروپ ٹیوشن شروع کر دی۔ پہلے دو لڑکیاں مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آتی تھیں، پھر ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے دس تک پہنچ گئی۔ میں نے پانچ پانچ لڑکیوں کے دو گروپ بنائے اور ان کی ایک ایک گھنٹے کی کلاس لینا شروع کر دی۔ یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا اور کیمسٹری پڑھنے کی خواہش مند لڑکیاں آئے دن مجھ سے رجوع کرنے لگیں، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں مزید لڑکیوں کو پڑھانے سے قاصر تھی۔

اس ٹیوشن سے ملنے والی آمدنی کو میں نے اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرنا شروع کر دیا اور ایک سال کے عرصے میں اتنی رقم جمع ہو گئی کہ میں گھر کے بیرونی حصے پر پلاستر اور رنگ و روغن کروا سکتی تھی۔ امی اور عامر نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن مجھ پر تو اپنا گھر مکمل کرنے اور اسے سجانے کی دھن سوار تھی۔ لہٰذا میں نے کسی کی نہ سنی اور کام شروع کروا دیا، جبکہ امی کی شدید خواہش تھی کہ میں ان پیسوں کو کسی مناسب وقت کے لیے سنبھال رکھوں۔ ظاہر ہے کہ مناسب وقت سے مراد میری شادی یا جہیز ہی ہو سکتا تھا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور میں اپنی کمائی گھر کی توسیع اور آرائش پر خرچ کرتی رہی۔ جب بندے کو پیسوں کا چسکا لگ جائے تو اس کی ہوس بڑھتی جاتی ہے اور اس کا ذہن ہر وقت آمدنی میں اضافے کے طریقے سوچتا رہتا ہے۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ یونی ورسٹی کے

تیسرے سال میں آئی تو وہاں کے ماحول اور طریقہ کار سے کافی حد تک روشناس ہو چکی تھی اور یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک دو کلاسیں چھوڑ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا میں بھی ہفتے میں دو تین مرتبہ ایسا ہی کرنے لگی۔ اس طرح مجھے اپنے ٹیوشن پروگرام کے لیے زیادہ وقت مل گیا۔ لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ یونی ورسٹی سے آنے کے بعد کم از کم چار گھنٹے میں انہیں پڑھاتی۔ اس طرح میری آمدنی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔

عامر کی تعلیم مکمل ہوئی تو اس کو ایک فرم میں مناسب ملازمت مل گئی اور اس طرح ہمارے مالی مسائل کافی حد تک حل ہو گئے۔ ہر ماں کی طرح امی کو بھی بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو تھی، لیکن عامر نے صاف کہہ دیا کہ بہن کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد ہی وہ اپنے بارے میں سوچے گا۔ ویسے بھی وہ اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس لیے شادی اس کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی۔ یونی ورسٹی کا تیسرا سال مکمل ہوا تو میرے پاس اتنے پیسے جمع ہو چکے تھے کہ اوپر کی منزل کا بقیہ حصہ تعمیر کروا سکتی، جس میں ایک ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج اور ایک بیڈ روم شامل تھا۔ اس بار امی کے ساتھ ساتھ عامر نے بھی اس کی مخالفت کی۔ ظاہر ہے کہ اس نے بھی یہ ہی سوچا ہو گا کہ میری یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے میں ایک سال باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بعد شادی ہونا تھی اور جہیز کے نام پر ہمارے پاس ایک چھلا بھی نہ تھا۔ یقیناً اس کی خواہش ہو گی کہ ٹیوشن سے ملنے والی اضافی آمدنی کو مکان کی توسیع کے بجائے جہیز کی تیاری میں استعمال کیا جائے، لیکن میں اپنی ضد پر اڑی رہی اور مکان کا کام شروع کروا دیا۔

اس کے بعد تزئین و آرائش کا مرحلہ شروع ہوا۔ میں نے اپنے ذوق کے مطابق پردے، قالین، فرنیچر اور نہ جانے کیا کچھ خرید ڈالا اور جب ان تمام مراحل سے فارغ ہوئی تو یونی ورسٹی کا چوتھا سال بھی ختم ہو چکا تھا اور میں اپنی نظروں میں سرخرو تھی کہ جس مکان کی تعمیر اور تزئین کا خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔ میں فخر سے کہہ سکتی تھی کہ یہ پورشن میری کمائی سے بنا ہے اور اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں۔ میں سچ مچ اسے اپنی ملکیت سمجھ رہی تھی، جو شاید میری زندگی کی سب سے بڑی خوش فہمی یا غلط فہمی تھی۔

ماسٹرز کرنے کے بعد مجھے ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرر کی جاب مل گئی، لیکن میں نے گروپ ٹیوشن کا سلسلہ جاری رکھا۔ گھر کے کام کاج میں امی کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی تھی جو صبح سے شام تک ہمارے ساتھ رہتی۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ امی کی ایک جاننے والی میرے لیے سہیل کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ وہ ان کے دور پرے کے رشتے دار تھے اور کسی پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ کی جاب کرتے تھے۔ ان کے ابا کی اسپیئر پارٹس کی دکان تھی، جبکہ ایک بھائی اور بہن اس وقت پڑھ رہے تھے امی نے اپنے طور پر چھان بین کروائی۔ خالہ اور ماموں سے مشورہ کیا اور رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ شادی چھ ماہ بعد ہونا طے پائی اور دونوں جانب سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنی کل جمع پونجی امی کے حوالے کر دی، تاکہ وہ جہیز کا سامان خریدنا شروع کر دیں۔ سہیل کے گھر والوں نے کہہ دیا تھا کہ جہیز کے نام پر فرنیچر، ٹی وی، فریج اور واشنگ مشین وغیرہ کچھ نہ دیا جائے، کیونکہ وہ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں اور اس میں مزید سامان رکھنے کی گنجائش نہیں۔

شادی دھوم دھام سے تو نہیں البتہ خوش اسلوبی سے انجام پائی گئی۔ سہیل کے گھر والے انتہائی معمولی بری لے کر آئے تھے جسے دیکھ کر ہمارے مہمانوں کو خاصی مایوسی ہوئی جبکہ امی نے میرا جہیز بنانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ امی سے چھان بین میں کمی رہ گئی۔ سہیل اکاؤنٹنٹ نہیں، بلکہ اکاؤنٹس اسسٹنٹ تھے اور ان کی تنخواہ کچھ زیادہ نہیں تھی۔ البتہ سسر کی آمدنی اچھی خاصی تھی، لیکن گھر کے اخراجات میں توازن نہ

تھااور جو آتا وہ خرچ ہوتا۔ میرے حصے میں جو کمرہ آیا' اس میں صرف بیڈ روم سیٹ' الماری اور سنگھار میز کے لیے ہی بمشکل جگہ بن سکی۔ اس کے علاوہ پورے گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک کمرہ ساس' سسر اور دوسرا نند کے قبضے میں تھا' جبکہ میرا دیور کاشف ٹی وی لاؤنج میں سوتا تھا۔

یہ صورت حال میرے لیے خاصی مایوس کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں سہیل کے سامنے ذاتی مکان کا ذکر چھیڑ دیا' جس پر انہوں نے بتایا کہ ابا (سسر) کے نام گلشن اقبال میں دو سو چالیس گز کا پلاٹ تو موجود ہے' لیکن اتنی بچت ہی نہیں ہوتی کہ اس پر مکان بنوایا جاسکے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرض لے کر یہ کام کیا جاسکتا ہے' لیکن سہیل اس پر تیار نہ ہوئے' ان کا کہنا تھا کہ اس محدود آمدنی میں ان کے لیے قرض کی قسطیں ادا کرنا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی اخراجات مثلاً" نقشہ کی تیاری' پانی کا کنکشن اور بنیادوں کی بھرائی کے لیے تو اپنے پاس سے ہی پیسا لگانا پڑتا ہے۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میرے دماغ میں جو دھن سوار ہو جائے اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔ چنانچہ سہیل کی باتوں سے میرے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی اور میں نے ان سے کہا۔ "آپ مجھے صرف ملازمت کرنے کی اجازت دے دیں۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گی۔"

"مجھے تمہارے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں' لیکن سوچ لو یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ قرضہ اتارنے میں بیس سال لگ جائیں گے۔ کل کا کچھ پتا نہیں' تم ملازمت جاری رکھ سکو یا نہیں' پھر یہ قسطیں کس طرح ادا ہوں گی۔"

"ضروری نہیں کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے رہیں۔ یقیناً" کل کو آپ کی ترقی بھی ہوگی یا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو کوئی بہتر جاب مل جائے اور اس کے بعد مجھے ملازمت کی ضرورت نہ رہے۔ ہم کچھ رقم پس انداز کر کے اوپر کی منزل بھی بنوا سکتے ہیں' جس کے کرائے سے قرضے کی قسط ادا ہوتی رہے گی۔" میرا پلان اتنا مکمل اور جامع تھا کہ سہیل کو رضامند ہونا ہی پڑا۔ سسر جی کو بھی میں نے قائل کر لیا' لیکن ساس صاحبہ نے بھرپور مخالفت کی۔ جب میں نے انہیں سمجھایا کہ بیس سال بعد مکانوں کے کرائے کتنے بڑھ جائیں گے' جبکہ اپنا مکان بنانے کی صورت میں ہم نہ صرف کرائے سے بچ جائیں گے' بلکہ بیس سال بعد اس مکان کی مالیت بھی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ میرے سمجھانے بجھانے کا صرف اتنا اثر ہوا کہ ان کی مخالفت میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی' تاہم وہ پوری طرح رضامند بھی نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پہلے بچوں کی شادیوں سے فارغ ہو جائیں' پھر مکان کے بارے میں سوچیں گی' لیکن میری ضد سے مجبور ہو کر انہیں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

میں نے شادی سے پہلے جاب نہیں چھوڑی بلکہ دو ماہ کی چھٹی لی تھی اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ ورنہ مجھے دوبارہ ملازمت کی تلاش میں دھکے کھانا پڑتے۔ چھٹیاں ختم ہوتے ہی میں نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کر لی۔ اب مجھ پر دہری ذمے داری آگئی تھی' صبح اٹھ کر سب کے لیے ناشتا بناتی' پھر خود تیار ہو کر کالج چلی جاتی۔ وہاں سے میری واپسی دو بجے کے قریب ہوتی۔ گھر کے کاموں کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی تھی جو دوپہر کا کھانا بنانے میں ساس صاحبہ کی مدد کرتی۔ البتہ شام کا کھانا بنانے کی ذمے داری میری تھی۔ پہلے دو تین مہینے تو خاصی مصروفیت رہی' پھر جب حالات قابو میں آگئے تو میں نے مکان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ گھر میں تین مرد تھے' لیکن کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اس سلسلے میں میری رہنمائی یا مدد کر سکتا۔ میں نے ایک دو مرتبہ مکان کی تعمیر شروع کرنے کی بات کی' تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ سہیل نے تو صاف کہہ دیا کہ اس کے پاس ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے چکر لگانے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے' جبکہ کاشف کو اپنی پڑھائی اور کرکٹ سے ہی فرصت نہ تھی۔ یہ ہی حال سسر صاحب کا تھا۔ وہ صبح

دس بجے دکان جانے کے لیے گھر سے نکلتے اور ان کی واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی۔ ان لوگوں کے رویوں سے اندازہ ہو گیا کہ سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہوگا۔

میں نے عامر کی معرفت ایک ٹھیکے دار سے رابطہ کیا جو مکان بنانے کے ساتھ ساتھ ہاؤس بلڈنگ کے معاملات بھی دیکھتا تھا' مکان کی تعمیر کا ٹھیکا اسے دے دیا۔ قرضے کے حصول کے لیے پہلی رکاوٹ یہ سامنے آئی کہ قرض کی پہلی قسط بنیاد کی بھرائی کے بعد ملتی تھی' جس پر اس زمانے میں پچیس سے تیس ہزار خرچ ہوتے تھے۔ اتنی بڑی رقم کسی کے پاس نہ تھی۔ اس مرحلے پر میرے قدم بھی ڈگمگانے لگے اور یوں لگا کہ شاید یہ مکان کبھی نہ بن سکے گا' لیکن میں ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ جہیز کا زیور نکال کر سہیل کے حوالے کیا کہ اسے گروی رکھ کر مطلوبہ رقم کا انتظام کریں۔ سہیل سمیت سب گھر والوں نے اس کی مخالفت کی' لیکن میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے ہر حال میں پچیس ہزار روپے چاہئیں' اگر زیور گروی رکھنا نہیں چاہتے تو کسی اور ذریعے سے اس رقم کا انتظام کریں۔ ایک بار پھر ان لوگوں کو میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور سہیل نے زیور گروی رکھ کر پچیس ہزار روپے میرے ہاتھ پر لا کر رکھ دیے۔

قرضے کی منظوری سے لے کر مکان کی تعمیر تک مجھے جو کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا' وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں کالج سے چھٹی کے بعد سیدھی پلاٹ پر چلی جاتی اور وہاں دو تین گھنٹے گزارنے کے بعد گھر واپس آتی۔ اس مرحلے پر سلیم صاحب (ٹھیکے دار) نے میرا بہت ساتھ دیا۔ قرضے کی منظوری سے لے کر میٹریل کی خریداری تک تمام ذمے داری انہوں نے لے رکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مکان کا کام شروع ہو جانے کے بعد سہیل بھی اس میں دلچسپی لیں گے' لیکن ان کی تو دنیا ہی الگ تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد ٹیلی ویژن دیکھنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور کام نہ تھا۔ جب میں بہت زیادہ اصرار کرتی تو چھٹی والے دن میرے ساتھ سائٹ پر چلے جاتے' لیکن کسی کام کی تعریف کرتے' نہ تنقید' بس بے دلی سے ادھر ادھر دیکھتے رہتے۔ تنگ آکر میں نے انہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا اور خود ہی سارے معاملات دیکھنے لگی۔

ان ہی دنوں میں امید سے ہو گئی۔ میری خواہش تھی کہ یہ سلسلہ مکان مکمل ہونے کے بعد شروع ہوتا' لیکن قدرت کے کاموں میں کسے دخل' جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا' بہرحال جیسے تیسے گراؤنڈ فلور مکمل ہوا تو ہم اس میں شفٹ ہو گئے۔ وہ میرے لیے عید کا دن تھا۔ میرا ایک اور خواب پورا ہو گیا تھا۔ اپنے گھر کا خواب جسے میں واقعی اپنا گھر کہہ سکتی تھی' جس کی ایک ایک اینٹ میں میرے خون پسینے کی کمائی شامل تھی۔ کمیٹی کے پیسے ملے تو گھر کو اپنے انداز سے سجایا۔ وال ٹو وال کارپٹ پردے' فرنیچر' سب کچھ اپنی مرضی اور ذوق کے مطابق ترتیب دیا۔ بقیہ گھر والے ہر بات سے لاتعلق رہے۔ سہیل اور سسر جی کبھی کبھی میری لائی ہوئی چیزوں کی تعریف کر دیتے' لیکن ساس کا منہ ہمیشہ بنا رہتا۔ میں جب بھی گھر کے لیے کوئی چیز خریدتی تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرنا شروع کر دیتیں اور انہیں اپنی بیٹی کے جہیز کی فکر ستانے لگتی جو کہ ظاہر ہے کہ میری ذمے داری نہیں تھی۔ سسر جی زندہ تھے اور کما رہے تھے' اگر ساس صاحبہ کو ذرا سا بھی سلیقہ ہوتا تو وہ ان کی کمائی سے ہی کچھ پس انداز کر کے اچھا خاصا جہیز جمع کر سکتی تھیں' مگر وہاں تو پھوہڑپن کی انتہا تھی جو گھر میں آتا وہ سب خرچ ہو جاتا۔

عمیر کی پیدائش کے بعد میری ذمے داری میں اور اضافہ ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ احمد کو پالوں یا جاب کروں۔ سہیل مصر تھے کہ میں گھر بیٹھ جاؤں' لیکن عملاً" یہ ممکن نہیں تھا' وہ جان بوجھ کر حقائق سے نظریں چرا رہے تھے۔ ہاؤس بلڈنگ کے قرض کی قسط شروع ہو چکی تھی اور مکان کی پہلی منزل ابھی نامکمل تھی' ورنہ ہمارا پلان تو یہ ہی تھا کہ اس کے کرائے سے قرض کی قسط ادا ہوتے رہے گی۔ اس لیے میرے پاس ملازمت جاری رکھنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ میں نے گھر میں کام کرنے والی ملازمہ کو اس پر راضی

کرلیا کہ وہ میری غیر موجودگی میں احمد کو سنبھال لے گی۔ اس کے عوض میں نے اس کی تنخواہ میں پانچ سو روپے کا اضافہ کردیا۔ ساس صاحبہ کو یہ بھی پسند نہ آیا اور انہوں نے حسب معمول بڑا واویلا مچایا۔ خلاف معمول اس مرتبہ سہیل نے میری طرف داری کی اور بڑی مشکل سے انہیں سمجھانے میں کامیاب ہوئے۔

فرسٹ فلور کو مکمل کرنے کے لیے پچاس ہزار روپوں کی ضرورت تھی۔ اس زمانے کے پچاس ہزار آج کے پانچ لاکھ کے برابر تو ہوں گے، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام کس طرح ہوگا۔ مجبوراً میں نے ایک بڑی کمیٹی ڈالی اور مکان کا کام شروع کروادیا۔ اب میری ساری تنخواہ قرض کی ادائیگی میں چلی جاتی اور صرف اتنے پیسے بچتے جن سے روزمرہ کی ضروریات بمشکل پوری ہوسکتی تھیں۔ آفرین ہے میرے گھر والوں پر جنہوں نے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا کہ بی بی یہ سب کچھ تم کس طرح کررہی ہو۔ اس کے برعکس مجھ سے ہی توقع کی جاتی کہ گھر کی دوسری ضرورتیں پوری کروں۔ ساس صاحبہ بھی ہر فرمائش مجھ سے ہی کرتیں۔ ”اے بہو! کچن میں بہت گرمی ہوتی ہے۔ تم تو گھر میں ہوتی نہیں ہو۔ اس لیے تمہیں کیا خبر کہ پوری دوپہر ہم لوگوں پر کیا گزرتی ہے۔ تم سے تو اتنا بھی نہیں ہوا کہ کچن میں اگزاسٹ فین ہی لگوا دیتیں۔“

میں مکان بنانے کی مجرم تھی۔ اس لیے تمام جرمانے مجھ کو ہی ادا کرنے پڑرہے تھے۔ اگر بلب فیوز ہوجاتا تو دوسرا بلب لانا بھی میری ہی ذمے داری تھی، اسی طرح گھر میں مرمت کے جتنے بھی چھوٹے موٹے کام ہوتے تو الیکٹریشن، پلمبر وغیرہ کو میں ہی ادائیگی کرتی۔ دو سال سے میں نے اپنے لیے کوئی نیا سوٹ یا چپل نہیں خریدی تھی، لیکن کسی کو احساس نہیں تھا۔ اوروں سے کیا شکایات کرتی، جب اپنے شوہر ہی کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی ہو اور اسے قریب کی چیزیں بھی نظر نہ آرہی ہوں۔ اس اللہ کے بندے کو بھی اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ عید بقرعید پر میرے لیے درجن بھر چوڑیاں ہی لے آتا، وہ تو امی کا دم غنیمت تھا کہ بہانے بہانے میرے اور عمیر کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتیں۔

خدا خدا کرکے پہلی منزل مکمل ہوئی اور اسے کرائے پر اٹھا دیا گیا۔ ایڈوانس میں ملنے والی رقم سے میں نے اپنا زیور بینک سے چھڑوایا اور زندگی ایک ہموار ڈگر پر چلنے لگی۔ قرض اور کمیٹی کی قسط نکالنے کے بعد جو پیسے بچتے وہ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنا شروع کردیے۔ نہ جانے میری چھٹی حس کیوں بار بار بتا رہی تھی کہ آنے والے وقتوں میں مجھے ایک بڑی رقم کی ضرورت پڑسکتی ہے، لیکن میرا سکون عارضی ثابت ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد سسر جی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب گھر کی ساری ذمے داری سہیل پر آگئی۔ گوکہ کاشف کی تعلیم مکمل ہوگئی تھی اور وہ ملازمت تلاش کررہا تھا لیکن اس کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے یہ توقع کرنا مشکل تھا کہ وہ گھر کی ذمہ داری نبھانے میں سہیل کے ساتھ شیئر کرے گا۔ وہ اپنی ذات کا غلام تھا اور اسے کپڑوں، جوتوں، فیشن اور تفریح کے علاوہ کسی بات سے غرض نہ تھی۔ سہیل کا خیال تھا کہ جب تک اسے کوئی معقول ملازمت نہیں مل جاتی وہ ابا جی کی دکان سنبھال لے لیکن اس نے صاف انکار کردیا۔ مجبوراً سہیل کو وہ دکان بیچنا پڑی اور میرے مشورے پر سہیل نے اس سے حاصل ہونے والی رقم بہن کی شادی کے لیے فکسڈ اکاؤنٹ میں جمع کروادی۔

کچھ عرصے بعد امی کا بھی انتقال ہوگیا، اس کے بعد عامر کو باہر جانے کی دھن سوار ہوئی، جبکہ میں چاہتی تھی کہ پہلے اس کی شادی ہوجائے، پھر وہ باہر جانے کے بارے میں سوچے، لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اور کینیڈا امیگریشن کے لیے اپلائی کردیا وہاں جانے کے لیے اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک دن وہ میرے پاس آیا اور ناظم آباد والا مکان جو ابا نے بڑی محنت اور شوق سے بنایا تھا، اسے بیچنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اپنے باپ کی نشانی سے محروم ہونا نہیں

چاہتی تھی، لیکن بھائی کے مستقبل کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ عامر نے وعدہ کیا کہ وہ کینیڈا میں سیٹ ہونے کے بعد جلد از جلد میرے حصے کی ادائیگی کردے گا، جبکہ میرے نزدیک اس رقم کی کوئی اہمیت نہ تھی، اگر عامر ساری عمر اس مکان میں رہتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔

عامر کے جانے کے کچھ عرصے بعد نند کی شادی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس موقع پر ساس کا پھوہڑپن سامنے آیا۔ جہیز کے نام پر ان کے پاس ایک چھلا بھی نہ تھا۔ سہیل کی اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ کچھ بچت کرتے۔ لے دے کر وہی پیسے بینک میں پڑے ہوئے تھے جو سسر جی کی دکان بیچ کر حاصل ہوئے تھے، لیکن اس رقم سے شادی کے اخراجات پورے نہیں ہوسکتے تھے، چنانچہ میں نے محلے والوں اور جان پہچان کے لوگوں کی منت سماجت کرکے ایک بڑی کمیٹی ڈالی۔ سہیل نے کچھ رقم دفتر سے قرض لی، اس طرح جیسے تیسے ہم یہ شادی کرنے کے قابل ہوسکے۔ اس پر بھی ساس صاحبہ کا منہ بنا ہوا تھا۔ انہیں شکوہ تھا کہ جہیز میں ٹی وی، فریج اور واشنگ مشین کیوں نہیں دی گئی، جبکہ ہم اس شادی میں اتنے زیادہ زیربار ہوگئے تھے کہ گھر کا روزمرہ خرچ چلانا بھی مشکل ہورہا تھا۔ ہماری کمائی کا آدھا حصہ قرض کی ادائیگی میں چلا جاتا اور بقیہ پیسوں میں جیسے تیسے پورا مہینہ گزارتے۔

دو سال بعد ہماری زندگی میں تھوڑا سا سکون آیا۔ قرض کی قسطیں ادا ہوچکی تھیں اور اب میری پوری تنخواہ بینک میں جارہی تھی۔ سہیل کا اصرار تھا کہ میں جاب چھوڑ دوں، لیکن میں اس کے لیے تیار نہ تھی۔ عمیر بڑا ہوچکا تھا اور اسکول جانے لگا تھا، پھر ایک دن عجیب واقعہ ہوا، میں خالی پیریڈ میں اسٹاف روم میں بیٹھی اپنی ایک کولیگ سے باتیں کررہی تھی کہ اچانک وہ بولی۔ ”تم اپنی بچت کا کیا کرتی ہو؟“

میں نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کرنا کیا ہے جو تھوڑے بہت پیسے بچتے ہیں وہ بینک میں ڈال دیتی ہوں۔“

”اس سے کیا فائدہ! بینک میں تو رقم بڑھنے کے بجائے گھٹتی جاتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ پیسے کسی جگہ انویسٹ کردو۔“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی، کیونکہ میں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ اس لیے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

”اتنی بڑی رقم نہیں ہے کہ کسی کاروبار میں لگا سکوں، ویسے بھی مجھے ان کاموں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”تم سے کاروبار کرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”انویسٹ منٹ کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ مثلاً ”پرائز بانڈ“، گولڈ اور شیئرز وغیرہ۔“

”مجھے تو معاف ہی رکھو میں ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا چاہتی، میرا ذاتی مکان موجود ہے، گولڈ خریدوں گی تو اس کی حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گا اور شیئرز میں آئے دن اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔“

”ایک بات بتاؤ، یہ مکان تمہارا اپنا ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”مطلب یہ کہ مکان کس کے نام ہے؟“

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا، اس پہلو پر تو میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”مکان تو سسر جی کے نام ہے۔“

”پھر تو یہ مکان تمہارا نہ ہوا، اس میں دیور اور نند کا بھی حصہ ہے۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔ ”اسی لیے کہتی ہوں کہ اپنا کوئی انتظام کرلو۔ آج کل آسان قسطوں پر فلیٹوں کی بکنگ ہورہی ہے، تم بھی ایک فلیٹ بک کروالو، جو صحیح معنوں میں تمہارا اپنا ہو۔“

اس کی باتیں سن کر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ واقعی میں نے مکان بنانے کی دھن میں اس حقیقت کو فراموش کردیا تھا کہ میں نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے تنکا تنکا جمع کرکے جو آشیاں بنایا تھا وہ میرا نہیں، بلکہ سسر جی کی ملکیت تھی اور جس میں ایک نہیں بلکہ تین تین حصے دار تھے اور میں اس مکان کی ایک اینٹ پر بھی اپنی ملکیت کا دعوا نہیں کرسکتی تھی۔

مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ سسر جی پلاٹ پر مکان بنانے کے لیے اپنا زیور گروی رکھا' قرض لیا' کمیٹیاں ڈالیں' مکان کی تعمیر میں دن کا چین اور رات کی نیند حرام کی اور یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ میرا اس مکان میں کوئی حصہ نہیں۔ واقعی حمیرا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ مجھے واقعی اس بارے میں سنجیدگی سے کچھ سوچنا ہوگا۔

میں نے باقاعدگی سے اخبار میں فلیٹوں کے اشتہار دیکھنا شروع کردیے۔ دو تین جگہ ٹیلی فون کرکے ادائیگی کا شیڈول بھی معلوم کرلیا۔ تین کمروں کے اپارٹمنٹ کی بکنگ اور دیگر ابتدائی اخراجات کے لیے کم از کم ایک لاکھ روپوں کی ضرورت تھی' جبکہ میرے اکاؤنٹ میں زیادہ سے زیادہ تیس چالیس ہزار روپے ہوں گے۔ میں نے عامر کو فون کرکے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے میرے حصے کے پیسوں میں سے ایک لاکھ روپے بھیجنے کا وعدہ کرلیا۔ میری یہ مشکل بھی حل ہوگئی' لیکن سہیل سے بات کیے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ وہ کبھی بھی اپنی ماں اور بھائی سے الگ ہونے پر تیار نہ ہوں گے۔

ایک روز رات کے کھانے کے بعد وہ حسب معمول بستر پر نیم دراز ٹیلی وژن کی نشریات سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ میں نے ان کے سامنے فلیٹ کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ یوں ہڑبڑا کر اٹھے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "کیا ضرورت ہے نیا بکھیڑا پالنے کی۔ اچھے خاصے آرام سے تو رہ رہے ہیں اس گھر میں۔۔۔"

"میں نے بے آرامی کی تو بات نہیں کی' لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ مکان ہماری ضرورت کے لیے ناکافی ہوگا۔ کل کو کاشف کی شادی ہوگی' اس کے بچے ہوں گے' عمیر بڑا ہو رہا ہے' اسے بھی ایک الگ کمرہ چاہیے ہوگا۔"

"ابھی سے ان فکروں میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں' جب وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔"

"دیکھیں پراپرٹی کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے' آج جو فلیٹ پانچ لاکھ ہے' کل وہی دس اور بیس کا بھی ہو سکتا ہے' اس وقت ہم کچھ نہیں کرپائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' جو تمہارے جی میں آئے کرو' لیکن مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ میرے پاس دینے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

"میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی' البتہ ایک فیور چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ جب تک فلیٹ کا قبضہ نہ مل جائے' آپ کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کریں گے' نہ امی' نہ کاشف اور نہ کسی اور سے۔۔۔"

"اس میں کیا مصلحت ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"مصلحت کوئی نہیں' بس میں سب لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔"

سہیل کی رضامندی ملنے کے بعد میں نے اپنی مہم کا آغاز کردیا۔ کئی کمپنیوں کی خاک چھاننے کے بعد ایک پروجیکٹ مجھے پسند آیا اور میں نے اس میں تین کمروں کا اپارٹمنٹ بک کروالیا۔ اب ایک نئی ذمے داری شروع ہوگئی۔ ماہانہ قسط کے علاوہ ہر چھ ماہ بعد یک مشت رقم بھی ادا کرنی تھی جو ایک مشکل مرحلہ تھا' لیکن عامر نے میری ہمت بندھائی اور وعدہ کیا کہ وہ ہر چھ مہینے بعد مجھے پیسے بھیجتا رہے گا۔ سہیل اس پورے عمل سے لاتعلق رہے' انہوں نے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ بینک کے لیے پیسے کہاں سے آئے اور یہ کہ بقیہ رقم کی ادائیگی کیسے ہوگی۔ میں ہی اپنی ضرورتوں کا گلا گھونٹ کر فلیٹ کی قسطیں ادا کرتی رہی۔ تین سال تک میں نے اپنے لیے کوئی جوڑا بنایا اور نہ ہی کوئی دوسری چیز خریدی۔ عید' بقرعید کے موقع پر سہیل جو کپڑے بنا دیتے اسی سے گزارہ کرتی رہی' صرف اس امید پر کہ جلد یا بدیر میں بھی اپنے فلیٹ کی مالک بن جاؤں گی۔

کمپنی نے تین سال بعد فلیٹ کا قبضہ دینے کا وعدہ کیا تھا' لیکن اس کام میں چار سال لگ گئے۔ اس دوران ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ کاشف کی شادی کردی گئی۔ ساس صاحبہ نے بڑی چھان پھٹک کے بعد خاندان ہی کی لڑکی تلاش کی اور بڑے چاؤ سے اسے دلہن بنا کر

لے آئیں۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی تھی۔ اس لیے اس کے ناز نخرے بھی کچھ زیادہ تھے۔ کاشف تو بالکل ہی جورو کا غلام بن کر رہ گیا تھا' حالانکہ اس کی اپنی جاب بھی بہت اچھی تھی' لیکن بیوی نے آتے ہی اسے کچھ اس طرح قابو میں کیا کہ وہ اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھا۔ ساس صاحبہ کا بھی یہ ہی حال تھا وہ اپنی چھوٹی بہو پر سو جان سے فدا تھیں' جبکہ وہ انہیں منہ بھی نہ لگاتی۔ البتہ وہ مجھ سے خاصے سلجھے ہوئے انداز میں پیش آتی شاید اس لیے کہ میں نے شروع دن سے ہی اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ قائم رکھا تھا اور وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میں ایک انڈی پینڈنٹ عورت ہوں' کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتی اور نہ ہی اپنے معاملات میں دوسروں کو مداخلت کی اجازت دیتی ہوں۔

شادی کو تین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے کاشف کو الگ گھر لینے پر اکسانا شروع کردیا۔ اس کے لیے یہ مکان بہت چھوٹا تھا' یہاں اس کا دم گھٹتا تھا۔ اس نے خود مجھ سے کہا۔ "دیکھیں نا بھابھی! یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ جائے۔ ہر عورت کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ اپنا گھر ہو جسے میں اپنی مرضی سے سیٹ کرسکوں۔"

"یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ جس طرح چاہو اس کی سیٹنگ کرو۔" میں نے مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔" اس نے تڑخ کر جواب دیا۔ "جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں ہوتیں' اسی طرح ایک چھت کے نیچے دو عورتیں نہیں رہ سکتیں۔ اسی لیے ساس بہو' دیورانی جٹھانی اور نند بھاوج کے جھگڑے ہوتے ہیں اور میں اس طرح کے ماحول میں نہیں رہ سکتی۔"

وہ ایک فیصلہ کرچکی تھی اور اسے سمجھانا بے کار تھا۔ اس لیے میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ کاشف نے اس کا حل یہ نکالا کہ مکان بیچ کر اس کا حصہ دونوں بھائیوں میں تقسیم کردیا جائے۔ جس سے وہ اپنے لیے الگ رہائش کا بندوبست کرسکیں۔ اس کی تجویز سن کر میرا کلیجا حلق میں آگیا۔ اس مکان کو بنانے' سجانے اور سنوارنے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا' اگر میں ہمت نہ کرتی تو شاید ابھی تک خالی پلاٹ ہمارا منہ چڑا رہا ہوتا یا اس گھر کے اللے تللے پورے کرنے میں بک گیا ہوتا۔ یہ مکان میرے لیے اولاد کی مانند تھا اور کوئی ماں اسے بیچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی' لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ مکان میرا نہیں بلکہ سسر جی کی ملکیت تھی اور اب ان کے وارث اسے بیچ کر اپنا حصہ بٹورنے کی فکر تھے۔

سہیل نے بھائی کی فرمائش کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مکان کا سودا ہوگیا۔ ہم اپنے فلیٹ میں شفٹ ہوگئے اور کاشف نے ڈیفنس میں کرائے پر گھر لے لیا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد کمپنی یا بینک سے قرض لے کر اس علاقے میں گھر خرید لے گا۔ سب سے بڑا مسئلہ ساس صاحبہ کا تھا' وہ کاشف کے ساتھ رہنا چاہتی تھیں' جب کہ اس کی بیوی اس کے لیے تیار نہ تھی۔ مجبوراً انہیں ہمارے ساتھ رہنا پڑا۔ یہ میرا تیسرا گھر تھا جو مکمل طور پر میری اپنی کمائی سے خریدا گیا تھا اور اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ میں خوش تھی کہ کئی برسوں کی ریاضت کے بعد ایک ایسے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی جو ہر لحاظ سے میرا اپنا تھا۔ میں ایک بار پھر تن من دھن سے اس گھر کو سجانے اور سنوارنے میں لگ گئی۔ اپنی مرضی کا کچن بنوایا۔ الماریاں' گرل' پردے' فرنیچر' قالین' اے سی غرض ہر وہ چیز جس کی ضرورت محسوس ہوسکتی تھی وہ مہیا کی۔ سہیل حسب معمول ہر معاملے سے لاتعلق رہے' البتہ ایک کارنامہ انہوں نے ضرور سرانجام دیا اور وہ یہ کہ مکان کی فروخت سے جو حصہ ملا وہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے زندگی میں ایسا بے غرض اور بے نیاز شخص نہیں دیکھا جسے دو وقت کی روٹی' دو جوڑے کپڑوں اور ایک بستر کے سوا کسی چیز کی حاجت نہ تھی۔

کچھ عرصے بعد ساس صاحبہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب اس گھر پر میرا مکمل راج تھا۔ ویسے بھی آخری

دنوں میں وہ خاصی چپ چاپ رہنے لگی تھیں۔ کاشف کی جدائی کا صدمہ انہیں اندر ہی اندر مار رہا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ ان سے ملنے آجاتا، پھر آہستہ آہستہ یہ وقفہ طویل ہوتا گیا اور کئی کئی دن تک اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سہیل نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی تھی۔ ہم لوگ دو تین مرتبہ انہیں ساتھ لے کر کاشف سے ملنے گئے، لیکن اس کی بیوی کی بے رخی دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی، پھر انہوں نے کاشف کا نام لینا بھی چھوڑ دیا اور ایک دن خاموشی سے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

یہ میری زندگی کا سنہرا دور تھا۔ عمیر تیزی سے تعلیمی مدارج طے کر رہا تھا۔ میں اپنے ذاتی گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ عامر نے کینیڈا میں ہی کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ وہ ہر سال وطن آنے کا پروگرام بناتا لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آجاتی۔ سہیل ریٹائر ہوئے تو انہوں نے مجھ پر ملازمت چھوڑنے کے لیے زور ڈالنا شروع کر دیا۔ میں بھی بہت تھک چکی تھی۔ ساری عمر کی مشقت کے بعد آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ سہیل کا ساتھ دینے کے لیے میں بھی گھر بیٹھ گئی۔ ویسے بھی بینک میں کافی رقم موجود تھی اور چند ماہ بعد عمیر کی تعلیم مکمل ہو جاتی۔ وہ جاب پر لگ جاتا تو ہم بقیہ زندگی آرام سے گزار سکتے تھے۔

میں اور سہیل سارا دن باتیں کرتے گزار دیتے۔ وہ ہمیشہ کے آرام طلب تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد تو ان کی لاٹری نکل آئی تھی۔ دن بھر اخبار پڑھتے، ٹی وی دیکھتے یا بار بار مجھ سے چائے کی فرمائش کرتے۔ عمیر انہیں گھر پر بیٹھا دیکھ کر چڑ جاتا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ پاپا ابھی ینگ ہیں، انہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔ سہیل ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے اڑا دیتے۔ کاشف سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میں کبھی کبھار اس کے گھر فون کرتی تو جواب میں اس کی بیوی انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کرتی۔ جب سے سہیل ریٹائر ہوئے تھے اور میں نے ملازمت چھوڑی تھی۔ اسے یہ ہی ڈر لگا رہتا کہ کہیں ہم کاشف سے کچھ مانگ نہ لیں، جبکہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ ہمیں ان کی مدد کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

عمیر کو ہم نے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا، اس کی ہر فرمائش اور ہر ضرورت بغیر کہے پوری کی تھی، جس کے نتیجے میں وہ تھوڑا سا خود سر اور ضدی ہوتا جا رہا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں تیز تھا اور ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا۔ جب اس کے ٹیچرز اور دوست احباب اس کی قابلیت کی تعریف کرتے تو اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دوڑ جاتی، جس میں احساس تفاخر نمایاں ہوتا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس میں خود سری اور ضدی پن کے ساتھ ساتھ ہٹ دھرمی کے جراثیم بھی پروان چڑھ رہے تھے۔ وہ دوسروں کی رائے کو رد کرنے اور اپنی بات منوانے پر اصرار کرتا اور اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ اپنے علاوہ سب کو جاہل سمجھتا ہے۔ شروع شروع میں تو ہم نے کوئی توجہ نہیں دی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ ہمارے لیے پریشانی کا سبب بننے لگا۔ سہیل تو ویسے بھی کسی معاملے میں نہیں بولتے تھے۔ اس لیے انہیں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن میں ماں تھی اور عمیر کی ذات کے اچھے برے پہلوؤں پر نظر رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا، لیکن یوں لگا کہ شاید مجھ سے کچھ کوتاہی ہو گئی اور جب ہوش آیا تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

میں کوشش کرتی کہ ہر معاملے میں اس کی پسند نا پسند کا خیال رکھوں، لیکن کبھی نہ کبھی اونچ نیچ ہو ہی جاتی تھی۔ ایک دن میں نے سہیل کی فرمائش پر پسندوں کا سالن بنایا۔ انہوں نے دل کھول کر میرے بنائے ہوئے کھانے کی تعریف کی، لیکن جب میں نے وہی سالن عمیر کے سامنے رکھا تو اس نے گائے کے گوشت کے نقصانات پر ایک لمبا چوڑا لیکچر جھاڑ دیا۔

"آپ لوگ اپنی عمر دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ یہ کھانا آپ کی صحت کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔"

"کیوں بھئی اس کھانے میں کیا برائی ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"خدا کی پناہ! مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ اس کھانے میں کیا برائی ہے؟ گائے کا گوشت، لال مرچیں، ہارٹ اٹیک کا پورا سامان موجود ہے اس کھانے میں۔"

"ساری عمر اس گھر میں گائے کا گوشت ہی پکا ہے، آج تک تو کسی کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا۔"

"آپ لوگوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "جو جی میں آئے کھائیں، لیکن مجھ پر رحم کریں۔ میں اس طرح کے مرغن کھانے نہیں کھا سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ کھانے کی میز سے اٹھا اور پیر پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ میرے لیے عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ سہیل کو چٹ پٹے اور مرغن کھانے کا شوق جبکہ عمیر کے خیال میں گائے اور بکرے کا گوشت صحت کے لیے انتہائی مضر تھا۔ ظاہر ہے کہ میں روزانہ چکن تو نہیں بنا سکتی تھی، لیکن یہاں بھی ہمیں ہی سمجھوتا کرنا پڑا۔ سہیل کے سمجھانے پر میں نے گائے کا گوشت پکانا چھوڑ دیا، لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، وہ ہر معاملے میں بے تکا بولتا اور پھر اپنی بات پر اڑ جاتا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکی ہوں کہ سہیل کو ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق تھا، وہ فارغ تھے اور اپنا سارا وقت ٹی وی دیکھنے میں ہی گزار دیتے۔ ایک دن ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی تھی، اس میں ایک قابل اعتراض قسم کا گانا آیا تو سہیل نے فوراً ہی ریموٹ کے ذریعے ٹی وی بند کر دیا، لیکن اس وقت تک عمیر کی نظر اس گانے پر پڑ چکی تھی۔ اس نے باپ کے مرتبے کا بھی خیال نہ کیا اور اپنا لیکچر شروع کر دیا۔

"شرم نہیں آتی آپ کو اس عمر میں ایسی واہیات فلمیں دیکھتے ہوئے۔ اگر کوئی باہر کا آدمی دیکھ لے تو کیا سوچے گا۔"

سہیل خاموشی کی زبان میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس موقع پر بھی اپنے ردعمل کا اظہار اسی زبان میں کیا اور کچھ کہے بغیر منہ لپیٹ کر لیٹ گئے، لیکن مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "شرم تو تمہیں آنی چاہیے کہ اپنے ماں باپ سے اس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ اب تم ہمیں اچھے برے کی تمیز کرنا سکھاؤ گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہی ہے کہ ہمیں کوئی سبق پڑھانے سے پہلے اپنے انداز گفتگو کو بہتر بنانے کی کوشش کرو۔"

عمیر کو شاید میری جانب سے اس ردعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر حیرت کے عالم میں کھڑا مجھے دیکھتا رہا، پھر مزید کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔ عمیر کا رویہ آگے چل کر ہمارے لیے مشکلات کا سبب بن سکتا تھا۔ اسے کنٹرول کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا اور شاید یہ ہی وجہ تھی کہ میں اسے ٹوکنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر آئندہ بھی اس نے حد سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اسی وقت اسے حفظ مراتب کا احساس دلا دوں گی۔

اس کے بعد آئے دن ایسے واقعات رونما ہونے لگے جو میرے اور عمیر کے درمیان تلخی بڑھانے کا سبب بن سکتے تھے۔ سہیل نے تو بالکل ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے عمیر بھی ان کے منہ لگتے ہوئے ڈرتا تھا۔ البتہ مجھ سے آئے دن اس کی جھڑپیں ہونے لگیں۔ میں ماں تھی اور اپنے حقوق و فرائض کے حوالے سے اسے ڈیل کرنا چاہتی تھی، جب کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگا تھا اور میری کہی ہوئی ہر بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ سہیل کا خیال تھا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، اس لیے عمیر کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ سہیل کا مشورہ صائب تھا، لیکن میں بھی اپنی عادت سے مجبور تھی گو کہ اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی جس سے کشیدگی پیدا ہو سکتی تھی

عمیر کو جاب ملی تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا اور وہ اپنے آپ کو کسی سلطنت کا شہزادہ سمجھنے لگا، لیکن بعض معاملات میں اس کی سعادت مندی مجھے حیران کر دیتی تھی۔ مثلاً "اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس

نے چیک میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا۔ ”یہ رکھ لیں اور مجھے ہمیشہ کی طرح میرا جیب خرچ دے دیں۔“

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہہ نکلی۔ عمیر کے کہے ہوئے الفاظ میری سماعت کے لیے اجنبی تھے۔ میں نے پیار سے اس کی پیشانی چومی اور چیک اسے واپس کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ تمہاری محنت کی کمائی ہے اور اس پر تمہارا حق ہے۔ ویسے بھی یہ پیسے تمہارے پاس رہیں یا میرے پاس' ایک ہی بات ہے۔“

عمیر نے کچھ پس و پیش کے بعد وہ چیک رکھ لیا' لیکن دوسرے دن اس نے ہمارے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی۔ گو کہ ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی' لیکن میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور دل کھول کر اس کی لائی ہوئی چیزوں کی تعریف کی۔ دوسری تنخواہ ملی تو عمیر نے پورے گھر کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کا پروگرام بنایا۔ رنگ و روغن' فرنیچر' قالین اور پردے وغیرہ سب تبدیل کر دیے۔ میری لائی ہوئی سب چیزیں کباڑیے کو دے دیں اور مجھ سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر چیزیں بالکل نئی اور اچھی حالت میں تھیں' اگر انہیں مناسب طریقے سے فروخت کیا جاتا تو اچھے خاصے پیسے مل جاتے' لیکن میں نے اس موقع پر بھی کوئی مداخلت نہیں کی اور خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔

بہت جلد عمیر نے پورے گھر پر اپنی حکمرانی قائم کر لی اور ہم دونوں میاں بیوی کو عضو معطل بنا کر رکھ دیا۔

اب ہماری حیثیت گھر میں پڑے کاٹھ کباڑ جیسی ہو گئی تھی۔ اس کی خودسری اور بدمزاجی بڑھتی جا رہی تھی ہر بات میں کیڑے نکالنا' تنقید کرنا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنگامہ کرنا روز کا معمول بن گیا تھا۔ میں اور سہیل دل ہی دل میں کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی سہیل کو اس کی بدتمیزی پر غصہ آتا تو میں انہیں روک دیتی' کیونکہ عمیر تمام حدیں پار کر چکا تھا اور اس سے الجھنا محض اپنی بے عزتی کروانے کے مترادف تھا۔

ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس روز میری طبیعت خراب تھی۔ بستر سے اٹھنے کی بالکل ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سہیل نے چائے بنائی۔ دوپہر کا کھانا بھی بازار سے لے آئے۔ شام تک طبیعت بہتر ہوئی تو میں نے کچن کا رخ کیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ عمیر کے لیے کھانے میں کیا بناؤں۔ فریج میں انڈے رکھے تھے۔ میں نے وہی نکالے اور انڈوں کا سالن بنا لیا۔ چپاتیاں بازار سے منگوا لیں۔ عمیر گھر آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے یہ کھانا رکھا۔ جانتی تھی کہ اسے انڈوں کا سالن پسند نہیں آئے گا اور وہی ہوا۔ عمیر نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا اور سالن پر نظر پڑتے ہی اس کا منہ بن گیا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے اس طرح کی فضول چیزیں پسند نہیں' اس کے باوجود آپ نے یہ سالن بنا لیا۔“

”عمیر! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے کھانا بنایا ہے۔“

”یہ احسان کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ بازار سے کھانا منگوا لیا ہوتا۔“ وہ تڑخ کر بولا۔

”ماں سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔“ سہیل کو بھی غصہ آگیا۔ ”اگر یہ کھانا پسند نہیں تو بازار سے لے آؤ' لیکن اس طرح بدتمیزی سے پیش آنا ٹھیک نہیں۔“

”براہ کرام آپ تو خاموش ہی رہیں۔ یہ میرا اور مما کا معاملہ ہے اور جو کام میری مرضی کے خلاف ہو گا اس پر تو ضرور بولوں گا۔“

سہیل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ عمیر پر ہاتھ اٹھا دیں گے' لیکن انہوں نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عمیر کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا' پھر وہ بھی پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے سہیل بالکل گم صم رہنے

لگے۔ انہوں نے چپ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ عمیر سے تو وہ یوں لاتعلق ہو گئے جیسے اس سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہو' مجھ سے بھی انتہائی ضرورت کے تحت ہی بات کرتے' ورنہ سارا دن کمرے میں لیٹے ٹی وی دیکھتے یا اخبار رسالہ پڑھتے رہتے۔ میرے لیے ان کی یہ روش بے حد پریشان کن تھی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لگتا تھا کہ انہیں عمیر کے رویے سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔ میں اس سے بھی کہا کہ وہ باپ سے اس دن کے واقعے پر معذرت کر لے' لیکن اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑا دیا اور بولا۔ ”مما! آپ تو یوں ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ بابا کے پاس کوئی کام دھندا تو ہے نہیں۔ آپ ہی بتائیں کہ بے کار آدمی ٹی وی دیکھنے یا رسالے پڑھنے کے علاوہ کیا کر سکتا ہے۔“

سہیل اندر ہی اندر گھلتے چلے گئے اور ایک دن بالکل ہی بستر سے لگ گئے۔ انہیں گٹھیا ہو گیا تھا۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن سب ہی نے یہی کہا کہ اس مرض کا علاج دواؤں سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جسم کو زیادہ سے حرکت میں رکھا جائے' لیکن سہیل کے لیے تو باتھ روم تک جانا مشکل ہو گیا تھا۔ عمیر اس موقع پر بھی طنز کرنے سے باز نہ آیا اور بولا کہ حد سے زیادہ آرام طلبی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین دور تھا مجھے چوبیس گھنٹے سہیل کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی' کسی دوسرے کام کے لیے میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ چنانچہ گھر کے کاموں کے لیے ایک ملازمہ رکھی گئی۔ اس پر بھی عمیر نے خوب ہنگامہ کیا۔ کبھی وہ ملازمہ کے کپڑوں پر اعتراض کرتا' تو کبھی اس کے بنائے ہوئے کھانوں پر' وہ اس کے کمرے کی صفائی کرتی تو اس میں دس کیڑے نکالتا۔ تنگ آکر ملازمہ نے اس کا کمرہ ہی صاف کرنا چھوڑ دیا۔ عمیر کے رویے اور سہیل کی بیماری کے سبب میری پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی' لیکن میری مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔

چھ مہینے اسی طرح گزر گئے اور ایک روز سہیل مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک جوان جہان اور کماؤ پوت کے ہوتے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو تنہا تصور کر رہی تھی' کیونکہ وہ میرا نہیں' بلکہ اپنی ذات کا اسیر تھا۔ سہیل کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ واقعی اس دنیا میں ماں باپ کے بعد عورت کا سب سے مضبوط سہارا اس کا شوہر ہی ہوتا ہے' جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات' خوشی اور غم شیئر کر سکتی ہے۔ میں بے سہارا ہو گئی تھی۔ میرے سر سے سایہ ہٹ گیا تھا اور میں کھلے آسمان تلے موسم کی سختیوں کو برداشت کرنے کے لیے کھڑی تھی۔

میرا خیال تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد عمیر کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی اور وہ میرا تھوڑا بہت خیال رکھے گا' لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ سہیل کے مرنے کے بعد میں عمیر کے ٹکڑوں کی محتاج ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی مجھے ماں نہیں بلکہ خادمہ سمجھنے لگا۔ اس نے یہ کہہ کر ملازمہ کی چھٹی کر دی کہ وہ ٹھیک سے کام نہیں کرتی اور یہ کہ اس کی کمائی حرام کی نہیں جو یوں مفت خوروں پر لٹائی جائے۔ اب گھر کا سارا کام مجھ کو کرنا پڑتا تھا' لیکن میں اس پر بھی خوش تھی اور چاہتی تھی کہ عمیر مجھ سے تمیز سے پیش آئے۔

ایک دن مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اگر عمیر کی شادی کر دی جائے تو شاید اس کے رویے میں بہتری آجائے۔ بہو کے گھر میں آجانے سے میرا بوجھ بھی کم ہو گا' کم از کم وہ عمیر کا سارا کام سنبھال لے گی' لیکن اسی شام جب میں نے عمیر کے سامنے یہ تذکرہ کیا تو اس نے جواب میں میرے سر پر بم کا گولہ دے مارا۔

”آپ کو اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' میں نے لڑکی پسند کر لی ہے اور ہم عنقریب شادی کرنے والے ہیں۔“

اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر قفل لگ گیا اور میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ لڑکی کون ہے' کیا کرتی ہے' کس خاندان سے تعلق ہے' وغیرہ وغیرہ۔ کچھ پوچھنے کی گنجائش ہی نہ تھی' ہر ماں کی یہ خواہش

ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے چاند سی دلہن تلاش کرے' لیکن عمیر نے تو مجھ سے یہ آخری حق بھی چھین لیا تھا۔ میں اپنا دل مسوس کر رہ گئی اور ذہنی طور پر خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگی۔

دو ہفتے بعد عمیر مجھے لڑکی والوں کے گھر لے گیا تاکہ ان سے رسمی طور پر رشتے کی بات کر سکوں۔ میں جانا تو نہیں چاہ رہی تھی' لیکن بیٹے کی خوشی کی خاطر چلی گئی۔ ویسے بھی اب میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی اور اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لوگ ڈیفنس میں رہتے تھے۔ خاصا بڑا گھر تھا اور اس کے چپے چپے سے ان کی امارات اور شان و شوکت ٹپک رہی تھی۔ لڑکی بھی شکل و صورت کی اچھی تھی' لیکن مجھے کچھ مغرور اور اکھڑ سی لگی' البتہ اس کے والدین اور گھر کے دیگر افراد اخلاق سے پیش آئے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ عمیر کا اس گھر میں کافی عرصے سے آنا جانا ہے اور میری آمد محض ایک رسمی کارروائی ہے۔ سب معاملات پہلے ہی طے پا چکے تھے۔ اب صرف تاریخ رکھنی تھی۔ اس کا فیصلہ بھی ان لوگوں نے خود ہی کر دیا اور میں حیرت کے عالم میں سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔

شادی کی تیاری شروع ہو گئی' لیکن عمیر نے مجھے کسی کام میں شریک نہیں کیا۔ شادی کی ساری شاپنگ اس لڑکی نمو نے خود ہی کی۔ میں لاتعلق بنی یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ ایک دو بار دبی زبان سے کچھ کہنا چاہا تو عمیر نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ اس عمر میں کہاں دھکے کھاتی پھریں گی۔ اچھا ہے کہ نمو اپنی مرضی سے شاپنگ کر رہی ہے' کیونکہ کل کو یہ ساری چیزیں اسی کو استعمال کرنی ہیں۔ جی میں آیا کہہ دوں کہ خدا کرے نمو کو بھی یہ وقت دیکھنا نہ پڑے۔ ماں کے دل سے پوچھو کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بیٹے کی شادی میں اپنی پسند سے ایک جوڑا یا زیور کے نام پر ایک چھلا بھی نہیں خرید سکتی' لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ جانتی تھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس کے جواب میں عمیر مجھے دس باتیں اور سنا دے گا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور میں نے اس میں ایک مہمان کی طرح شرکت کی۔ نمو رخصت ہو کر اس چھوٹے سے فلیٹ میں چلی تو آئی لیکن اس کا دل یہاں بالکل بھی نہ لگا' وہ دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتی اور شام کو عمیر کے ساتھ گھومنے نکل جاتی' پھر ان کی واپسی رات بارہ ایک بجے سے پہلے نہ ہوتی۔ وہ جب سے بیاہ کر آئی تھی اس نے مجھ سے ایک دفعہ بھی ڈھنگ سے بات نہیں کی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے ساس نہیں بلکہ ایک ملازمہ سمجھتی ہے۔ عمیر کا رویہ بھی شادی کے بعد اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ کئی کئی دن میرے پاس نہ آتا اور نہ ہی ڈھنگ سے کوئی بات کرتا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ کچھ پریشان بھی رہنے لگا اور پھر ایک روز اس پریشانی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔

اس رات میں پانی پینے کے ارادے سے اٹھی تو مجھے عمیر کے کمرے سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ویسے تو کسی کی باتیں سننا کوئی ٹھیک نہیں' لیکن غیر ارادی طور پر میں دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ میرے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔ عمیر کہہ رہا تھا۔ "یقین جانو ہمارے ملک میں کوئی اچھا اولڈ ہوم ہوتا تو میں انہیں وہاں داخل کروا دیتا' لیکن کیا کروں مجبوری ہے جب تک زندہ ہیں انہیں برداشت کرنا ہو گا۔"

"میں انہیں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔" نمو چلاتے ہوئے بولی۔ "ان ہی کی وجہ سے ہمیں اس کھولی نما فلیٹ میں رہنا پڑ رہا ہے' ورنہ ہم بھی کسی پوش علاقے میں ایک اچھا سا اپارٹمنٹ لے سکتے تھے۔ میں کہتی ہوں کہ تم ان سے یہ فلیٹ بیچنے کی بات کیوں نہیں کرتے۔ میں ڈیڈی سے کچھ پیسے ادھار لے لوں گی' اس طرح ہم اپنی مرضی کا اپارٹمنٹ خرید سکیں گے۔"

"وہ کبھی نہیں مانیں گی۔" عمیر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اس فلیٹ سے ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ انہوں نے پائی پائی جوڑ کر یہ گھر بنایا ہے۔ وہ کسی

قیمت پر بھی اسے بیچنے پر تیار نہیں ہوں گی۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اپنی اماں کو کولہے سے لگے بیٹھے رہو۔ میں ڈیڈی کے پاس جا رہی ہوں۔ جب تمہیں عقل آ جائے تو مجھے لینے آ جانا۔"

"جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنا ٹھیک نہیں۔ کچھ دن انتظار کر لو میں انہیں فلیٹ بیچنے پر راضی کر لوں گا۔"

"اس سے بھی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے' وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی نا۔" نمو بے زاری سے بولی۔

"ظاہر ہے' میں انہیں سڑک پر تو نہیں پھینک سکتا۔" عمیر نے بھی ترخ کر جواب دیا۔

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے تک آئی اور بستر پر لیٹ کر سوچ کر سمندر میں کھو گئی۔ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک پل میرے ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کی مانند چل رہا تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی آرزو بھی دل میں انگڑائیاں لیتی رہی اور اس آرزو کی تکمیل کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے' وہ سب پہلے ہی بیان کر چکی ہوں' لیکن اس آبلہ پائی کا ثمر کیا ملا۔ میں آج بھی بے گھر تھی۔ پہلے باپ کے گھر کو سجایا' سنوارا تو وہ بھائی کی خواہشات کی بھینٹ چڑھ گیا' پھر سسرال جا کر اپنے خون پسینے کی کمائی سے مکان بنایا تو اس کے بھی حصے بخرے ہو گئے اور اب بیٹا اس گھر کو بھی ٹھکانے لگانا چاہ رہا ہے جو سو فیصدی میرا اپنا ہے اور جس میں کسی کا کوئی شیئر نہیں' یہ کیسا دستور ہے کہ میں اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر رہ گئی ہوں۔ کیا واقعی عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا اور وہ اپنی شناخت کے لیے باپ' بھائی' شوہر اور بیٹے کا سہارا لینے پر مجبور ہے' اسی طرح اسے اپنی ملکیت پر بھی اختیار نہیں۔ حالات کی بے رحم آندھی اسے کسی وقت بھی دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر سکتی ہے۔

فجر کی اذان ہونے تک میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ نماز پڑھی' پھر اپنے لیے ناشتا بنایا' اس کے بعد تیار ہو کر گھر سے نکل پڑی۔ وکیل ہمدانی سے سہیل کے اچھے تعلقات تھے اور وہ کئی بار ہمارے گھر آ چکے تھے۔ ان کے کورٹ جانے میں ابھی وقت تھا۔ لہٰذا میں نے ان سے گھر پر ہی ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مجھے اتنے سویرے دیکھ کر حیران تو ضرور ہوئے لیکن جب میں نے انہیں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو فوراً ہی گھر میں بنے ہوئے دفتر میں لے گئے۔ میں نے اپنے فلیٹ کی فائل ان کے حوالے کی اور کچھ کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد وہاں سے چلی آئی۔ ان کے پاس میرا موبائل نمبر تھا اور وہ ضرورت پڑنے پر مجھ سے رابطہ کر سکتے تھے۔

باہر آ کر میں نے عمیر کو فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر پریشان ہو گیا اور بولا۔ "مما آپ صبح صبح کہاں چلی گئیں' اگر کوئی کام تھا تو مجھے بتا دیتیں۔"

"اگر تمہیں بتا دیتی تو شاید وہ کام آج نہ ہو پاتا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میری بات غور سے سنو۔ میں نے گزشتہ شب تم دونوں میاں' بیوی کی باتیں سن لی ہیں اور اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک دن بھی تم لوگوں کے ساتھ رہ سکوں۔ لہٰذا مجھے تمہاری زندگی سے نکلنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نے فلیٹ تمہارے نام کر دیا ہے۔ وکیل ہمدانی ایک دو روز میں کاغذات پہنچا دیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب میرا ذہن ہر قسم کے تفکرات سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ کر اپنی نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ پندرہ بیس منٹ کا سفر پلک جھپکنے میں گزر گیا۔ میں ٹیکسی سے اتری۔ کرایہ دیا اور اس عمارت کی جانب چل دی' جس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ "اپنا گھر۔"

قاتل شادیانے

جاوید راہی

حسد ایک بری صفت ہے. حاسد شخص ہمیشہ دوسروں کی خوشی اور آرام و سکون کو دیکھ کر رنج اور دکھ میں مبتلا رہتا ہے. کسی اور شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے اور اس سے نعمت چھن جانے کی آرزو کرتا ہے. ایک ایسی لڑکی کی سفاکیت کہ جو اپنی ہی بہن کی قاتل بن گئی.

حسد و نفرت کی آگ میں مبتلا ایک لڑکی کا ماجرا

حسن علی صاحب اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو جبار صاحب ان کے احترام میں کھڑے ہوئے۔ ان کی دیکھا دیکھی شارب بھی کھڑا ہوگیا۔ حسن علی، جن کا پورا نام حسن علی غوری تھا، نے گہری نظروں سے شارب کو دیکھا پھر صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”تشریف رکھیے“ اور خود بھی ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

”یہ شارب حسین ہیں۔ جن کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔“ جبار صاحب نے کہا۔

”جی۔ کتنی تعلیم ہے آپ کی۔“

”اکنامکس میں ایم اے کر رہا ہوں۔“

حسن علی نے اس سے دوسرے چند سوالات کیے پھر بولے۔ ”شکریہ شارب! جبار صاحب آپ کو اطلاع کر دیں گے۔“ شارب سلام کر کے باہر نکلنے لگا تو جبار صاحب بولے۔

”ٹھیک ہے سر، میں چلتا ہوں۔“

”نہیں آپ شارب صاحب کو باہر پہنچا کر واپس آجائیے۔ آپ کے پاس کنوینس ہے شارب۔“

”جی سر۔ شکریہ۔“ شارب نے کہا اور جبار صاحب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جبار صاحب شارب کو خدا حافظ کہہ کر واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ غوری صاحب متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔

”لڑکا اپنے آداب و اطوار سے شریف لگتا ہے جبار صاحب، لیکن میری الجھنیں آپ جانتے ہیں۔ نصرت جہاں کے انتقال کے بعد جو ذمے داری میرے شانوں پر آ پڑی تھی میں نے احسن طریقے سے اسے سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ دونوں بچیاں کبھی حد سے آگے نہیں بڑھیں۔ میں نے انہیں دنیا سے پیچھے بھی نہیں رہنے دیا نہ وہ بے قابو ہوئیں۔ شارب نوجوان اور خوش شکل ہے اور پھر نئے زمانے کا نوجوان ہے۔ آپ سوچ لیجیے۔“

”آپ کا نمک خوار ہوں صاحب۔ اگر شارب قابل اعتماد نہ ہوتا تو کبھی اس دروازے سے اندر نہ

لاتا۔" جبار صاحب نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں دونوں بی اے کرلیں تو ان کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"جی یقیناً۔"

"میں اسے پورے اعتماد سے لایا ہوں۔" جبار صاحب نے کہا۔ تو غوری صاحب مسکرا دیے۔

"ٹھیک ہے ہمیں آپ پر اعتماد ہے۔" وہ بولے۔ "کل سے اسے بھیج دیجیے۔ اعزازیہ آپ خود طے کرلیجیے۔"

☆☆☆

غوری صاحب کی تشویش بجا تھی۔ دو جوان بیٹیوں کے باپ تھے۔ بڑی کا نام گوہر تھا چھوٹی نائلہ تھی جو گوہر سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں۔ گوہر میٹرک میں دو بار فیل ہو چکی تھی جبکہ نائلہ کبھی فیل نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح دو سال بڑی ہونے کے باوجود دونوں نے ایک ساتھ میں میٹرک پاس کرکے فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ غوری صاحب کی بیگم نصرت جہاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں نوکر چاکر بہت سے تھے لیکن گھر کا سارا نظام عائشہ پھوپھی چلاتی تھیں جو سگی پھوپھی نہیں تھیں لیکن غوری صاحب انہیں سگی مانتے تھے اور بچیاں بھی انہیں ماں کا درجہ دیتی تھیں۔

غوری صاحب بے حد دولت مند بزنس مین تھے۔ بہترین کاروبار، کروڑوں کی جائیدادیں، دولت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا لیکن سب سے بڑی دولت، یعنی بیٹے سے محروم تھے جس کا انہیں بے حد دکھ تھا۔

"شجر بے سایہ ہوں جبار صاحب کبھی کبھی تو اتنی ساری دولت دیکھ کر بری طرح غم زدہ ہو جاتا ہوں۔ کس کے لیے کر رہا ہوں یہ سب کچھ، میرے بعد اسے کون سنبھالے گا۔"

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بیٹیاں دی ہیں۔ دو رحمتیں نازل ہوئی ہیں آپ پر۔"

"بیٹیاں اپنے گھر چلی جاتی ہیں اور میں گھر داماد رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ بڑے بڑے اچھے دیکھے ہیں میں نے۔"

"آپ نے خود ہی داماد کا نام لے دیا۔ ٹھیک ہے آپ کسی کو گھر داماد نہ رکھیں لیکن کاروبار کی ذمے داری تو دے سکتے ہیں۔"

"کہاں کی باتیں کر رہے ہیں جبار صاحب۔ کاروبار سنبھالنا کوئی آسان بات ہوتی ہے۔"

جبار صاحب خاموش ہو جاتے۔ ملازم تھے غوری صاحب کے اس سے زیادہ نہیں بول سکتے تھے۔

دوسری طرف دونوں لڑکیاں الگ الگ مزاج کی حامل تھیں۔

گوہر شروع ہی سے پڑھائی میں کمزور تھی جبکہ نائلہ بے حد ذہین تھی۔ غوری صاحب نائلہ کی تعلیم سے بالکل مطمئن تھے جبکہ ٹیوشن کی ضرورت انہیں گوہر ہی کی وجہ سے پیش آئی تھی۔

گوہر خوب صورت تو نہیں تھی لیکن قبول صورت تھی۔ وہ کند ذہن بھی نہیں تھی لیکن پڑھائی میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا ویسے وہ بہت تیز وطرار تھی جبکہ اس کے برعکس نائلہ کافی خوب صورت تھی اور اس کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی جس نے اس کے مزاج سے جنم لیا تھا۔ بے حد ملنسار، خوش مزاج اور خس مکھ تھی۔ غوری صاحب کی دلی آرزو تھی کہ بیٹیوں کو ایک معقول تعلیم دے کر ان کے گھروں کو رخصت کر دیں۔ انہوں نے اپنے خاص ملازم اور دوست جبار صاحب سے کسی ٹیوٹر کے لیے کہا تھا اور جبار صاحب شارب کو لے آئے تھے۔

شارب کی کہانی یہ تھی کہ اس کے والد سرور احمد ایک پرائیویٹ ملازمت کرتے تھے۔ بہت معمولی سی تنخواہ تھی جس سے بس گزارہ ہو جاتا تھا۔ رزقِ حلال کے قائل تھے اور کبھی غلط پیسوں پر توجہ نہیں دی تھی جس کی وجہ سے اولاد بھی حلال خون کی حامل تھی۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا جن کی تعلیم کے لیے انہوں نے فاقے بھی گوارہ کیے تھے اور انہیں تعلیم دلائی تھی۔ بیگم بھی قناعت پسند تھیں اور ہر مسئلے میں شوہر کے شانہ بشانہ تھیں۔ شارب اور عالیہ مثالی بہن بھائی تھے۔ عالیہ

شارب سے دو سال بڑی تھی اور ماں باپ کی تربیت نے دونوں کو بہترین احساسات دیے تھے۔ نہ کسی کی حرص نہ کوئی ہوس۔ اپنے کام سے کام، شارب نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیں۔ اس طرح اس نے باپ کے شانوں سے اپنی اور بہن کی تعلیم کا بوجھ ختم کر دیا۔ اس کا یہ تجربہ بڑا دل خوش کن تھا۔ اسے بچوں کو پڑھانے میں بے حد لطف آتا تھا چنانچہ حالات کافی بہتر ہو گئے۔ اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ انٹر، بی اے اور پھر یونیورسٹی۔ اب وہ اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا کہ اس کے ایک شناسا جن کے بھائی کی بیٹیوں کو وہ پڑھا رہا تھا۔ اسے ایک کروڑ پتی سیٹھ کی دو بیٹیوں کے ٹیوشن کے بارے میں بتایا اور اس کے انٹرویو کے دوسرے دن ہی اسے یہ ٹیوشن مل جانے کی خوش خبری سنائی۔ فیس بھی شارب کی توقع سے آٹھ گنا زیادہ تھی۔

شارب کافی عرصے سے ٹیوشن پڑھا رہا تھا لیکن اس نے اپنے کردار میں کبھی جھول نہیں آنے دیا تھا۔ اس عالی شان کوٹھی میں اس نے دو خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کو ٹیوشن دینے میں کوئی خاص بات نہیں محسوس کی جبکہ دونوں لڑکیوں نے شوخ مسکراہٹوں سے اس کا استقبال کیا تھا۔

"تو آپ ہیں ہمارے استاد۔" گوہر نے موٹی موٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری استادی کا بھرم رکھیں گی۔" شارب نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"وہ تو ہم رکھ ہی لیں گے لیکن آپ کو بھی ہمارا بھرم رکھنا ہوگا۔" گوہر آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"وہ کیسے؟" شارب نے پوچھا۔

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا۔" گوہر بولی اور شارب نے ساتھ بیٹھی نائلہ کو دیکھا جو خاموش اور پُروقار سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یہ لڑکی بہت اچھی لگی۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنے طور پر بے حد محتاط تھا۔ لیکن خصوصاً گوہر کو وہ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار پا رہا تھا۔ ایک دن دونوں اسی سے پڑھ رہی تھیں کہ نائلہ کسی کام سے اٹھ کر باہر نکل گئی تو گوہر فوراً بولی۔

"اللہ مجھ پر رحم کرے۔ اتنی پریشان ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔"

"کیوں۔"

"یہ بلا جو ہم پر مسلط رہتی ہے ایک لمحے کے لیے تنہا نہیں چھوڑتی کہ انسان دل کی بات ہی کر لے۔"

"کس سے؟" شارب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ سے اور کس سے۔"

"ایک عرض کردو۔" شارب بولا

"جی۔ ارشاد۔"

"آپ مجھ سے دل کی بات کرنے کے بجائے اپنی پڑھائی کی بات کریں تو مناسب ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے میٹرک خدا خدا کر کے کیا تھا۔ اب بات مجھ پر آ گئی ہے۔"

"مجھے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" گوہر کا موڈ خراب ہو گیا۔

"اور مجھے دل کی باتوں سے۔" شارب خشک لہجے میں بولا۔ گوہر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اتنی دیر میں نائلہ واپس آ گئی تھی۔

دوسرے دن گوہر نارمل تھی۔ کئی دن گزر گئے گوہر کسی حد تک محتاط ہو گئی تھی نائلہ البتہ اپنے مزاج کے مطابق تھی لیکن اس دن وہ بھی کھل گئی۔ اس دن گوہر پڑھنے نہیں آئی تھی۔

"ہمارے ایک عزیز کی شادی ہے۔ وہ پاپا کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہے۔"

"آپ نہیں گئیں۔"

"جاتی ہوں لیکن ذرا کم۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"بس عادت نہیں ہے۔ میرے لیے باجی ہی شاپنگ کرتی ہیں۔ ایک بات بتاؤں آپ کو۔" اس کے لہجے میں شوخی پیدا ہو گئی۔

"جی۔"

"باجی ہمیشہ اپنے لیے بہت اچھی چیزیں خریدتی

ہے اور میرے لیے ایسی جو مجھ پر سوٹ نہ کریں۔"

"ارے پھر آپ کیا کرتی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے باجی سے بہت محبت ہے۔ ہمارا اور ہے ہی کون...... آپ نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا ہے سر!" اس نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا پھر فوراً ہی بولی۔ "اصل میں آج پہلی بار آپ سے بات کرنے کا موقع ملا ہے ورنہ باجی ساتھ ہوتی ہیں۔"

شارب نے اسے مختصراً اپنے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ "آپ کی باجی بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں گی۔"

"ہاں بہت۔ ہمارا بھی کوئی اور نہیں ہے۔" شارب بولا۔

"میں جو......" وہ کہتے کہتے رکی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ "ہم جو ہیں ہم صرف آپ کے اسٹوڈنٹ ہی نہیں دوست بھی تو ہیں۔"

دوسری بار ایک موقع ملا تو اس نے کہا۔ "آپ کو سر کہنا بڑا عجیب لگتا ہے۔ اگر تنہائی میں آپ کو شارب کہہ لیا کروں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔"

شارب نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ مایوسی سے بولی۔ "اس کا مطلب ہے ناراض ہوں گے۔" پتھر پر مسلسل بوندیں پڑ رہی تھیں۔ شارب نے کبھی ان راستوں کا سفر نہیں کیا تھا لیکن اب اس کی راتوں کے خواب تنہا نہیں رہے تھے۔ ان میں کچھ تصویریں شامل ہوگئی تھیں' ایک چہرہ داخل ہوگیا تھا۔ یہ نائلہ کا چہرہ تھا اس کی دل فریب باتیں تھیں۔ صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ شارب سے محبت کرنے لگی ہے۔

☆☆☆

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد شارب کو ایک اور احساس ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ گوہر بھی اس کی جانب ملتفت ہے۔ گوہر نائلہ کی نسبت بہت بے باک تھی اور اس نے نائلہ کے سامنے ہی اپنے اس جذبے کا اظہار بھی کر دیا تھا جس سے شارب کو پتا چل گیا تھا کہ دونوں بہنیں شدت سے اسے چاہنے لگی ہیں۔

لیکن دونوں لڑکیوں کے مزاج اور رویے میں بڑا فرق تھا۔ گوہر کے انداز میں سرکشی اور کرختگی تھی۔ وہ سب کچھ چھین کر جھپٹ کر اپنی پسند حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ اس کے انداز میں تکبر اور احساس برتری تھا جبکہ نائلہ اس سے بہت مختلف تھی۔ اس کے پیار میں دھیما پن، ایک والہانہ نرمی اور شگفتگی تھی۔ دلوں کو تسخیر کر لینے والی قوت تھی۔ نتیجے میں شارب بھی اسے چاہنے لگا۔

اس طرح کے حالات میں وقت کی رفتار بھی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو پڑھاتے ہوئے شارب کو ڈیڑھ دو سال ہوگئے۔ اس دوران ان دونوں نے فرسٹ ایر کا امتحان پاس کر لیا تھا اور سیکنڈ ایر میں آگئی تھیں۔ توقع کے مطابق گوہر کے نمبر بہت کم آئے تھے اتنے کم کہ اگر ذرا اور کم ہو جاتے تو وہ فیل ہو جاتی۔ اس کے برعکس نائلہ بہترین نمبروں سے کامیاب ہوئی تھی۔ شارب اس کی کامیابی سے بہت خوش ہوا تھا۔ گوہر کو اب بھی تعلیم سے کوئی رغبت نہیں تھی بلکہ ایک بار اس نے نہایت بے باکی سے کہا تھا۔

"آپ کو دل کی بات بتا رہی ہوں سر۔ مجھے پڑھنے سے نہ پہلے کوئی دلچسپی تھی نہ اب ہے اور میں جانتی ہوں کہ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کس کی مجال تھی کہ مجھے پڑھا سکتا، لیکن...... میں آپ کے لیے پڑھتی ہوں۔ صرف آپ کے لیے تاکہ آپ میرے سامنے رہیں۔"

شارب نے چونک کر نائلہ کو دیکھا تھا۔ نائلہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن اس نے کتاب پر نگاہیں جمائے رکھی تھیں۔ ایک بار اس کی نظریں شارب سے ملیں تو وہ مسکرا دیا اور نائلہ نے جیسے اس کی مسکراہٹ کی تحریر پڑھ لی ہو۔

شارب کو اپنی طرف مائل کرنے کی گوہر کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ شارب نائلہ کی طرف مائل ہے۔ جوں جوں وہ قریب آتے جا رہے تھے گوہر کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ وہ بری طرح جھلس رہی تھی۔ وہ

محبت نہیں قبضہ جمانے کی قائل تھی اسے۔ محبوب نہیں غلام درکار تھا لیکن شارب اس کی غلامی کیوں قبول کرتا۔ وہ جنونی ہوتی گئی اس کی محبت نفرت کا رخ کر چکی تھی اور یہاں بھی اس نے خود پر کوئی ملمع نہیں رکھا اب وہ کھلم کھلا دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ان کے راستوں میں روڑے اٹکاتی رہتی تھی جس سے نائلہ بہت پریشان تھی۔

"باجی۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔"

"تم جانتی ہو۔" گوہر نے تلخی سے کہا۔

"کیا؟"

"شارب۔ وہ میرا حق ہے۔ میں تم سے بڑی ہوں۔" گوہر نے کہا اور نائلہ ہنس پڑی۔ گوہر نے اس کی ہنسی کو نفرت سے دیکھا اور بولی۔ "ہاں تمہیں ہنسنے کا موقع ملا ہے لیکن میں تمہیں ہنسنے نہیں دوں گی۔"

"باجی۔ باجی۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں وہ ہمارے ٹیچر ہیں۔ ان پر کسی کا کیا حق ہے۔"

"کیا تم مجھے بے وقوف بنا سکتی ہو۔ خود کو زیادہ ذہین مت سمجھو نائلہ ٹھوکر کھا جاؤ گی۔"

☆☆☆

بے چارے غوری صاحب نے ابتدا میں کچھ عرصہ شارب پر نگاہ رکھی کہ کس طرح کا نوجوان ہے پھر وہ پوری طرح مطمئن ہوگئے کہ جبار صاحب نے واقعی ایک بے حد شریف نوجوان کو ان کی بیٹیوں کا استاد بتایا ہے' لیکن عائشہ پھوپی بے حد جہاندیدہ تھیں۔ انہوں نے خود کو اس گھر کی بہتری کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی نظریں دور تک دیکھتی تھیں اور انہوں نے ان دونوں بہنوں کے مسئلے کو جانچ لیا تھا۔ شارب انہیں بے حد پسند تھا ذاتی طور پر نہیں بلکہ بھتیجیوں کے خیال سے وہ شارب کے گھر جا کر اس کے والدین اور بہن سے بھی مل چکی تھیں اور بڑا اچھا تاثر لے کر آئی تھیں۔ انہیں علم ہو چکا تھا کہ شارب ایک نیک اور بے حد شریف لیکن مالی طور پر پسماندہ گھرانے کا فرد ہے۔ البتہ وہ لوگ بے حد نفیس اور ملنسار تھے۔ ان کی زیرک نظروں نے کچھ ہی دن میں اندازہ لگا لیا کہ دونوں لڑکیاں شارب سے متاثر ہیں لیکن انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ شارب نائلہ کو پسند کرتا ہے اور بات بھی ٹھیک تھی کیونکہ گوہر جس مزاج کی لڑکی تھی اسے کوئی بھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے دونوں لڑکیاں یکساں تھیں لیکن انہیں شارب کی پسند معلوم تھی۔

آخر انہوں نے ایک فیصلہ کیا اور غوری صاحب کے سامنے پہنچ گئیں۔

"تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں حسن۔"

"جی باجی۔"

"میں جانتی ہوں کہ بچیوں کے رشتے کے لیے تم مضطرب رہتے ہو۔"

"جی باجی۔ بے شک آپ میرے لیے بہت بڑا سہارا ہیں لیکن پھر بھی میں نصرت جہاں کی کمی بہت محسوس کرتا ہوں۔ اب ہم دونوں کو ہی ان کی بہتری کے لیے سوچنا ہے۔"

"میں نے کچھ سوچا ہے۔"

"کیا؟"

"برا تو نہیں مانو گے۔"

"ارے کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ......"

"میرے ذہن میں شارب ہے۔ اگر ہم نائلہ کی شادی شارب سے کر دیں۔ تم طویل عرصہ سے اسے دیکھ رہے ہو۔ اس کے گھر کو میں دیکھ چکی ہوں۔ بے حد شریف لوگ ہیں۔ بس غریب ہیں اور کوئی خرابی نہیں ہے۔"

"آپ جانتی ہیں باجی، میں غربت سے نفرت نہیں کرتا لیکن......" غوری صاحب نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ان ہی بچیوں کے لیے تو ہے سب سے بڑی بات ہے کہ شارب ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ نائلہ اور گوہر کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے لیکن دنیا لالچ سے بھری ہے ایک سے ایک لالچی مل جائے گا جبکہ وہ لوگ لالچی بالکل نہیں ہیں۔"

غوری صاحب سوچ میں ڈوب گئے پھر انہوں نے گردن اٹھا کر کہا۔ ”آپ دیکھ لیں۔ جو فیصلہ آپ کریں۔“

بالکل اتفاق سے عالیہ کے لیے رشتہ آیا اچھے لوگ تھے بس انہوں نے جلدی شادی کی خواہش کی تھی۔ سرور احمد صاحب کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی، پھر شمشاد علی بھی عمدہ فطرت کا نوجوان تھا چنانچہ شادی طے ہوگئی۔

شارب مصروف ہوگیا۔ وہ رویا رویا رہتا تھا۔ بہن جدا ہو رہی تھی۔ اس نے گھر والوں سے کہا کہ وہ شادی میں غوری صاحب اور ان کے گھرانے کو بھی بلائے گا۔

”ارے بیٹے وہ کروڑ پتی لوگ ہیں۔ آئیں گے؟“ سرور احمد نے کہا۔

”میں دعوت نامہ ضرور دوں گا۔ باقی ان کی مرضی۔“

عائشہ پھوپھی نے خوش دلی سے کہا۔

”کیوں نہیں آئیں گے ہماری ہی بیٹی ہے عالیہ بھی۔“ پھر انہوں نے غوری صاحب سے کہا۔

”اللہ نے سبیل نکال دی ہے اس بہانے تم بھی ان سے مل لوگے۔“

”بچیاں بھی جائیں گی۔“

”ہاں۔ دونوں۔“ نائلہ نے تو خاموشی سے سر جھکا دیا تھا لیکن گوہر نفرت سے بولی۔

”ایک ملازم کے گھر شادی میں جائیں گے آپ لوگ؟“ یہ جملے اس نے غوری صاحب کے سامنے کہے تھے۔ غوری صاحب حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ پھر ان کا چہرہ غصے سے زرد ہوگیا۔

”اتنی فضول ہوگئی ہو تم۔ کس نے تمہیں یہ سکھایا۔ سب کو جانا ہے شادی میں۔“ انہوں نے کرخت لہجے میں کہا۔ مقصد یہ تھا کہ گوہر بھی شادی میں جائے گی یہ ان کا حکم ہے۔

☆☆☆

بڑے پیار سے غوری صاحب اور ان کے چھوٹے سے خاندان کا استقبال کیا گیا۔ غوری صاحب بہت متاثر ہوئے تھے۔ عائشہ پھوپھی نے اپنا فرض پورا کیا۔ غوری صاحب نے سرسری کہا کہ گوہر بڑی ہے لیکن گوہر نے خود اپنے پاؤں کلہاڑی ماری تھی اس دن اس نے غوری صاحب کے سامنے شارب کو ملازم کہا تھا اس کا حوالہ دے کر عائشہ پھوپھی نے کہا کہ وہ اس شادی کے لیے خوشی سے تیار نہیں ہوگی چنانچہ شارب اور نائلہ کی شادی طے ہوگئی۔

شارب کی تعلیم مکمل ہوگئی اور خوش بختی یا نائلہ کی تقدیر کہ اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی نوکری مل گئی۔ دوسری طرف گوہر انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح ان دونوں کو جدا کر دے۔ اس کے کلیجے پر گہرا گھاؤ لگا تھا۔ اس نے پڑھنا بھی چھوڑ دیا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر غوری صاحب نے کہا۔

”گوہر کو بہن کی جدائی کا بہت صدمہ ہے۔ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گوہر کے لیے بھی کوئی رشتہ مل جائے تو دونوں کی شادی ایک ساتھ کر دوں۔“

بہت سے رشتے تھے۔ دولت مند باپ کی بیٹیوں کے لیے رشتوں کی کیا کمی۔ چنانچہ ایک رشتہ پسند کر لیا گیا۔ گوہر نے البتہ بڑی واویلا کیا کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن اس کی ایک نہ چلی اور آخر کار دونوں بیٹیاں بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ غوری صاحب نے لڑکوں کے والدین کے سامنے کچھ مطالبے رکھے تھے جن پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ پھر دوسرا مرحلہ آیا چنانچہ پوری احتیاط کے ساتھ حسن علی غوری نے اپنی تمام دولت اور جائیداد دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر کے وصیت نامہ تیار کر دیا جس کی رو سے ان کی موت کے بعد یہ سب کچھ انہیں ہی ملنے والا تھا۔

☆☆☆

بدمزاج گوہر نے سسرال میں بھی اپنے رنگ دکھائے ایک مغرور لڑکی کی حیثیت سے وہ سسرال والوں کے لیے عذاب بن گئی۔ بھرے پرے خاندان میں گئی تھی چار بھائی اور چار بہنیں تھے کچھ اور رشتے

دار تھے بہت شاندار اور بڑی کوٹھی تھی سب مل جل کر رہتے تھے خوب دولت مند لوگ تھے گوہر کی وہاں نہ بن سکی وہ ایک سرکش اور خود غرض لڑکی تھی۔ اس نے شوہر سے مطالبہ کیا کہ وہ الگ رہنا چاہتی ہے یہ سب لوگ اسے ناپسند ہیں۔ میرے باپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے ان میں سے کسی کوٹھی کو منتخب کر لیا جائے لیکن شوہر نے اسے دھتکار دیا اور وہ گھر واپس آ گئی لیکن یہ عمل بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ غوری صاحب نے بڑی کوشش کی کہ گوہر اپنے گھر جا کر آباد ہو جائے۔ گوہر کے شوہر نے بھی ان کا ساتھ دیا لیکن گوہر تیار نہیں ہوئی۔ آخر کار گوہر کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔

جس رات گوہر کو طلاق ہوئی اسی رات غوری صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ سارا گھر اتھل پتھل ہوگیا۔ بڑی مشکل سے غوری صاحب کی جان بچی تھی لیکن وہ مسلسل دل کے مریض بن گئے۔ بے چاری عائشہ پھوپھی بھی سخت پریشان رہنے لگیں اب اس بارے میں گوہر سے کچھ کہنا بھی بے کار تھا اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ شارب سگے بیٹوں کی طرح غوری صاحب کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن غوری صاحب کے دل کو جو روگ لگا تھا اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

”میں اب اس دنیا سے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی بیٹیوں کو بڑی توجہ سے پالا تھا نہ جانے یہ کیا ہوگیا۔“

”تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے حسن علی۔ دیکھو نائلہ نے کس طرح اپنا گھر سنبھالا ہوا ہے۔ اس کے ساس سسر اس پر جان دیتے ہیں۔ شوہر بھی اس سے بے حد خوش ہے۔“

”میرے خاندان کی کسی لڑکی کو آج تک طلاق نہیں ہوئی ہے۔“ حسن علی گلوگیر لہجے میں کہتے۔ یہ صدمہ ان کے دل کو ایسا لگا کہ آخر کار انہوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ عائشہ پھوپھی عجیب کردار تھیں۔ آج تک بس اس گھر کی دیکھ بھال کرتی رہی تھیں انہوں نے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا تھا۔ بھائی کی موت کے

چٹکلے

☆

دلہن رخصت ہو رہی تھی۔ خواتین آنسو بہا رہی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے یہ گانا بج رہا تھا۔ ”چھوڑ بابل کا گھر، موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔“ مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی جو غم زدہ نظر آنے کے بجائے ایک کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔ لڑکی کی ایک سہیلی نے پوچھا۔ ”رخسانہ تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ تمہیں کرن کی رخصتی کا دکھ ہو رہا ہے۔“

لڑکی بولی۔ ”دکھ کرتی ہے میری جوتی! کرن نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کرتا۔ اس نے ہمیشہ مجھے یہ مشورہ دیا کہ عامر سے جتنی ترش روئی سے پیش آؤ گی، وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔“

سہیلی نے پوچھا۔ ”یہ عامر کون ہے۔“

”وہ جو سہرا باندھے، پھولوں سے آراستہ کار کی طرف بڑھ رہا ہے۔“

☆

رئیل اسٹیٹ ایجنٹ مکان کے متوقع خریدار سے کہنے لگا۔ ”یہ گھر فوائد اور نقصان دونوں رکھتا ہے۔ میں ایک دیانتدار انسان ہوں، اس لیے پہلے آپ کو نقصان بتاتا ہوں۔ گھر کے مغرب میں ایک میل دور بھینسوں کا باڑہ ہے۔ مشرق کی جانب ربڑ بنانے والا ایک کارخانہ ہے۔ شمال کی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر کوڑے کرکٹ سے کھاد بنانے والا پلانٹ ہے اور جنوب کی طرف سیمنٹ فیکٹری ہے۔“

متوقع خریدار نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ ”فوائد کیا ہیں۔“

”آپ ہمیشہ آسانی سے جان سکتے ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔“

صرف دو ماہ کے بعد انہیں بھی برین ہیمرج ہوا اور دیکھتے دیکھتے جٹ پٹ ہو گئیں۔

سارے گھر کی صفائی ہو گئی۔ گوہر اب گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ دوسری طرف شارب اور نائلہ مثالی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ ان کی محبت دن دگنی رات چوگنی بڑھ رہی تھی۔ سارا گھر خوش تھا' نائلہ اپنے ساس سسر کی بھی بہت خدمت کرتی تھی۔ مسرور احمد کا گھر بہت تنگ تھا جبکہ نائلہ بہت بڑی کوٹھی سے وہاں گئی تھی۔ غوری صاحب کی موت کے بعد ان کی ساری جائیداد اور دولت دونوں میں تقسیم ہو کر دونوں بہنوں کو مل گئی تھی جن میں کئی شان دار کوٹھیاں بھی تھیں۔ دولت کے انبار تھے لیکن شارب نوکری کر رہا تھا۔ گو اس کے عہدے میں کافی ترقی ہو گئی تھی لیکن نوکری، نوکری ہوتی ہے۔ نائلہ کو شوہر کی خوداری کے بارے میں معلوم تھا اس لیے اس نے کبھی کوئی پیشکش کر کے اس کی توہین نہیں کی تھی۔

یوں وقت آگے بڑھتا رہا۔ گوہر اپنی ازدواجی زندگی تباہ کر چکی تھی۔ اپنے مستقبل کے بارے میں اس نے کیا سوچا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ شارب اور نائلہ کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا طوفان تھا۔ یہ طوفان ان دونوں کو خوش دیکھ کر اور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ ان دونوں سے ملنا تک پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے کبھی ان سے یگانگت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن نائلہ کے دل میں اس کے باوجود اس کے لیے بہن کا پیار تھا۔ وہ اکثر اس سے ملنے چلی جاتی تھی لیکن گوہر ان لوگوں سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی دو تین بار شارب نے اس سے کہا بھی کہ وہ گوہر کے پاس نہ جایا کرے لیکن نائلہ نے دلسوزی سے کہا۔

"میرا ماضی اس گھر سے، باجی سے جڑا ہوا ہے شارب۔ وہاں باجی ہی نہیں پاپا کی خوشبو بھی بسی ہوئی ہے۔ میں وہاں جا کر یوں محسوس کرتی ہوں جیسے پاپا کے پاس آئی ہوں۔" اس کے لہجے میں ایسا سوز ہوتا کہ شارب موم کی طرح پگھل جاتا۔

☆☆☆

پھر ایک دن عالیہ اور اس کا شوہر شمشاد علی متجسس سے ان کے پاس آئے۔ عالیہ نے پریشان لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے شارب، تمہاری محبت تو مثالی ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہارے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے۔"

"کس کی بات کر رہی ہیں باجی؟" شارب نے حیرت سے کہا۔

"تم دونوں کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو گیا ہے۔"

"میرے اور نائلہ کے درمیان۔"

"ہاں۔"

"خدانہ کرے۔ آپ سے کس نے کہا؟"

"کئی لوگوں نے ان کا کہنا ہے کہ شارب اور نائلہ کے تعلقات سخت کشیدہ ہیں اور اس کشیدگی میں اضافہ ہو رہا ہے، نائلہ اپنے شوہر سے خوش نہیں ہے، شارب اس بات پر خوب ہنسا اس نے نائلہ کو بلا کر یہ بات بتائی تو وہ بھی ہنسی دونوں نے کہا کہ پتہ نہیں یہ خبر کس بے ہودہ شخص نے اڑائی ہے، بعد میں اس بے ہودہ شخص کا پتہ بھی چل گیا اس خبر کا مرکز گوہر کا گھر ہی تھا۔"

"انہوں نے ہم لوگوں کا قصور معاف نہیں کیا ہے اور کبھی معاف نہیں کریں گی۔ وہ ہم دونوں کی جان کی دشمن ہیں اب پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے نائلہ، شارب نے غصے سے کہا۔

"پلیز شارب، باجی نفسیاتی مریض بن چکی ہیں، وہ بالکل تنہا رہ گئی ہیں اور رحم اور ہمدردی کی مستحق ہیں۔"

"لیکن وہ ہم دونوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، شارب نے برہمی سے کہا۔ یہ بات عالیہ اور شمشاد کے علم میں آئی تو عالیہ نے بھی نائلہ کی تائید کی۔

"تم اس معاملے کے پس منظر کو تو جانتے ہی ہو شارب، نائلہ ٹھیک کہہ رہی ہے وہ رحم اور ہمدردی کی مستحق ہیں۔

"میں ان کے پاس جا کر انہیں سمجھاؤں گی شارب' کہ وہ ہمارے بارے میں ایسی باتیں نہ کریں۔

"وہ کیا سمجھیں گی نائلہ، وہ تم سے سیدھے منہ بات تو کرتی نہیں ہیں۔"

شارب نے کہا۔

"میں بھی سخت رویہ اختیار کروں گی، آپ مجھے اس کا موقع دیں پلیز، پھر ایک دن نائلہ گوہر کے پاس پہنچ گئی، "آخر آپ کیا چاہتی ہیں، مجھے کھل کر بتایئے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ گوہر غصے سے بولی۔"

"کیا افواہیں اڑا رہی ہیں آپ؟ ہمارے بارے میں، کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہیں آپ اس سے؟" نائلہ نے ساری تفصیل گوہر کو بتائی تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔"

"یہ نئی چال سوچی ہے تم دونوں نے، میری بلا سے تم لڑو مرو جہنم میں جاؤ۔ مجھے کیا، اور سنو آئندہ ایسی کوئی کہانی لے کر میرے پاس مت آنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"آپ بھی برائے مہربانی ہم لوگوں کے بارے میں کسی سے بات نہ کریں۔ جو کچھ آپ کر رہی ہیں وہ آپ کے حق میں بھی بہتر نہیں ہوگا۔ نائلہ نے پہلی بار سختی سے بہن سے کیا اور وہاں سے چلی آئی۔ گھر آ کر اس نے ساری بات تفصیل سے شارب عالیہ اور شمشاد کو بتائی۔ سب نے افسوس کیا تھا کہ مجبوراً نائلہ کو یہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔

☆☆☆

زندگی کی گاڑی کچھ اور آگے بڑھی، مسرور احمد کی صحت کافی خراب رہنے لگی تھی نہ جانے کیوں آجکل ان پر ایک جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ شارب سسرال سے ملے ہوئے خوب صورت گھر میں منتقل ہو جائے۔

"لیکن کیوں ابو؟

"روز اول سے میر دل کہتا ہے، یہ بچی ایک عالی شان کوٹھی سے آئی ہے اور یہاں ایک مرے میں گزارا کر رہی ہے۔"

"مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔ ابو جی۔ میں نے تو کبھی ایسی بات نہیں سوچی۔" نائلہ نے کہا۔

"مگر میں یہ ہی چاہتا ہوں۔" مسرور احمد نے کیا ان کا یہ مطالبہ ہے کہ زور پکڑ گیا انہوں نے عالیہ اور شمشاد کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ تب مجبور ہو کر شارب نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابو۔ پھر ہم سب ساتھ ہی چلیں گے۔"

"ارے نہیں بیٹے، مجھے اس گھر سے بہت محبت ہے، میں کہیں نہیں جاؤں گا، شارب نے سرتوڑ کوشش کی کہ وہ ماں باپ سے دور نہ جائے لیکن عالیہ اور شمشاد نے بھی یہ ہی کہا کہ واقعی ایک عالی شان کوٹھی سے آ کر نائلہ اس چھوٹے سے گھر کے ایک کمرے میں قید ہو گئی ہے۔

"حالانکہ امی اور ابو کو اب ہماری ضرورت تھی، ہم ان کی خدمت کرتے۔" نائلہ نے کہا۔

"تم لوگ شہر سے باہر تو نہیں جا رہے، جب چاہو آ سکتے ہو" عالیہ نے کہا۔ آخر کار یہ دونوں ایک خوب صورت گھر میں منتقل ہو گئے جو نائلہ کو اس کے باپ کے ورثے سے ملا تھا۔ شارب بدستور ملازمت کر رہا تھا اور اسے بہترین تنخواہ ملتی تھی اس نے ماں باپ کی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی رکھ دیا، اس کے علاوہ شارب کی والدہ بھی شوہر کی خدمت کرتی تھیں۔

☆☆☆

حالات میں کوئی خاص مدوجزر نہیں تھا، خوش گوار زندگی تھی بس ایک کمی تھی دونوں کی زندگی میں شادی کو طویل وقت گزر گیا تھا لیکن ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ افسردہ نہیں تھے اور قسمت پر قائم تھے۔ شارب جس ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا وہاں کافی بڑا اسٹاف تھا جن میں مرد عورتیں سب ہی تھے، اسی اسٹاف میں ایک ستارہ نامی لڑکی بھی تھی، شوخ چنچل سی' صورت شکل کی بھی اچھی تھی، جس شعبے سے اس کا تعلق تھا وہ شارب کے تحت تھا، اکثر ستارہ سے اس کی ملاقات ہوتی تھی لیکن صرف کام کی حد تک خود ستارہ نے بھی اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن ایک دن وہ شارب کے پاس کسی کام سے آئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”باہر بارش ہو رہی ہے! اس نے کہا۔“

”جی ہاں“

”آپ سے ایک بات پوچھوں۔“ وہ بولی اور شارب چونک کر اسے دیکھنے لگا، ستارہ نے اس سے پہلے اس سے ضرورت کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

”جی پوچھیے“

”آپ کا سب کے ساتھ یہ ہی رویہ ہے جو میرے ساتھ ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”خشک خشک، سپاٹ سپاٹ، آپ نے آج تک نظر بھر کر مجھے دیکھا بھی نہیں ہے، مجھے لگتا ہے اگر آپ کبھی مجھے باہر دیکھیں تو پہچان بھی نہیں پائیں گے۔“

اس کی اس بات پر شارب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، ”آپ کی آواز سنوں گا تو ضرور پہچان لوں گا۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”اور آپ نے اتنی حسین مسکراہٹ ہم سے چھپائے رکھی تھی، ستارہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔“

”میرا خیال ہے موسم آپ پر بری طرح اثر انداز ہے۔“ شارب نے ایک فائل اٹھا کر کہا۔

”یہ فائل اٹھا کر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جاؤں۔ وہ بولی۔

”آپ بہت سمجھ دار ہیں۔“

”لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے چائے کے لیے پوچھیں، یا پھر یہاں سے چھٹی کے بعد مجھے کہیں چائے پلانے کی دعوت دیں۔“

”مس ستارہ۔ سوری' میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ شارب فائل کھولی کر اس پر جھک گیا، ستارہ کچھ دیر سامنے بیٹھی اسے گھورتی رہی' پھر اٹھ کر چلی گئی۔ شارب نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے تھوڑی سی الجھن ضرور ہوئی تھی، تاہم اس نے سوچا تھا کہ اگر ستارہ نے دوبارہ ایسی کوئی کوشش کی تو وہ اسے اچھی طرح جھاڑ پلا دے گا۔

ستارہ ریزرو ہو گئی تھی لیکن ایک دن وہ چونک پڑا، نائلہ نے اس سے کہا ”شارب۔ یہ ستارہ کون ہے؟“

”ستارہ۔؟ کیوں؟ خیریت۔؟“

”کون ہے یہ۔ نائلہ کی آواز سپاٹ تھی۔“

”میرے دفتر میں کام کرتی ہے، تمہارے علم میں اس کا نام کیسے آیا۔؟ شارب نے شدید حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے اور اس کے بارے میں کچھ افواہیں سننے میں آ رہی ہیں۔“ یہ کہ وہ زیادہ تر تمہارے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔

”لاحول ولاقوۃ، وہ صرف میرے آفس میں کام کرتی ہے۔“

”گویا اس کا وجود ہے، اور وہ کسی نہ کسی شکل میں تمہارے پاس ہوتی ہے۔“

”میرے پاس نہیں میرے آفس میں ہوتی ہے، اور بھی دوسری لڑکیاں وہاں ہوتی ہیں۔“

”تم کچھ اور خیال مت کرنا، تمہارے اور اس کے بارے میں جھوٹی سچی خبریں اڑائی جا رہی ہیں۔“

”کس طرح، مجھے بتاؤ گی۔“

”فون پر۔ ان فون نمبروں سے۔ مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ چڑیا اڑنے والی ہے، گھر سنبھالو۔ فون پر ہی مجھے ستارہ کا نام بتایا گیا ہے۔“

”فون مرد کا تھا۔؟“

”ہاں، لیکن دو نمبروں سے۔!“

”فون نمبر تمہارے پاس محفوظ ہے“

”ہاں، یہ دو نمبر ہیں، میں نے محفوظ کرے ہیں۔ نائلہ نے اسے نمبر دکھائے۔ اور شارب کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی لیکن نائلہ نے آگے بڑھ کر اس کا سر سینے سے لگا لیا اور بولی پریشان ہو رہے ہو اپنی نائلہ پر بھروسا نہیں، میں مانتی ہوں یہ کھیل کون کھیل رہا ہے۔ یہ ساری حرکتیں باجی کر رہی ہیں۔

”یہ تو حد سے زیادہ ہے نائلہ' میں ان کے خلاف جوابی کارروائی بھی کر سکتا ہوں۔ وہ ہماری زندگی میں اب زہر کیوں گھول رہی ہیں، آخر وہ کیا چاہتی ہیں۔

”تم ان کی پروا مت کرو۔ وہ دماغی مریض بن چکی ہیں، اپنے احساس شکست کو دور کرنے کے لیے وہ یہ اوچھی حرکتیں کر رہی ہیں۔“

”انہوں نے اپنے جنون میں اپنا گھر تو برباد کر لیا، اب وہ دن رات ہمیں برباد کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے نائلہ۔“

☆☆☆

بات یہیں تک نہیں رہی، عالیہ اور شمشاد کے کانوں تک بھی یہ خبریں پہنچ گئیں، گوہر کا نیٹ ورک زبردست تھا، دونوں دریافت حال کے لیے ان کے پاس پہنچ گئے، ان کے پوچھنے پر بتایا گیا کہ ستارہ نامی عورت کے بارے میں یہ کہانیاں گوہر پھیلا رہی ہے، اس کا مقصد ہم لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے پھیلائی جا رہی ہیں۔

”آپ لوگ ان دونوں باتوں سے پریشان نہ ہوں، ہم ان کا سامنا کر رہے ہیں، خدا باجی کو عقل دے۔ ان کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔“

”ظاہر ہے بڑی بہن ہیں، لیکن ایک بات بتاؤ۔ کیا ستارہ نامی لڑکی یا عورت کا وجود ہے“

”ہاں باجی، میرے آفس میں کام کرتی ہے۔“

”کس طرح کی عورت ہے۔“ عالیہ نے پوچھا اور شارب سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے اچانک ستارہ کی باتیں یاد آ گئی تھیں، کیا اس نے کسی خاص مقصد کے تحت' یا پھر کسی کی آلہ کار بن کر وہ کوشش کی تھی۔ اگر شارب کے کردار میں کوئی لچک ہوتی تو اس طرح کی لڑکیاں آسانی سے گھروں کو تباہ کر دیتی ہیں۔

”کس سوچ میں ڈوب گئے۔؟“ شمشاد نے پوچھا۔

”ستارہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں، ہے تو وہ بہت تیز طرار' لیکن میرا اس کا بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر افواہ گوہر باجی پھیلا رہی ہیں تو وہ ستارہ کو کیسے جانتی ہیں۔“ شارب نے جان بوجھ کر ستارہ سے متعلق وہ باتیں نہیں بتائی تھیں جو ستارہ نے کی تھیں۔ وہ اب کافی سمجھ دار ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ نائلہ آخر کار ایک لڑکی ہے۔ وہ باتیں اسے پریشان کر سکتی ہیں۔

”یہ کوئی سوچنے کی بات نہیں ہے۔ جب گوہر یہ سب کچھ کرنے پر تلی ہوئی ہیں تو اپنے کام کی لڑکی تلاش کر لینا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ شمشاد نے کہا۔

”تم خاص طور سے اس لڑکی ستارہ سے ہوشیار ہو۔“ پتا نہیں گوہر نے اس طرح کی دشمنی کیوں باندھ لی ہے، اللہ تم دونوں کی حفاظت کرے اور گوہر کو عقل دے۔“

عالیہ اور شمشاد کے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں کو شدید غصہ تھا۔

”میں ایک بار پھر باجی کے پاس جاؤں گی، نائلہ نے کہا۔

”میرے خیال میں کوئی فائدہ نہیں، وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گی۔“

شارب نے کہا لیکن نائلہ غصے میں بھری ہوئی گوہر کے پاس پہنچ گئی۔

”خوب پاپا کا نام روشن کر رہی ہیں آپ، کاش پاپا اس دنیا میں ہوتے اور آپ کے یہ کارنامے دیکھتے۔“

”پھر کوئی بکواس لے کر آ گئیں تم، اب تو بس یہ رہ گیا ہے کہ بس چوکیدار سے کہہ دوں کہ تمہیں اور تمہارے شوہر کو کوٹھی میں نہ گھسنے دیا جائے۔“ گوہر نے کہا۔

”کون روکے گا مجھے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”جی نہیں، اب یہ آپ کے باپ کا گھر نہیں ہے، تقسیم میں یہ میرے حصے میں آیا ہے۔ اب میں اس کی مالک ہوں۔“ گوہر نے کہا۔ ” ویسے میں تمہاری بڑی بہن ہوں میں نے ہمیشہ تمہاری بہتری کے بارے میں سوچا ہے۔“

”آپ ستارہ کو جانتی ہیں۔؟“

”اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتی ہوں، پاپا نے بہت غلط فیصلہ کیا تھا میں تو اس شادی کے حق میں ہی نہیں تھی۔ لیکن کیا کہوں عائشہ پھوپی پاپا کی مشیر تھیں انہوں نے ہمارے حق میں زہر پھیلایا۔“

”خدا سے ڈریں باجی۔ وہ ہمیشہ سے ہماری

خیر خواہ تھیں پتا نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

”بے وقوف ہو تم، نا سمجھ ہو۔ ان مردوں کو نہیں جانتیں، وہ میٹھی چھری ہے۔ بے انتہا چالاک انسان افسوس جبار انکل بھی مر گئے ورنہ میں ان کا گریبان پکڑ کر پوچھتی کہ اسے یہاں لانے کی کتنی قیمت وصول کی تھی انہوں نے۔“ وہ پورا پلان تھا وہ اسی لیے یہاں لائے تھے کہ کسی طرح وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو پھانس لے بس وارے نیارے ہو جائیں گے اس کے۔ دولت میں کھیلے گا۔ اور وہ کامیاب ہو گیا تم جیسی بے وقوف لڑکی اس کے جال میں پھنس گئی۔ سمجھیں تم۔“

”افسوس باجی، کتنی گھٹیا سوچ ہے آپ کی، پاپا چلے گئے، عائشہ پھوپی چلی گئیں انکل جبار چلے گئے اور آپ ان سب پر الزامات لگا رہی ہیں۔“

”زبان قابو میں رکھو، گھٹیا کا لفظ استعمال کیا ہے تم نے میرے لیے، ہوش میں رہو، آخر کار تم بھی چلی جاؤ گی اور تمہارے حصے کی ساری دولت اس کی ہو گی، اور اس کے بعد وہ ہو گا اور ستارہ۔ جانتی ہو ستارہ کو، جسے تم اپنا دیوتا بنائے بیٹھی ہو، وہ ایک گھٹیا سی لڑکی سے شادی کے عہد و پیماں کیے بیٹھا ہے۔ اسے صرف تمہاری موت کا انتظار ہے۔ اس کے بعد......“

”خدا سے ڈریں باجی، کتنا زہر بھرا ہے آپ کے اندر، آج مجھے اس کا اندازہ ہوا ہے، شارب ایسا نہیں ہے، وہ کبھی میرے خلاف نہیں ہو سکتا۔“

”افسوس تم کتنی بے وقوف ہو، تمہاری آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہو گا، جب تم بے بسی سے ہاتھ مل رہی ہو گی اور شارب اور اس کی دوسری بیوی تم پر ہنس رہے ہوں گے۔“

”اس کے بعد باجی۔ آپ کی طرف سے کوئی کہانی نہ کھڑی جائے آپ بھی خیال رکھیے۔“

”دھمکی دے رہی ہو مجھے۔؟“

”جو بھی سمجھ لیں، میں اب بھی آپ کا احترام کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر نائلہ وہاں سے چلی آئی۔ گھر آ کر اس نے شارب کو پوری سچائی سے ساری باتیں بتا دیں، شارب تلخی سے مسکرایا، پھر بولا۔

”بے کار تھا ان کے پاس جانا، میں ان کی فطرت جانتا ہوں۔ وہ اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آئیں گی۔“

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن عورت ’عورت‘ میں ہوتی ہے گوہر کی باتیں تو نائلہ کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں لیکن ایک نام اس کے ذہن میں ضرور چبھنے لگا تھا، ستارہ۔

☆☆☆

پھر ایک دن ستارہ آفس میں شارب کے پاس آئی۔ فرم میں اس کا تعلق دوسرے شعبے سے تھا شارب سے شاذ و نادر ہی اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ شارب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بس ایسے ہی چلی آئی، کچھ باتیں کرنی تھیں آپ سے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”کیسی باتیں؟“ شارب خشک لہجے میں بولا۔

”وہ جو زمانہ کر رہا ہے۔ یعنی ہمارا ذکر اور خود ہمیں ہی نہیں پتا، دنیا سے سن رہے ہیں۔“

”آپ کو معلوم ہے یہ آفس ہے۔“ شارب سرد لہجے میں بولا۔

”تو دعوت دیجیے نا کہیں اور۔ تا کہ آرام سے باتیں کریں۔“ ستارہ اٹھ کر بولی۔

”مس ستارہ آپ کی بکواس میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”پتہ نہیں کیا چکر ہے۔ لوگ کچھ کہہ رہے ہیں اور آپ کا رویہ کچھ اور ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں لوگ۔؟“

”یہی کہ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ ستارہ نے بے باکی سے کہا، وہ بدستور مسکرا رہی تھی، لیکن شارب کا دماغ بھک سے اڑ گیا، اس نے خشمگیں نظروں سے ستارہ کو دیکھتے ہوئے کہا،

”لوگ تو جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنی جگہ لیکن آپ کا شرم و حیا سے کوئی واسطہ نہیں، یہ آپ کس طرح کی بکواس کر رہی ہیں۔“

”میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہی شارب صاحب، میں تو وہ کہہ رہی ہوں جو لوگ کہہ رہے ہیں، میں آپ سے اس کی تصدیق چاہتی ہوں کیا آپ واقعی ایسا چاہتے ہیں۔“

”خدا نہ کرے، اور وہ کون لوگ ہیں جو یہ فضول بکواس کر رہے ہیں، اور میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کس کی آلہ کار ہیں، لیکن جس نے اس کھیل کا آغاز کیا ہے اس سے کہہ دیجیے کہ اسے ذلیل ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔“

”میں کسی کی آلہ کار نہیں ہوں شارب صاحب، بس یہ سن کر آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، ویسے یہ خبر میرے لیے بہت دلکش تھی۔“

”جائیے آپ یہاں سے، روز آئندہ میرے کمرے میں قدم نہ رکھیے۔“

”اوہ، چلی جاتی ہوں، لیکن خبر بری نہیں تھی، اگر آپ کے دل میں واقعی ایسا کوئی خیال آئے تو میری طرف سے ہاں سمجھیے!“ ستارہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی، لیکن شارب سخت پریشان ہو گیا، اسے یہ تو یقین تھا کہ یہ حرکت بھی گوہر ہی کی ہے گوہر نے کسی طرح ستارہ جیسی بد فطرت لڑکی سے رابطہ کر کے یہ کھیل کھیلا ہے لیکن اب کیا کیا جائے۔ گوہر کی حرکتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں، شام کو گھر آیا تو بہت الجھا ہوا تھا جیسے محسوس کر کے نائلہ نے اس سے وجہ پوچھی، تو شارب نے اسے پوری تفصیل بتائی۔ نائلہ غصے سے کھول گئی۔

”اب تو باجی حد کر رہی ہیں، وہ سارے رشتے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں، ٹھیک ہے، میں ایک بار اور ان سے مل کر ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم کر دوں گی اور انہیں وارننگ دے دوں گی کہ پھر ہم بھی جوابی کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے۔“

”ہم جوابی کارروائی کیا کریں گے۔“ شارب ہنس کر بولا۔

”میں کہنا تو نہیں چاہتی، لیکن اب مجبوری ہے، میں عورت ہوں اور عورت کتنی ہی معصوم کیوں نہ ہو مرد کی آنکھ اور دوسری عورت کا مزاج پہچانتی ہے، باجی آپ پر قبضہ جمانے کی کوشش میں ناکام ہو کر یہ تمام حرکتیں کر رہی ہیں، انہیں ہماری خوش گوار زندگی برداشت نہیں ہو رہی اور ستارہ جیسی عورتیں یہ آسانی کرائے پر مل جاتی ہیں۔“

”لعنت بھیجو، بس ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد رکھنا چاہیے۔“ شارب نے کہا۔

”مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے شارب۔“ نائلہ نے کہا۔

☆☆☆

ستارہ آفس میں نظر آتی تھی لیکن اس نے دوبارہ شارب کے پاس آنے کی جرأت نہیں کی تھی، وہ منہ بنائے اس کے سامنے سے گزر جاتی تھی۔ پھر ایک دن جب شارب آفس گیا ہوا تھا گھر پر نائلہ تنہا تھی کہ ڈور بیل بجی، دروازہ کھلنے پر نائلہ نے ایک اسمارٹ اور تیز و طرار سی لڑکی کو دیکھا۔

”ایکسکیوزمی، آپ مسز شارب ہیں۔؟“

”جی، آپ کون۔“

”میرا نام ستارہ ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

نائلہ کے دماغ میں چھنا کہ ہوا۔ تو یہ ہے ستارہ، اس نے سوچا۔ آپ مجھے کچھ وقت دیں گی۔ ستارہ نے کہا۔

”آئیے، نائلہ نے اسے راستہ دیتے ہوئے کہا اور ستارہ اندر آ گئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“

”آپ کا گھر تو بے حد خوب صورت ہے، مجھے پتا ہے کہ یہ آپ کو جہیز میں ملا ہے کیونکہ آپ ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ہیں۔“

”تشریف رکھیے، ویسے آپ کو میرے بارے میں کافی معلومات ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”ہاں، اس کی دو دو وجوہات ہیں، اول تو یہ کہ میں شارب صاحب کے ساتھ ان کے آفس میں کام کرتی ہوں، دوسری یہ کہ آپ کی بڑی بہن گوہر صاحبہ

سے میرے گہرے تعلقات ہیں۔''

''بہت خوب۔'' نائلہ نے کہا۔

'' شارب صاحب اور میں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''آپ ان کے آفس میں نوکری کرتی ہیں۔''

''جی۔''

'' آپ کو ضرور علم ہوگا کہ اس وقت وہ آفس میں ہوتے ہیں، آپ یہاں کیسے آئی ہیں اور آپ آج اپنے آفس کیوں نہیں گئیں۔''

'' مجھے علم ہے کہ شارب اس وقت آفس میں ہوں گے اور میں نے صرف آپ سے ملاقات کے لیے آفس سے چھٹی کی ہے۔''

''بہت خوب۔ فرمایئے۔''

'' میں آپ کچھ بتانا چاہتی ہوں کہ شارب صاحب مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے بری طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لیکن میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ دیکھئے نا ایک شادی شدہ مرد سے شادی کرنا جان کو عذاب میں ڈالنا ہے، میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی پہلی بیوی کو چھوڑنا ہوگا۔''

''کھڑی ہو جایئے۔ نائلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ساتھ میں ہاتھ سے اشارہ کیا اور ستارہ نہ سمجھنے والے انداز میں کھڑی ہوگئی۔''

''میں کہیں بھی۔ اس نے کہا لیکن نائلہ نے اس طرح ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے مارنے کے لیے کچھ تلاش کر رہی ہے، ستارہ کچھ گھبرا سی گئی، پھر بولی ''آپ نے پوری بات نہیں سنی۔''

''میں کہتی ہوں عزت سے چلی جایئے آپ یہاں سے ورنہ۔۔۔''

''اوہ جا رہی ہوں، آپ کوئی تکلیف نہ کیجیے ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ اپنے شوہر کو سمجھایئے ورنہ۔۔۔''

''آپ جایئے یہاں سے۔: نائلہ دروازے کی طرف اشارہ کر کے چیخی۔''

''او کے، او کے آپ ہی جیسی عورتیں شوہر کو کھو دیتی ہیں، وہ میرے پیچھے پڑے ہیں میں نہیں۔'' یہ کہہ کر ستارہ باہر نکل گئی۔

نائلہ کے پیروں کی جان نکل رہی تھی، وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھی اور صوفے پر بیٹھ گئی، اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا، کچھ لمحے کے لیے عقل ساتھ چھوڑ گئی تھی، دل میں شکوک و شبہات جنم لے رہے تھے لیکن اس نے ذہن کو جھٹک دیا، نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، شارب ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، پھر یہ عورت کیا چاہتی ہے، کیا چاہتی ہے یہ، کچھ رقم...... بلیک میلنگ ......صورت میں سے شیطان صفت نظر آتی ہے۔ اور۔ اور۔ اس نے کھل کر کہا ہے کہ وہ باجی کو جانتی ہے بلکہ اس نے کہا ہے کہ ان سے اس کے گہرے تعلقات ہیں، اوہ بات صاف ہوگئی، وہ گوہر کی ستارہ ہے، گوہر نے اب یہ پینترہ بدلا ہے۔

واہ ابو جی، یہ ترکہ چھوڑا ہے آپ نے میرے لیے ایک ہی بہن، وہ بھی اتنی بڑی دشمن کہ پوری زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے، صرف اس لیے کہ اس کی شادی شارب سے نہیں ہوئی، یہ تو شارب کا فیصلہ تھا، ان کا دل باجی سے نہیں ملا، وہ اگر چاہتے تو باجی کو پسند کر سکتے تھے، اس میں میرا کیا قصور ہے۔

پھر اسے ستارہ کا خیال آیا، کتنی شاطر عورت ہے، کس طرح ہاتھ اور آنکھیں نکا نکا کر بات کرتی ہے، گوہر سے اس کا کیا گٹھ جوڑ ہے ان کے درمیان کیا معاہدہ ہے، اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی، گوہر کے پاس کروڑوں روپیہ بے کار پڑا ہے، وہ اپنی نفرت کی تکمیل کے لیے کچھ بھی خرچ کر سکتی ہے، اور ستارہ جیسی لڑکی کو گوہر نے بڑی مشکل سے دریافت کیا ہوگا، مزے کی بات یہ تھی کہ اسے ستارہ جیسی شاطر اور آوارہ لڑکی مل گئی تھی۔

☆☆☆

شام کو جب شارب آفس سے آیا تو اس نے معمول کے مطابق سب کچھ کیا۔ شارب کو کسی غیر معمولی بات کا کوئی شک نہیں ہوا، لیکن جب وہ چائے وغیرہ سے فارغ ہو گیا تو اس نے کہا۔

''وہ کمبخت آج یہاں آئی تھی۔''

''کون؟ شارب نے روا روی سے پوچھا۔

''ستارہ۔''

''کیا۔'' شارب اچھل پڑا۔ ''ستارہ۔ یہاں؟ ہمارے گھر۔؟''

''ہاں، اتنے پریشان کیوں ہو گئے، اس جیسی دس عورتیں اور بھی آ جائیں تو ہمارے درمیان رخنہ نہیں ڈال سکتیں، نائلہ نے پیار سے مسکراتے ہوئے کہا۔''

''وہ بے غیرت یہاں تک آ گئی کیا کہہ رہی تھی۔''

نائلہ نے ستارہ کی کہی ہوئی ساری باتیں دہرا دیں شارب کا چہرہ دہکنے لگا تھا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''بات اب خطرناک حد میں داخل ہوگئی ہے نائلہ تمہارا شکریہ کہ تم مجھ پر اس قدر اعتماد کرتی ہو، تمہاری جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو آسانی سے بہک سکتی تھی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گوہر ہماری زندگی کو ہر قیمت پر تباہ کرنا چاہتی ہیں انہوں نے اس عورت کو بھاری معاوضے کا لالچ دے کر اس سازش پر آمادہ کیا ہوگا، تمہاری وجہ سے میں گوہر کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن ستارہ کو میں ضرور پولیس کے حوالے کروں گا۔''

''نالو شارب، کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے، ہم دونوں کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہے، بات پھیلے گی ہمارے نام بھی آئیں گے بدنامی ہوگی۔''

''میں اس سے بات ضرور کروں گا اسے پوچھوں گا کہ کتنے پیسے لیے ہیں اس نے گوہر صاحبہ سے ویسے میں کیا کہوں ان گوہر باجی کو' دل تو چاہتا ہے کہ انہیں سزا دوں۔''

''نہیں پلیز۔ وہ پھر بھی میری بہن ہیں، البتہ میرا خیال ہے ہم عالیہ باجی اور شمشاد بھائی جان کو ان تمام باتوں سے آگاہ کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا، وہ ہمیں بہتر مشورہ بھی دیں گے۔''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔: ویسے وہ اگر میری غیر موجودگی میں دوبارہ کبھی آئے تو تم فوراً مجھے فون کرنا۔''

''بہت مشکل ہے دوبارہ اس کا آنا، میں نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔'' نائلہ نے ہنس کر کہا۔

☆☆☆

شمشاد بہت اچھا انسان تھا، ہمدرد اور غمگسار ایک کال پر عالیہ کے ساتھ دوڑا چلا آیا، نائلہ نے انہیں ستارہ کے بارے میں پوری تفصیل بتائی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔

''خدا کی پناہ، ایک سگی بہن، چھوٹی بہن کے خلاف ایسی سازشیں کر رہی ہے۔ لیکن تم نے ہمیں پہلے یہ باتیں کیوں نہیں بتائیں۔

''بس شرمندہ بھی ہوں کہ میری بہن اتنی بری ہے۔''

''یار ایک کام کیوں نہ کریں۔'' شمشاد نے کہا۔

''کیا۔ عالیہ بولی۔''

''کیوں نہ گوہر بہن کی شادی کسی اچھی جگہ کرا دیں۔'' میرے خیال میں ان کی تنہائی دور ہو جائے تو وہ نارمل ہو جائیں گی۔''

''نہیں شمشاد بھائی، آپ کتنے معصوم ہیں، کیا وہ ہمارے کہنے سے شادی کر لیں گی، جہاں ان کی شادی ہوئی تھی وہ بہت اچھے لوگ تھے انہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی وہ وہاں نہ رہ سکیں تو اور کہاں رہیں گی، اور سچ بات یہ ہے کہ اب مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے، انہوں نے میرے ساتھ جو کیا ہے وہ کافی ہے میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ اپنے طور پر زندہ رہیں اور ہمیں تنگ نہ کریں۔''

''ان سے تو میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن اس ستارہ کو میں پولیس کے حوالے ضرور کروں گا، گوہر اسے کتنا دیں گی اس کی نوکری بھی جائے گی۔''

''نہیں اتنی دور نہ جاؤ۔ سارا خاندان ملوث ہو جائے گا، اور پھر تمہارے دفتر میں تمہاری نیک نامی بھی متاثر ہوگی۔'' کافی دیر تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی لیکن کوئی حل نہیں نکلا تھا البتہ دوسرے دن نائلہ نے گوہر کو فون کیا۔

''آپ جو کچھ کر رہی ہیں وہ میرے حق میں تو خیر کیا۔ آپ کے حق میں برا ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے۔؟'' گوہر نے طنزیہ پوچھا۔

''میں شارب کو آپ کے خلاف کچھ کرنے سے نہیں روک سکوں گی سوچ لیجیے۔''

'' ہونہہ شارب۔ اس نے ساری زندگی ہمارے ٹکڑوں پر گزاری ہے اور تمہیں بے وقوف بنا کر اب ایک دولت مند آدمی بن گیا ہے، اس سے کہو جتنی نمک حرامی کر سکتا ہے کرے۔''

''اللہ نے آپ سے شرم و حیا چھین لی ہے تو اسے کوئی واپس نہیں لا سکتا شارب نے ہماری دولت پر تھوکا بھی نہیں ہے وہ اب بھی نوکری کر کے گھر چلا رہے ہیں حالانکہ انہیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ اتنی تنخواہ اپنے دس نوکروں کو دے سکتے ہیں۔''

''اپنے دس نوکروں کو؟'' گوہر ہنس کر بولی۔ ''یا غوری صاحب کی فرم کے نوکروں کو۔''

''ہوش میں آ جائیں باجی۔ ہوش میں آ جائیں۔ آپ نے ستارہ سے جو گٹھ جوڑ کیا ہے وہ آپ کے لیے مصیبت زین جائے۔''

''ستارہ سے میں نے گٹھ جور کیا ہے، بی بی وہ تمہارے شوہر کی منظور نظر ہے، اپنے گھر کو بچاؤ، اور اب اپنی یہ بکواس بند کرو میں تمہاری صورت تو کیا تمہاری منحوس آواز بھی نہیں سننا چاہتی۔''

''تو پھر غور سے سن لو باجی، میں بھی سارے رشتے توڑ رہی ہوں، سب سے پہلے میں تمہاری اس ایجنٹ کو پولیس کے حوالے کر رہی ہوں جو پولیس کو بیان دے گی کہ تم نے اسے کتنے پیسوں کے بدلے شارب کے پیچھے لگایا تھا۔''

''زبردست، وہ یہ بیان نہیں دے گی کہ میں نے اسے تمہارے پیچھے لگایا ہے بلکہ یہ بتائے گی تمہارا شوہر اسے مسلسل دھوکا دے رہا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے گا اور اس نے بے چاری ستارہ کی زندگی برباد کی ہے، اخبارات کو بہترین سرخیاں مل جائیں گی غوری صاحب کی بیٹی کا نام بھی آئے گا۔''

''بیٹی کا نہیں بیٹیوں کا، اور یہ الزام ثابت نہ ہونے پر جب ستارہ کو پولیس کے ڈنڈے پڑیں گے تو وہ صاف گوہر بیگم کا نام لے گی، کس ہوا میں ہیں گوہر صاحبہ، یہ سائنسی دور ہے اور اب کسی پر ایسے فضول الزام لگا کر انہیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔''

''شٹ اپ، جو کر سکتی ہو کرو۔'' گوہر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

ایک ہفتے تک مکمل خاموشی رہی ستارہ آفس میں بھی شارب کے سامنے نہیں آئی تھی، پھر ایک دن دوپہر کے وقت شارب کو انٹرکام پر اطلاع ملی کہ نورا لعین نامی کوئی خاتون اس سے ملنے آئی ہے۔

''وجہ بتائی، آفس کا کوئی کام ہے۔''

''میں نے پوچھا تھا سر، نہیں وہ کہتی ہیں ذاتی کام ہے اور بہت ضروری ہے۔'' ریسپشنسٹ لڑکی نے بتایا۔

''ذاتی کام ہے!'' شارب نے پریشان لہجے میں کہا وہ اس نام کی کسی عورت یا لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔

''بتائیے سر۔!'' ریسپشنسٹ نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھیج دو۔'' شارب نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کچھ لمحوں کے بعد ایک نوجوان لڑکی اندر داخل ہوگئی۔ وہ ایک خوش شکل اور اسمارٹ لڑکی تھی۔

''آئیے۔ تشریف رکھیے'' شارب نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''شکریہ جناب'' لڑکی نے شائستگی سے کہا اور شارب کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جی۔ فرمائیے؟'' شارب بولا۔

''میرا نام نورالعین ہے، میرے شناسا مجھے نور کے نام سے پکارتے ہیں۔''

''جی۔!''

''میں ستارہ کی دوست ہوں۔ ستارہ میرے ساتھ میرے فلیٹ میں۔ رہتی ہے اور۔۔۔''

شارب کے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی، ستارہ کا نام پھر سے اس کے سامنے آیا تھا، آنے والی

لڑکی کے رکھ رکھاؤ سے وہ متاثر ہوا تھا، لیکن یہ جان کر کہ وہ ستارہ کی دوست ہے اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''آپ میرے پاس آئی ہیں ایک مہمان کی حیثیت سے آپ کا احترام کر رہا ہوں۔ ورنہ مجھے ستارہ یا اس کے کسی شناسا سے کوئی سروکار نہیں ہے، آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہیں۔؟''

''آپ کو علم ہے وہ کئی روز سے آفس نہیں آ رہی۔؟''

''آپ بولتی رہیے۔'' شارب خشک لہجے میں بولا۔

''وہ بہت بیمار ہے، آپ کو بہت یاد کر رہی ہے، براہ کرم آپ کسی وقت میرے فلیٹ پر آ کر اس سے مل لیجیے، یہ میرا پتا ہے۔'' اس نے ایک کارڈ نکال کر شارب کے سامنے رکھ دیا۔

''میڈم نور۔ ستارہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بیمار ہو یا صحت مند مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے میں اس کے لیے کوئی برا لفظ نہیں استعمال کرنا چاہتا بس یوں سمجھ لیجیے میرے لیے وہ ایک غیر اور ناپسندیدہ وجود ہے۔''

''آپ غلط کہہ رہے ہیں شارب صاحب، میں ستارہ کی بیسٹ فرینڈ ہوں اور ہم ایک دوسرے کے گھر کے رازدار ہیں، اگر آپ اس خیال سے یہ باتیں کر رہے ہیں کہ کہیں میں کسی کے آگے زبان نہ کھول دوں تو بے فکر رہیں آپ دونوں کے راز میرے سینے میں رہیں گے، آپ پلیز مجھ پر پورا بھروسا رکھیے۔''

''مجھے آپ پاگل معلوم ہوتی ہیں، میں آپ سے مسلسل کہہ رہا ہوں کہ میرا اس جرائم پیشہ عورت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور آپ اپنی کہانی سنائے جا رہی ہیں اس سے پہلے کہ میرا ٹمپر لوز ہو جائے آپ یہاں سے جائیے۔'' شارب بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کی مرضی میں جا رہی ہوں، لیکن ایک بات آپ کو بتاتی جاؤں، مجھے آپ کے پاس ستارہ نے نہیں بھیجا میں خود سے آئی ہوں مجھ سے ستارہ کی حالت دیکھی نہیں گئی تو میں آپ کو اس کے بارے میں بتانے آ گئی اس میں ستارہ کا کوئی قصور نہیں ہے اس نے مجھے آپ کے پاس نہیں بھیجا تھا۔''

''مس نور۔ یا آپ جو کوئی بھی ہیں، میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ فوراً یہاں سے چلی جائیے اور دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کیجیے۔''

''آپ میری کتنی بھی بے عزتی کر لیں لیکن وہ میری دوست ہے، میں اس کے لیے آپ کی منت کرتی ہوں کہ آپ صرف ایک بار اس سے مل لیں اس کی حالت بہت خراب ہے۔''

شارب نے بیل کا بٹن دبایا تو چپراسی اندر آ گیا ''مس صاحبہ کو باہر چھوڑ دو اور انہیں پہچان لو۔ دوبارہ یہ کبھی آئیں تو انہیں باہر سے ہی بھگا دینا۔''

''جی سر۔ آئیے میڈم۔'' چپراسی نے کرخت لہجے میں کہا اس نے شارب کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ خوب صورت لڑکی شارب کے لیے ناپسندیدہ شخصیت ہے اس کے بعد نور کی کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے شارب کو دیکھتی باہر نکل گئی۔

شارب کے بدن میں چنگاریاں دوڑ رہی تھیں، وہ جانتا تھا کہ یہ سارے کھیل گوہر کے ہیں، اس کے پاس کروڑوں کی دولت بے کار پڑی ہے اور کوئی کام نہیں ہے، شارب کو حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اب وہ اس کی اور نائلہ کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے، ستارہ کے بعد اس نے نور کو بھی خرید کر اس کام پر لگا دیا تھا۔

شام کو گھر جا کر اس نے گوہر کے اس نئے شوشے کے بارے میں بتایا تو نائلہ کا چہرہ اتر گیا، اس کی آنکھوں میں شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے، اتفاق سے تھوڑی دیر کے بعد شمشاد اور عالیہ بھی ان سے ملنے آ گئے تو شارب نے انہیں بھی نور کے بارے میں بتایا۔

''ہم لوگ تمہارے معاملات میں پوری طرح الجھے ہوئے ہیں مگر ہم نے ان کا حل دریافت کر لیا ہے۔'' شمشاد نے کہا تو دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''حل۔؟''

''ہاں۔ بہت سادہ' بے حد آسان۔'' شمشاد نے کہا۔

"بتائیے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ساری حرکتیں گوہر صاحبہ کررہی ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ دس نور، اور دس ستارائیں اور تیار کرلیں وہ کون تمہارا کیا بگاڑے گا، بات تم دونوں کے آپس کے اعتماد کی ہے، اگر تم دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسا ہے تو بس بات ختم، کوئی کتنی ہی ستارائیں، اور نور بھیج دے، تم جوتے کی نوک پر مارو اور ایک پر اعتماد زندگی گزارو۔"

دونوں نے اس بات سے اتفاق کیا اور کسی حد تک مطمئن ہوگئے کافی دنوں تک کوئی نئی بات نہیں ہوئی اس طرح میں بائیس دن خاموشی سے گزر گئے

☆☆☆

پھر اس ان شار کا وقت تھا کہ نائلہ کے موبائل پر کال آئی کوئی ان نون نمبر تھا، نائلہ نے فون ریسو کیا تو گوہر کی آواز سنائی دی۔ دوسری طرف گوہر تھی۔

"نائلہ میں گوہر بول رہی ہوں۔" نائلہ دنگ رہ گئی، گوہر کے لہجے میں ایک بہن کا پیار تھا، بمشکل نائلہ کے منہ سے نکلا۔

"جی باجی"

"تم اس وقت کیا کررہی ہو"

"کچھ نہیں۔"

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، ایک ضروری کام ہے۔"

"مجھ سے۔" نائلہ کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

"ہاں نائلہ، ہم کتنی دور ہوگئے ہیں، کتنی دیواریں حائل ہوگئی ہیں ہمارے درمیان، آخر کیوں، ہم ایک ہی خون ہیں۔"

"اس کا جواب میں دوں باجی۔؟"

"میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں، گوہر کے لہجے میں پیار تھا، نائلہ کو کشمکش میں دیکھ کر شارب نے اشارے سے پوچھا کہ کیا بات ہے، نائلہ نے موبائل پر ہاتھ رکھ کر اسے صورت حال بتائی اور پوچھا کہ کیا جواب دوں۔؟"

شارب خود کشمکش میں پڑ گیا، پھر اس نے اشارہ کیا کہ اسے آنے دیا جائے اس وقت دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کس سوچ میں ڈوب گئی نائلہ۔؟"

"مجھے حیرت ہوئی ہے باجی۔"

"پاپا کو خواب میں دیکھا تھا، رو رہے تھے، میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو ناراضی سے منہ پھیر لیا، گوہر گلوگیر لہجے میں بولی اور نائلہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔"

"آپ آجائیے باجی۔" اس نے بھی بھاری آواز میں کہا، شارب کی اجازت بھی مل گئی تھی اور بہن کی پیار بھری آواز سن کر ماضی بھی یاد آگیا تھا۔

شارب بھی حیران نظروں سے نائلہ کو دیکھ رہا تھا، پھر اس نے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"انہوں نے پاپا کو خواب میں دیکھا تھا۔ آخر کار ہمارا خون ایک ہے خیال آگیا ہوگا۔" نائلہ نے بدستور بھاری آواز میں کہا اس کے بعد شارب کچھ نہیں بولا۔ بیوی کے جذبات کا خیال تھا لیکن اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ گوہر جیسی سنگدل عورت ایسے جذبات کا شکار ہوگئی ہے تھوڑی دیر کے بعد گوہر ان کے گھر پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ نائلہ اور شارب نے بھی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا، نائلہ تو کافی روئی تھی، گوہر نے شارب سے بھی اپنائیت سے بات کی تھی۔ پھر اس نے شارب سے کہا۔

"ہمیں کچھ تنہا وقت دوگے شارب، ہم کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ نائلہ نے اضطراب سے شارب کو دیکھا لیکن شارب نے جلدی سے کھڑے ہوکر کہا۔

"ضرور۔ میں چلتا ہوں۔"

"ارے نہیں، آپ بیٹھیں ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔"

نائلہ نے کہا۔"

"ایک ہی بات ہے، شارب بولا، اور کمرے سے باہر نکل گیا، گوہر نے نائلہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوتے کہا۔"

"تم نے اپنا وزن کافی بڑھا لیا ہے۔"

"بس باجی، شادی کے بعد ایسا ہو جاتا ہے، آپ کیسی ہیں۔؟"

"ٹھیک ہوں، تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"جی باجی!"

"میں تنہا زندگی سے اکتا گئی ہوں، اب شادی کرنا چاہتی ہوں، گوہر نے کہا اور نائلہ خوشی سے اچھل پڑی۔"

"ہائے باجی، بہت بڑی خوش خبری ہے میرے لیے میں تو کب سے ہی چاہتی تھی، مجھے بتائیے کسے پسند کیا ہے آپ نے کون ہے وہ میں فوراً اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ارے رے رے، کہاں دوڑ پڑیں، میں نے کسی کو پسند نہیں کیا ہے، میرے لیے یہ کام تمہیں اور شارب کو کرنا ہے۔"

"اوراچھا، لیکن باجی، ہم آپ کے معیار تک کہاں پہنچ سکیں گے، آپ خود کسی کو پسند کرکے باقی ڈیوٹی ہماری لگادیں۔"

"تم جانتی ہو نائلہ' میری کوئی سوشل لائف نہیں ہے، تنہا گھر میں پڑی رہتی ہوں' لیکن اب اکتا گئی ہوں میرا یہ کام تمہیں اور شارب کو کرنا ہے، بس کوئی معقول انسان ہو۔"

"ٹھیک ہے باجی، ہم خوشی سے یہ کام کریں گے۔"

"شکریہ چائے نہیں پلاؤ گی۔"

"ابھی بنا کر لاتی ہوں"

"کیا مطلب، کوئی ملازم نہیں ہے"

"میں خود ملازم ہوں، شارب میرے ہاتھ کا کھانا پسند کرتے ہیں، اور پھر مجھے گھر میں اور کوئی کام بھی نہیں ہے، آتی ہوں ابھی، نائلہ جلدی سے چائے بنا کرلے آئی۔"

"کچھ کھلاؤ گی نہیں، بس کوئی اچھی سی چیز۔: گوہر نے کہا۔"

"ابھی لائی، نائلہ کو بہن کے آنے کی بہت خوشی تھی، وہ فریج سے چند چیزیں نکال کرلے آئی، دونوں کچھ دیر باتیں کرتی رہیں پھر گوہر رک گئی۔"

"چلتی ہوں، تم میری بات کا خیال رکھنا، گوہر جاتے ہوئے شارب سے بھی سرسری ملی پھر چلی گئی، نائلہ خوشی کے عالم میں شارب کو تفصیل بتانے لگی لیکن شارب نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔"

"میں جانتی ہوں شارب کہ باجی نے ہمیں بہت تکلیفیں دی ہیں، لیکن پلیز، میری وجہ سے انہیں معاف کردو۔ ہم دو ہی بہنیں تو ہیں بس۔"

"میں ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں نائلہ۔" شارب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

نائلہ دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئی، شارب آفس کے کچھ کام لے کر بیٹھ گیا، وہ ان کاموں میں مصروف تھا کہ اچانک، دروازے سے نائلہ اندر داخل ہوئی، اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید پڑا ہوا تھا آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور پاؤں بری طرح لڑکھڑا رہے تھے، بمشکل تمام اس نے کہا۔

"شش۔ شا۔ رب۔ میرا دم۔ گھٹ رہا ہے۔۔۔۔ سانس رک رہا ہے۔" وہ دو قدم آگے بڑھی اور پھر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔

شارب بری طرح وحشت زدہ ہوگیا، کچھ لمحے تو اس کے حواس ساتھ نہ دے سکے، لیکن پھر اس نے ایمبولینس کے لیے فون کیا اور نائلہ کو اسپتال لے گیا، اسپتال کی ایمرجنسی میں ڈاکٹر نائلہ کے گرد جمع ہوگئے، اس کا معائنہ کیا گیا۔ اور بڑے ڈاکٹر نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

"سوری سر۔ شی از ایکسپائر۔"

شارب کی سمجھ میں ڈاکٹر کے الفاظ ہی نہیں آئے۔ وہ بار بار ڈاکٹر سے پوچھنے لگا۔" آپ نے کیا کہا ڈاکٹر۔ آپ نے کیا کہا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، وہ سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں کھو بیٹھا تھا۔ اسپتال ہی سے ایک ہمدرد ڈاکٹر نے اس سے اس کی بہن بہنوئی کا نمبر لے کر انہیں فون کیا اور عالیہ اور شمشاد اسپتال پہنچ گئے، شمشاد نے گوہر کو فون کرنا ضروری سمجھا اور گوہر بھی اسپتال پہنچ

گئی، ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق موت حرکت قلب بند ہونے سے ہوئی تھی، گوہر پر غشی کے دورے پڑنے لگے، وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی جب بھی ہوش میں آتی نائلہ نائلہ پکار کر روتی اور دوبارہ بے ہوش ہو جاتی۔

دوسری طرف شارب پر جیسے بجلی گر پڑی تھی، اسے کچھ ہوش نہیں تھا کروڑ پتی باپ کی بیٹیاں تھیں شمشاد کی کوششوں سے پوسٹ مارٹم کے بغیر لاش ورثاء کو دیدی گئی۔ نائلہ کی تدفین ہوگئی اور شارب تاریک راستوں پر اکیلا بھٹکنے لگا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

نائلہ کی موت کو نو دن ہوئے تھے کہ ایک دن علاقے کے تھانے کے ایس آئی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آئے۔

''شارب صاحب۔''

''جی۔ شارب نے جب سے پولیس کو دیکھا۔''

''آپ کو تھانے چلنا ہے، براہ کرم ہمارے ساتھ چلیں۔'' تھانے جا کر شارب کو پتہ چلا کہ گوہر نے اعلا حکام کو درخواست دی ہے کہ اس کی بہن کو اس کے شوہر شارب احمد نے زہر دے کر ہلاک کیا ہے اور درخواست کی ہے کہ مرحومہ کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے، ان کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔ آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اس وقت تک جب تک زہر دینے کی تصدیق نہ ہو جائے اب کہیں نہیں جائیں گے ابھی آپ کے خلاف ایف آئی آر نہیں ہوئی ہے اس نے آپ کو یہ رعایت دی جا رہی ہے۔ شارب پر دوسری کاری ضرب پڑی، گھر آ کر اس نے شمشاد کو فون کیا۔ دونوں بے چارے حواس باختہ شارب کے پاس آ گئے وہ بھی یہ سن کر دنگ رہ گئے تھے۔

''اس سے ایسی ہی امید کی جا سکتی تھی۔'' شمشاد نے کہا عالیہ رونے لگی تھی۔ شمشاد نے کہا۔ رونے سے کام نہیں چلے گا عالیہ! اس ذلیل عورت نے کس بنیاد پر ہی یہ کارروائی کی ہے اللہ رحم کرے، بہن کی موت کے بعد بھی اسے صبر نہیں آیا۔ اب وہ شارب کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔''

''میں اسے فون کرتی ہوں۔'' عالیہ نے کہا اور پھر اس نے گوہر کو فون کیا۔

گوہر اس کی آواز سنتے ہی بھڑک اٹھی۔

''کر دیا ختم میری بہن کو، تقدیر بدل گئی نا تم فقیروں کی۔ کتنا لمبا جال پھینکا تھا تم نے میرے باپ کی دولت ہتھیانے کے لیے اف میرے خدا! میری ایک ہی بہن تھی مار دیا تم لوگوں نے اسے مگر میں بھی گوہر ہوں، بدلہ لوں گی تم سے دیکھتی ہوں وہ آوارہ انسان جو دوسری شادی کرنے کے لیے میری بہن کی جان لینے سے بھی نہیں چوکا، کیسے بچتا ہے، سزائے موت دلوا کر رہوں گی اسے۔ اس نے میری بہن کو زہر دیا ہے۔''

''خدا سے ڈرو گوہر تم جوش رقابت میں پاگل ہو گئی ہو۔ خدا کے لیے یہ نہ کرو۔ خدا کے لیے۔''

''اب تمہارے پاگل ہونے کی باری ہے عالیہ جس طرح میری بہن اس دنیا میں نہیں رہی ہے اس طرح تمہارا بھائی بھی نہیں رہے گا، میں اپنی بہن کے قاتل کو شادی کے شامیانے سجانے کے بجائے پھانسی کے پھندے تک پہنچاؤں گی۔ اس نے میری بہن کو زہر دے کر مارا ہے، میں اس کی لاش نکلوا کر پوسٹ مارٹم کراؤں گی وہ آوارہ شخص دوسری عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔''

''خدا کے لیے گوہر۔ خدا کے لیے ایسی خوف ناک باتیں مت کرو۔ میرا ایک ہی بھائی ہے۔'' عالیہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''میری بھی ایک ہی بہن تھی جسے اس اوباش قاتل نے ہلاک کر دیا۔ نہیں چھوڑوں گی میں اسے بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور عالیہ فون کو گھورتی رہ گئی۔ عالیہ نے موبائل کا اسپیکر کھول رکھا تھا۔ اس کی باتیں شمشاد اور شارب نے بھی سنی تھیں، شارب کا چہرہ تو سپاٹ رہا تھا لیکن شمشاد کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔''

''خدا خیر کرے، یہ عورت ناگن سے زیادہ

زہریلی ہے۔''

☆☆☆

گوہر تیز رفتاری سے کام کر رہی تھی، اس کا پیسہ لڑ رہا تھا، قبر کھودنے کے احکامات ملے، لاش نکالی گئی پوسٹ مارٹم ہوا، اور تصدیق ہوگئی کہ نائلہ کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے، پولیس نے ایف آئی آر درج کی اور شارب کو گرفتار کر لیا گیا، گوہر نے موقف اختیار کیا تھا کہ اس کو شارب کی محبوبہ ستارہ کی زبانی پتہ چلا تھا کہ شارب نے نائلہ کو زہر دے کر ہلاک کیا ہے۔

فرسٹ انفارمیشن رپورٹ میں گوہر نے بتایا کہ شارب ستارہ نامی لڑکی سے شادی کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا لیکن ستارہ نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اس سے صرف اس شرط پر شادی کرے گی کہ وہ نائلہ کو طلاق دے دے۔

لیکن وہ نائلہ کو طلاق نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں وہ اس کی ساری دولت سے محروم ہو جاتا، نائلہ کو چھوڑ دینے کی صورت میں وہ اس دولت میں سے کچھ نہیں لے سکتا تھا، چنانچہ اس نے نائلہ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا، پھر کچھ دن غم زدہ ہونے کی اداکاری کر کے اس نے بڑے فخر سے اپنی محبوبہ ستارہ کو بتا دیا کہ اس کے پیار میں اس نے نائلہ کو زہر دے کر راستے سے ہٹا دیا، ستارہ اس کے آفس میں ہی کام کرتی ہے۔ وہ خوف سے کانپ کر رہ گئی، اس نے سوچا کہ جو شخص اس کے لیے اپنی بیوی کو قتل کر سکتا ہے وہ اپنی اوباش فطرت کے تحت کسی دوسری لڑکی کے لیے اسے بھی قتل کر سکتا ہے وہ بے حد خوف زدہ ہو کر گوہر کے پاس پہنچ گئی اور اس نے گوہر کو سب کچھ بتا دیا۔

شارب کے خلاف تفتیش کا آغاز ہو گیا، بے چارے عالیہ اور شمشاد نے دن رات ایک کر دیے، مسرور احمد بستر سے لگ گئے تھے، ان کی بیگم اور وہ ملازم ان کی خدمت کر رہے تھے لیکن یہ روح فرسا خبر انہیں سنانے کا مطلب تھا کہ ایک اور غمناک سانحہ رونما ہو جائے چنانچہ انہیں بتایا گیا کہ اچانک شارب کو فرم کی طرف سے امریکہ بھیجا گیا ہے فرم کے ایک ایمرجنسی کام سے اسے جانا پڑا ہے، نائلہ بہن کے ساتھ چلی گئی ہے۔ مسرور احمد اور بیگم حیران رہ گئے تھے۔

''مجھ سے مل کر بھی نہیں گیا، کب تک واپسی ہوگی۔''

''وقت ہی نہیں ملا۔ اگر فوری روانگی نہ ہوتی تو فرم کا بہت بڑا مالی نقصان ہو سکتا تھا۔'' شمشاد نے بتایا اور وہ خاموش ہو گئے۔

دوسری طرف گوہر کو زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ ملا تھا، وہ دن رات شارب کو موت کی سزا دلوانے کی کارروائیوں میں مصروف تھی۔ اس نے بہت سے مہرے پال لیے تھے جو اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس نے ایک مشہور بیرسٹر کی خدمات حاصل کی تھیں جبکہ شمشاد نے ایک اور وکیل صاحب کو یہ کیس دیا تھا۔ جو بے چارے پوری دیانت داری سے کام کر رہے تھے، لیکن استغاثہ نے اتنا مضبوط کیس تیار کیا تھا کہ کس طرف سے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی تھی پیشیاں ہوتی رہیں اور شارب کے خلاف ثبوت پر ثبوت پیش کیے جاتے رہے اس کے وکیل ظاہر صدیقی صاحب کی آنکھوں میں مایوسی صاف پڑھی جا سکتی تھی لیکن وہ اپنی کوشش میں مصروف تھے، شمشاد اور عالیہ ظاہر صدیقی سے بات کرتے تو وہ یہ ہی کہتے کہ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ میں ہر کوشش کر رہا ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن کچھ نہیں ہوا، مقدمے کی سماعتیں مکمل ہو گئیں اور آخرکار فیصلے کا دن آ گیا، شارب نیم مردہ ہو گیا تھا، اس کی صحت کافی خراب ہو گئی تھی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے سر ہر وقت چکراتا رہتا تھا۔ آج بھی اس کا دل بری طرح ڈوب رہا تھا، جو کچھ ہو رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اسے کوئی امید نہیں تھی کہ وہ بچ سکے گا، دیکھیں تقدیر نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

کمرہ عدالت میں عالیہ اور شمشاد بھی تھے، مایوسی سب کے چہروں پر کھنڈی ہوئی تھی، شمشاد نے کہا ''تم مایوس نہیں ہونا شارب اللہ ہماری مدد کرے گا'' عالیہ نے بھی بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں

نکل سکی۔

”مجھے کوئی مایوسی نہیں ہے شمشاد بھائی بلکہ میں سوچتا ہوں کہ اچھا ہے میں نائلہ کے پاس چلا جاؤں گا وہ جانتی ہے کہ میں نے اسے زہر نہیں دیا، وہاں بھی ہم دونوں خوش وخرم رہیں گے۔“

آخر کار جج صاحب آگئے انہوں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر فیصلے کا اعلان کرنے لگے۔

”ملزم شارب احمد ولد مسرور احمد“ انہوں نے اس کیس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی پھر کہا ”یہ عدالت ان ثبوتوں“ گواہوں اور شہادتوں کی بنیاد پر جو تمہارے خلاف پیش کی گئی، تمہیں تمہاری بیوی نائلہ بیگم بنت حسن علی غوری مرحوم کے قتل کے الزام میں سزائے موت کا حکم سناتی ہے۔ یہ مختصر فیصلہ ہے۔ تفصیلی فیصلے کی نقل بعد میں عدالت سے لی جاسکتی ہے۔“

جج صاحب کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن شارب کچھ نہیں سن رہا تھا بس اس کے کانوں میں جج صاحب کی آواز گونج رہی تھی، تمہیں سزائے موت کا حکم سناتی ہے۔

عدالت کی کارروائی ختم ہوگئی، جج صاحب اٹھ کر چیمبر میں چلے گئے، باقی لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے، شارب کی آنکھوں میں تاریک لہریے گردش کررہے تھے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، عالیہ کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا، اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر پھٹی ہوئی تھیں بس وہ سامنے دیکھے جا رہی تھی، اس وقت وکیل ظاہر صدیقی شارب کے پاس آگئے۔

”گھبرانا مت شارب یہ آخری عدالت نہیں ہے ابھی کئی مراحل ہیں ہم اپیل میں جائیں گے، ہائی کورٹ، پھر سپریم کورٹ ان شاء اللہ تمہیں رہائی مل جائے گی۔“

”خود کو سنبھالو عالیہ، وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں ابھی تو کئی عدالتیں باقی ہیں، ہائی کورٹ ”سپریم کورٹ“ اور پھر سب سے بڑی عدالت اللہ کی عدالت جہاں کسی کا جھوٹ نہیں چلتا اصل فیصلہ تو وہیں سے ہوگا، شارب رہا ہو جائے گا کیونکہ وہ بے گناہ ہے اس نے کسی کو قتل نہیں کیا یہ اللہ جانتا ہے اور اسے جھوٹے سچے ثبوتوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

سپاہی شارب کی ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ کر اس کو کمرہ عدالت سے باہر لے جانے لگے تو وہ عالیہ کے قریب سے گزرا اس نے رک کر کہا۔ ”باجی“ تو عالیہ کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا، اور یہ جھٹکا اسے ہوش میں لے آیا ورنہ کوئی سنگین عمل بھی ہوسکتا تھا، وہ بھائی سے لپٹ کر اس طرح روئی کہ سپاہیوں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے، ایک سپاہی نے نرمی سے کہا۔

”ہٹ جائیے بہن، اس کی اجازت نہیں ہوتی بس ان کے حق میں دعائے خیر کریں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے تو شمشاد نے عالیہ کو پیچھے ہٹا لیا، وہ اور عالیہ بھائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اس طرح وہ باہر نکل آئے۔ ظاہر صدیقی صاحب مسلسل انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔

عدالت کے احاطے میں پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی جس میں شارب کو بمشکل چڑھایا گیا، اس کے پاؤں بے جان ہو رہے تھے۔ پھر گاڑی وہاں سے باہر نکل گئی۔

”میں اپیل کی تیاریاں کرتا ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔“ صدیقی صاحب نے کہا اس وقت گوہر ان کے پاس سے گزری، اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نظر آرہی تھی اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ان لوگوں پر ڈالی اور احاطے میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

شمشاد اور عالیہ گھر آگئے عالیہ کی حالت بدستور خراب تھی، شمشاد اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ ”کیسے صبر کروں شمشاد۔ ایک ہی بھائی تھا میرا ہم دونوں نے کسی دوسرے کی ضرورت کبھی نہیں محسوس کی۔“ عالیہ بلکتے ہوئے بولی۔

”وہ تھا نہیں ہے عالیہ اور رہے گا، ہم اسے بچانے کی آخری دم تک جدوجہد کریں گے۔“

”ایک بات کہوں شمشاد۔“ عالیہ بولی۔

”ہاں۔ کہو۔؟“

”یہ ظاہر صدیقی صاحب کچھ نہیں کرسکے۔ یہ تو بہت کمزور وکیل ثابت ہوئے، شارب کو موت کی سزا ہوگئی اور وہ خاموشی سے منہ دیکھتے رہ گئے۔“

”یہ بات نہیں ہے عالیہ، ان کمینوں نے پیسے کا کھیل دکھایا ہے سارے کرائے کے ثبوت مہیا کیئے ہیں، قانون ثبوتوں کی بنیاد پر فیصلے کرتا ہے، دیکھو شاید صدیقی صاحب آگے چل کر کچھ کرسکیں۔“

”نہیں، میر دل نہیں مانتا ہمیں کوئی اور اچھا وکیل کرنا ہوگا۔“

عالیہ نے کہا۔

”میں مشورے کرتا ہوں۔“ شمشاد نے کہا۔

☆☆☆

شمشاد اور عالیہ پر دہری ذمے داری آپڑی تھی ایک طرف وہ مسرور احمد اور ان کی بیگم کو سنبھالے ہوئے تھے کہ انہیں کہیں سے شارب کی سزا کی خبر نہ ملنے پائے تو دوسری طرف شارب کے سلسلے پر بھی کام کیا جارہا تھا، شمشاد وکیلوں کے بارے میں چھان بین کررہا تھا کہ اس کے ایک دوست نے کہا۔

”یار تم فوری طور پر وکیل احمد سے ملو۔؟“

”یہ کون ہیں“

”ایک درویش صفت وکیل، اسم باسمیٰ ہیں یعنی وکالت کرتے ہیں اور نام بھی وکیل احمد ہے۔“

”اچھے وکیل ہیں۔“ شمشاد نے پوچھا۔

”صرف اچھے وکیل نہ کہو۔ یوں سمجھو اگر تمہارا کیس ہاتھ میں لے لیا تو اللہ کے فضل سے تمہارے سالے کو جیل سے نکال کر تمہارے حوالے کردیں گے شرطیہ ہے کہ تمہارا سالا بے قصور ہو۔ وہ کبھی کوئی مشکوک کیس ہاتھ میں نہیں لیتے۔“

”مگر میں یہ کیسے ثابت کرسکوں گا کہ شارب بے قصور ہے۔“

”یہ کام وہ خود کریں گے۔ بڑی عجیب شخصیت ہے ان کی ایک آنکھ سے محروم ہیں ایک ہاتھ اور ایک پاؤں ٹوٹا ہوا ہے، بیساکھی سے چلتے ہیں، جانتے ہو ان تمام چیزوں سے محرومی کی وجہ کیا ہے۔“

”کیا؟“ شمشاد نے پوچھا“

”میں نے بتایا نا کہ وہ صرف قتل کے کیس لیتے ہیں اور صرف بے گناہوں کے لیے لڑتے ہیں ایک جرائم پیشہ شخص نے ان کے ذریعہ قتل کے الزام سے بچنا چاہا تو انہوں نے سارا کچا چٹھا کھول دیا، اس کو تو موت کی سزا ہوگئی لیکن اس کے حواریوں نے وکیل صاحب پر شدید تشدد کیا اور وہ ایک آنکھ سے محروم ہوگئے، ایک بڑے آدمی کا بیٹا بھی قاتل تھا، اس کا کیس لینے سے انکار کیا تو اس نے ان کی ٹانگ کٹوادی اسی طرح ہاتھ بھی کسی کے تشدد کی نذر ہوگیا مگر وہ بڑے مطمئن ہیں کہتے ہیں جتنے باقی ہیں وہی کافی ہے اگر کسی سچے کیس کے لیے اسٹریچر پر بھی جانا پڑے تو جائیں گے تم یقین کرو اگر کسی کمرہ عدالت میں کسی کیس کے سلسلے میں جائیں تو بیساکھی کی کھٹ کھٹ سن کر ہی جج صاحب کا ملزم کے بارے میں نظریہ بدل جاتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر وکیل احمد اس کا کیس لڑنے آگئے ہیں تو وہ سو فیصدی بے گناہ ہے۔“

”خوب میں نے کبھی ان کے بارے میں نہیں سنا، بہت مہنگے ہوں گے۔“

شمشاد نے کہا۔

”میں نے انہیں اسی لیے درویش صفت کیا، پیسے کے بالکل لالچی نہیں ہیں کبھی کبھی تو وہ کسی غریب آدمی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے، ویسے بھی جو کوئی جو کچھ دیتا ہے لے لیتے ہیں، ان کے پاس ان کا اسٹاف ہے ایک ماتحت وکیل جوان کا بہترین مشیر ہے اور کچھ خفیہ اسٹاف۔ جو بھی ظاہر نہیں ہوتا اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔“

”کچھ ایسے لوگ جو تفتیش کرتے ہیں کہ جس شخص پر قتل کا الزام ہے وہ سچ مچ قاتل ہے کہ نہیں وہ وکیل صاحب کو پوری رپورٹ فراہم کرتے ہیں اور

اس کی روشنی میں وکیل صاحب کام کرتے ہیں۔"

"مجھے ان سے ملا دو یہ تو میرے لیے تائید غیبی ہے۔" شمشاد نے کہا۔

"میں تمہیں پتہ بتائے دیتا ہوں، پورے اعتماد سے چلے جاؤ۔"

گھر آ کر شمشاد نے عالیہ کو پوری تفصیل بتائی تو وہ دعائیں مانگنے لگی، اور آخر کار دونوں اس پتے پر جا پہنچے، اس ملاقات کے لیے فون پر وقت لے لیا گیا تھا ایک چپراسی نے انھیں سادہ سے دفتر کے ایک کیبن میں پہنچا دیا جہاں انہوں نے پر وقار شخصیت کے مالک اس شخص کو دیکھا جس کے بارے میں وہ ایک پر سحر کہانی سن چکے تھے اس کی تصدیق آنکھوں پر لگے اس چشمے سے ہوگئی جس کا ایک شیشہ تاریک اور دوسرا اسفید تھا، کرسی کے ساتھ بیساکھی رکھی ہوئی تھی۔

"تشریف رکھیے مجھے آپ دونوں کے نام معلوم ہو چکے ہیں، عالیہ اور شمشاد۔ فرمایئے۔"

دونوں بیٹھ گئے، عالیہ نے کہا۔

"میرے بھائی شارب احمد کو سیشن کورٹ سے موت کی سزا ہوئی ہے۔"

عالیہ نے رندھی آواز میں کہا۔

"اس پر قتل کا الزام تھا۔"

"جی، اس پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام ہے۔"

اس نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا۔؟ وکیل احمد نے بڑی سادگی سے پوچھا لیکن سوال چکرا دینے والا تھا۔

"نہیں سر۔ اس نے قتل نہیں کیا۔ اس پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔" عالیہ بے چینی سے بولی۔

"تو پھر اسے کس نے قتل کیا؟" وکیل صاحب نے بدستور اسی انداز میں کہا اور عالیہ چکرا کر رہ گئی اسے یہ الفاظ بڑے عجیب لگے تھے، اس نے پاس بیٹھے شمشاد کو دیکھا تو شمشاد بولا۔"

"نہیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم سر۔"

"اس بارے میں کچھ نہیں معلوم لیکن آپ یہ ضرور جانتے ہیں کہ اسے آپ کے بھائی نے قتل نہیں کیا۔؟"

"جی سر۔ اور اس کی وجہ یہ ہے وہ بے حد نرم مزاج اور دھیمی فطرت کا مالک ہے، ایسا گھناؤنا عمل وہ کر ہی نہیں سکتا۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں، لیکن سیشن کورٹ نے اسے موت کی سزا دے دی مگر بھائی عدالت بھی مکمل ثبوت اور گواہی کے بغیر کسی کو سزا نہیں دیتی اسے مکمل یقین ہوتا ہے تب وہ اتنی بڑی سزا دیتی ہے۔" وکیل صاحب نے کہا۔

"آپ کا فرمانا بجا ہے وکیل صاحب، لیکن بعض اوقات اصل چہرے ایسا مواد اور گواہ مہیا کر دیتے ہیں کہ اصلیت ان میں چھپ جاتی ہے اور فیصلے ضبط ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں، ایسا ممکن ہوتا ہے، لیکن قانون تو مواد اور گواہ ہی مانتا ہے، صرف آپ کے کہہ دینے سے تو قانون اسے بے گناہ نہیں مان سکتا، اسے مکمل ثبوت اور گواہ پیش کیے گئے ہوں گے" وکیل صاحب کا لہجہ بے حد خشک اور سپاٹ تھا۔"

"وہ قتل نہیں کر سکتا وکیل صاحب کیونکہ وہ ایک شریف اور نیک فطرت انسان ہے اور اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا، دونوں کی زندگی میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔"

"کسی کی ذاتی زندگی کے بارے میں باہر کے لوگ اتنا تو نہیں جان سکتے کیا آپ لوگ اس کے ساتھ وہیں رہتے تھے۔"

"نہیں۔ ہمارا گھر الگ ہے۔"

"تو پھر۔ زبانی دلیل تو کوئی معنی نہیں رکھتی۔" وکیل صاحب نے کہا اور عالیہ بری طرح بددل ہو گئی۔ اس کا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ ہم سیشن کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرنا چاہتے ہیں، ہمیں آپ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپ بے گناہ لوگوں کے کیس لیتے ہیں، شارب بے گناہ ہے اس پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے، اور کثیر دولت خرچ کر کے اس کے خلاف ثبوت اور گواہ مہیا کیے گئے ہیں ظاہر ہے آپ بھی حقائق کی تحقیق کے بعد ہی بے گناہوں کے کیس لیتے ہیں، ہمیں یہی بتایا گیا ہے کہ اللہ نے آپ کو سچ میں جھانکنے کی طاقت بخشی ہے۔ آپ اگر مناسب

سمجھیں تو ہماری مدد کریں۔"

پہلی بار وکیل صاحب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی۔ انہوں نے کہا۔ "سچ میں جھانکنے کی اصطلاح مجھے بڑی اچھی لگی، لیکن بچوں، سیشن کورٹ بہت مضبوط ثبوتوں کے بغیر کسی کو موت کی سزا نہیں دیتی، ان ثبوتوں کی تردید آسان نہیں ہوتی آپ مختصر الفاظ میں استغاثہ کے موقف کے بارے میں بتایئے، اس کے مطابق شارب احمد نے اپنی بیوی کو کیا نام تھا اس کا۔

"نائلہ غوری۔" شمشاد نے جواب دیا۔

"اسے کیوں قتل کیا۔"

"ان کا کہنا ہے کہ شارب نے اپنی مال دار بیوی کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اس کی دولت پر قابض ہو سکے، بعد اس کے بعد ایک اور لڑکی ستارہ سے شادی کر سکے۔ استغاثہ کے مطابق وہ ستارہ کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، اس مقصد کے تحت اس نے نائلہ کو قتل کیا۔"

"قتل کیسے کیا گیا۔" وکیل صاحب نے پوچھا۔

"استغاثہ کے مطابق اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔"

"کوئی عینی گواہ۔؟"

"نہیں۔ کوئی نہیں۔"

"ہوں۔ ایک آخری سوال: خود آپ لوگ صدق دل سے یہ بتایئے کہ کیا شارب اپنی بیوی کو قتل کر سکتا ہے۔"

"خدا کی قسم اس کا ماضی بے داغ ہے۔ دونوں میاں بیوی پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ دونوں کے درمیان بے حد محبت تھی۔!"

"گویا وہ بے قصور ہے۔"

"جی۔!"

"آپ لوگ پورے کیس کے تمام کاغذات مجھے تھما دیجیے، میں ان کا جائزہ لے کر آپ کے رابطہ کروں گا۔" وکیل احمد نے کہا۔

وکیل احمد نے شمشاد کے فراہم کیے ہوئے کاغذات سامنے رکھ لیے اور ان کا مطالعہ شروع کر دیا، ان کے دست راست ناصر علی بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، طریق کار یہ ہی تھا، کسی کیس کا جائزہ لیتے ہوئے وکیل احمد اپنا پڑھا ہوا کاغذ نشان لگا کر ناصر علی کو دیتے اور ناصر علی اسے پڑھ کر اس کے نوٹس بناتے اور اپنے ریمارکس اس پر درج کرتے پھر دونوں اس پر بحث کر کے اصلیت تلاش کرتے۔

☆☆☆

استغاثہ کی کہانی کے مطابق ملزم شارب احمد اور نائلہ کی شادی کو تین سال گزر چکے تھے ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کے تعلقات کشیدہ رہتے تھے، نائلہ کی بڑی بہن گوہر جو ماں کے مر جانے کے بعد چھوٹی بہن کو ماں کی طرح چاہتی تھی ان کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھی کیونکہ وہ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، نائلہ جب بھی بہن سے ملتی اسے اپنے دکھ کے بارے میں بتاتی رہتی تھی، اس بات کی سب سے بڑی گواہ ستارہ نامی ایک لڑکی تھی جو گوہر کی بہترین دوست تھی اور اتفاق سے شارب کے دفتر میں بس کام کرتی تھی۔ اس کے بیانات اس کیس میں سب سے زیادہ تھے۔

اس کے برعکس ملزم شارب کی بہن عالیہ اور اس کے شوہر کے بیانات بالکل مختلف تھے ان کا کہنا تھا کہ شارب اور نائلہ کے تعلقات مثالی تھے اور دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح مطمئن تھے ویسے بھی یہ شادی پسند کی شادی تھی، البتہ مقتولہ کی بہن گوہر نے حلفیہ بیانات کے ساتھ اور بہت سی گواہیوں سے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ نائلہ اور شارب کے درمیان شدید اختلافات تھے اور دونوں سیدھے منہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ گوہر نے یہ بات ثابت کر دی تھی، اس نے بتایا کہ اس نے اپنی دوست ستارہ سے درخواست کی کہ چونکہ وہ شارب کے ساتھ اس کے آفس میں کام کرتی ہے اس لیے وہ شارب کو سمجھائے، ستارہ ایک شریف لڑکی ہے، شارب کے دفتر میں کام کرنے کے باوجود اس کے شارب سے

بالکل تعلقات نہیں تھے لیکن گوہر کی دوستی کی وجہ سے وہ خصوصی طور پر اس سے ملی اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن شارب نے اسی پر ہی ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ستارہ ایک طلاق یافتہ لڑکی تھی، اور بے حد اسمارٹ تھی، وہ خود بھی شارب میں دلچسپی لینے لگی کیونکہ شارب کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ ایک کروڑ پتی بیوی کا شوہر ہے یہ بات گوہر احمد ستارہ کی ایک مشترکہ دوست نورالعین یا نور گوہر کو بتائی کہ ستارہ شارب کو سمجھانے کے بجائے اس سے پینگیں بڑھا رہی ہے، نور اور ستارہ ایک ہی فلیٹ میں رہتی تھیں، اور ستارہ اسے اپنے آنے والے شاندار مستقبل کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔

شارب کے مشکوک رویئے سے نائلہ کو شک ہوا اور معلومات کرنے پر اسے پتہ چلا کہ شارب ستارہ نامی ایک لڑکی کے چکر میں پڑا ہوا ہے، وہ سخت پریشان ہو کر گوہر کے پاس گئی اور اسے اپنا دکھ سنایا گوہر کو پہلے ہی یہ بری خبر مل چکی تھی، اس نے چھوٹی بہن کو تسلی دی اور کہا کہ وہ پوری کوشش کرے گی شارب کوئی غلط قدم نہ اٹھائے، گوہر ستارہ سے ملی اور اسے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس کی دوست ہو کر اس کی بہن کا گھر تباہ کر رہی ہے تو ستارہ نے کہا کہ وہ بے قصور ہے، وہ اس سے رو رو کر کہتا ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی کچھ بھی نہیں ہے، مجھے اس کی آہ وزاری نے متاثر کیا اور میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں، میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔

"گویا تم میری بہن کا گھر برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔" گوہر نے کہا۔

"بالکل نہیں، مگر شارب نے میری زندگی عذاب کر دی ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر میں نے اس سے شادی نہیں کی تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے گا، میں عورت ہوں گوہر۔ ایک جنونی مرد سے مجھے ڈر بھی لگتا ہے، وہ مجھے نقصان بھی پہنچا سکتا ہے میرے چہرے پر تیزاب بھی ڈال سکتا ہے، مجھے گولی بھی مار سکتا ہے۔"

"گویا اگر وہ نائلہ کو طلاق دیدے تو تم اس سے شادی کر لو گی۔ گوہر نے پوچھا۔

"تم خود سوچو گوہر، میرے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتی تھی جس سے وہ شادی کر لیتا، کیا تم سب کو اس طرح مجبور کر سکتی تھیں، سب کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے میں نے تو ان کے درمیان تفرقہ نہیں ڈلوایا۔"

گوہر کا بیان تھا کہ آخر میں اس نے صورت حال سنبھالنے کی آخری کوشش کی اور شارب سے اپنی بہن کے مستقبل کی بھیک مانگی مگر اس نے صاف کہہ دیا کہ اوہ نائلہ سے ہر قیمت پر علیحدگی چاہتا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے خوش نہیں ہیں۔

عالیہ اور شمشاد کا کہنا تھا کہ انہوں نے شارب یا نائلہ کی زبانی کی ستارہ کا ذکر کبھی نہیں سنا، انہیں تو اس وقت علم ہوا جب ستارہ خود نائلہ کے پاس پہنچ گئی اس نے نائلہ سے اپنے اور شارب کے تعلقات کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس نے شارب سے صاف کہہ دیا ہے کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں وہ شارب سے کبھی شادی نہیں کرے گی، اسے اس گھر میں سوتن بن کر آنے کا کوئی شوق نہیں ہے، نائلہ بری طرح بد حواس ہو گئی، اس نے شام کو شارب سے پوچھا تو وہ صاف انکاری ہو گیا، اس نے اپنی بہن کو اس بارے میں بتایا تو وہ بھی سخت پریشان ہوئی، دوسری طرف شارب کی بہن عالیہ اور بہنوئی شمشاد کو بھی سب کچھ معلوم تھا لیکن انہوں نے اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

شارب اور ستارہ کے معاشقے کی گواہی تین افراد نے دی ان میں سب سے پہلے ستارہ تھی، اس نے بیان دیا کہ جب وہ شارب سے ملی تو اس کی نیت بالکل صاف تھی، بعد میں شارب نے اسے رجھانا شروع کر دیا اور وہ اس کے جال میں پھنس گئی، لیکن اس نے یہ شرط سختی سے رکھی کہ شارب نائلہ کو طلاق دے گا تو وہ اس سے شادی کرے گی۔

دوسری گواہ گوہر تھی جس نے بڑا آتشی بیان دیا

اور تمام باتوں کی تائید کی اس نے کہا کہ شارب ستارہ کے عشق میں پاگل ہو کر نائلہ کو طلاق بھی دے دیتا لیکن اس کے بعد اس نائلہ کی دولت چھوڑنا پڑتی اور دولت کے بغیر زندگی بے مزا ہوتی۔

تیسری گواہ نورالعین تھی جس کے فلیٹ میں ستارہ رہتی تھی، اس نے گواہی دی کہ اکثر شارب راتوں کو ستارہ کے ساتھ اس کے کمرے میں رہتا تھا، دونوں ساتھ باہر کھانا کھاتے اور ساتھ گھومتے تھے، شارب اس کی بھی خوش آمد کرتا تھا کہ وہ ستارہ کو اس کے حق میں ہموار کر کے اور اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ بعد میں نائلہ کو چھوڑے گا ستارہ اس سے فوراً شادی کرے۔ نور نے کہا کہ اس نے کئی بار ستارہ سے بات بھی کی لیکن ستارہ نے اسے جھڑک دیا اور کہا کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتی تو کیا ایسا کر سکتی تھی۔

تین عورتیں اس بات کی گواہ تھیں، کافی تھا، پھر اس دن اچانک نائلہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور شارب ایک دکھاوے کے لیے اسے اسپتال لے گیا لیکن اس کا کام ہو چکا تھا، نائلہ مر چکی تھی، ڈاکٹروں اسے حرکت قلب بند ہونے کی وجہ قرار دیا، لیکن گوہر پر قیامت ٹوٹ پڑی اس کا دل نہیں مان رہا تھا، اس کی بہن کی صحت تو قابل رشک تھی۔

نائلہ کی موت کے ایک ہفتے کے بعد شارب ستارہ سے ملا اور اس نے کہا۔

"مبارک ہو ستارہ، ہمارے راستے کے سارے کانٹے نکل گئے۔" ستارہ عورت تھی، بے شک وہ بھی شارب سے متاثر تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن وہ نائلہ کی موت نہیں چاہتی تھی، اس نے افسردگی سے کہا۔

"مجھے نائلہ کی موت کا بہت دکھ ہے، اچانک اسے کیا ہو گیا۔"

"اسے کچھ نہیں ہوا تھا، میں نے یہ سب کچھ تمہارے لیے کیا ہے۔"

"کیا۔۔۔۔کیسے۔۔۔؟" ستارہ نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"وہ بیمار ہو کر نہیں مری، میں نے اسے زہر دے کر مارا ہے، ایک ایسا زہر جو فوری طور پر نہیں بلکہ چند گھنٹوں کے بعد اثر کرتا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ تم نے میرے لیے نائلہ کو قتل کر دیا، ستار کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔"

"ہاں میری جان، اس کے علاوہ کوئی حل نہیں تھا، اب اس کی ساری دولت ہماری ہوگی، ہم ہنی مون کے لیے دنیا بھر کا دورہ کریں گے۔" شارب بہت خوش تھا، لیکن ستارہ دل ہی دل میں کانپ رہی تھی، اس کا محبوب اس قدر سنگ دل ہے کہ اس نے نائلہ کی جان لے لی۔

شارب کے جانے کے بعد ستارہ نے اپنی مخلص دوست نور کو سب کچھ بتا دیا، وہ بے در خوف زدہ ہو گئی تھی، جو شخص آج دوسری شادی کے لیے اپنی پہلی بیوی کو قتل کر سکتا ہے وہ تیسری شادی کے لیے دوسری بیوی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔

نور خود بھی ششدر رہ گئی تھی، اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ معاملہ اتنا معمولی نہیں ہے ستارہ وہ انسان نہیں درندہ ہے جرم کبھی نہیں چھپتا ایک نہ ایک دن سب کچھ سامنے آجاتا ہے اس وقت تم بھی قانون کی لپیٹ میں آسکتی ہو۔"

"تو میں کیا کروں۔"

"فوراً یہ ساری باتیں گوہر کو بتا دو، ورنہ تم بھی اس جرم کی شریک قرار دی جا سکتی ہو۔"

پھر دونوں ہی ساتھ ساتھ گوہر کے پاس پہنچی تھیں اور انہوں نے ساری بات گوہر کو بتا دی، گوہر جو بہن کے سوگ میں تھی یہ سب سن کر سکتے میں رہ گئی پھر اس کے اندر جنون جاگ اٹھا اور اس نے قسم کھائی کہ اگر شارب نے اس کی بہن کو قتل کیا ہے تو وہ شارب کو پھانسی دلوا کر رہے گی، چنانچہ اس نے پولیس سے رجوع کیا، اور اس کی درخواست پر لاش قبر سے نکالی گئی، پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چل گیا کہ نائلہ کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اور پولیس نے شارب کو نائلہ کے قت کے

الزام میں گرفتار کرلیا۔
شارب نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، اس نے نائلہ کو زہر نہیں دیا وہ تو اسے بہت چاہتا تھا اسے سازش کا نشانہ بنایا گیا ہے، اس نے عدالت میں اس بات سے قطعی انکار کیا کہ اس کا ستارہ سے کوئی معاشقہ تھا اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اپنے موقف کے حق میں کوئی ٹھوس ثبوت اور گواہ نہیں پیش کرسکا، اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ستارہ نائلہ سے ملنے اس کے گھر آئی تھی اور اس نے نائلہ سے کہا تھا کہ شارب اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، اس کے علاوہ عالیہ اور شمشاد نے بھی تسلیم کیا تھا کہ مرحومہ نائلہ نے انہیں ستارہ کی آمد کے بارے میں بتایا تھا، اس طرح استغاثہ ایک مضبوط کیس پیش کرنے میں کامیاب رہا اور شارب کا دماغ بہت کمزور رہا، وہ اپنے موقف کو عدالت سے نہیں منوا سکا، اور آخر کار عدالت نے اسے موت کی سزا دے دی، اس کے خلاف تین مضبوط گواہیاں تھیں۔

تمام کاغذات کا جائزہ لینے کے بعد وکیل احمد صاحب نے اپنی اکلوتی آنکھ سے ناصر علی صاحب کو دیکھا جو اپنے نوٹس تیار کرتے رہے تھے۔ ''جی ناصر علی صاحب۔''

''لغو بے ہودہ، گھٹیا الزام ہے استغاثہ کے الزامات میں بے شمار خامیاں ہیں۔'' ناصر علی صاحب نے کہا۔

''دکھایئے۔'' وکیل احمد بولے اور ناصر علی صاحب نے اپنا کاغذ ان کے سامنے کردیا جبکہ وکیل احمد نے اپنے ریمارکس کا کاغذ ناصر علی صاحب کو دے دیا ایک دوسرے کے ریمارکس دیکھ کر دونوں مسکرادیے۔ کیونکہ ریمارکس لفظ بہ لفظ یکساں تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن جب وکیل احمد کی طلبی پر عالیہ اور شمشاد وکیل احمد کے سادہ سے دفتر میں پہنچے تو وکیل احمد کا رویہ پہلے کی نسبت بالکل بدلا ہوا تھا، ناصر علی صاحب ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، وکیل احمد نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''ان سے ملیے یہ ناصر علی صاحب ہیں ہر چند کہ یہ کوئی خاتون نہیں ہیں لیکن میں بہ آسانی انہیں اپنا ''نصف بہتر'' کہہ سکتا ہوں۔''

دونوں پھیکے انداز میں مسکرادیے، وکیل احمد بولے۔

''ہم نے آپ کے دیے ہوئے کاغذات کا بغور مطالعہ کیا ہے، استغاثہ نے اپنا کیس جس طرح پیش کیا ہے اس کی روشنی میں سیشن جج کا فیصلہ سو فیصد درست ہے، اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ دیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔''

عالیہ اور شمشاد کے چہرے اتر گئے، وہ ہراساں نگاہوں سے وکیل احمد کو دیکھنے لگے وکیل احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ناصر علی صاحب کا کہنا ہے کہ اس بارے میں چھان بین کی کوشش کی جاسکتی ہے البتہ آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ کام کرنا ہوگا۔''

ایک بار ان کے دل میں امید کی کرن چمکی عالیہ نے بمشکل تمام آواز سنبھال کر کہا۔ ''آپ جو حکم دیں گے ہم کریں گے۔''

''میں جس تعاون کا ذکر کررہا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ مجھے اپنے اور مقتولہ کے خاندان کے بارے میں مکمل تفصیلات بتائیں گے، ایک بات بھی چھپائی تو مشکل ہوجائے گی، ہاں یہ وعدہ ہے کہ آپ کا ہر راز ہمارے سینوں میں رہے گا اگر آپ بھروسا کریں، اصل میں اسی تفصیل سے میں اپنے لیے راستہ تلاش کروں گا۔''

''ہم آپ سے کچھ نہیں چھپائیں گے وکیل صاحب۔'' شمشاد نے کہا۔

''میرے والد کفیل احمد بھی وکیل تھے ان کے والدین نے ان کا نام کفیل احمد رکھ دیا تھا، لیکن انہیں یہ پیشہ اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے ایک وکیل پیدا کرلیا، انہوں نے مجھے سمجھایا کہ وکیل بہت بڑا نام ہے اور اس نام کی حرمت کے لیے جہاد ضروری ہے یہ اس بڑے نام کو خراج عقیدت ہے، اس لیے میں

صرف وہ کیس لیتا ہوں جو سچائی پر مبنی ہوں اور اس دور میں سچ بے حقیقت ہے، مزید کیا کہوں، آپ لوگ تیار ہیں۔''

''سو فیصد۔'' شمشاد نے کہا۔

پھر اس کے بعد ماضی کی ایک ایک گرہ کھل گئی، اس طویل داستان کے اختتام پر وکیل احمد نے کہا، اب مجھے فوری طور پر شارب احمد سے ملنا ہوگا کیونکہ جو گوشے آپ لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آسکے وہ شارب سے معلوم ہوسکیں گے۔

''جی وکیل صاحب۔'' عالیہ نے کہا۔

وکیل احمد نے ناصر علی کی طرف دیکھا جن کا قلم اس دوران تیز رفتاری سے کاغذ پر چلتا رہا تھا، پھر وکیل احمد نے ناصر علی کو اشارہ کیا اور ناصر علی نے کچھ کاغذات لوگوں کی طرف بڑھادیے۔

''اس کاغذ پر دستخط کردیجیے، یہ وکالت نامہ ہے میں ہائی کورٹ میں آپ کے کیس کی پیروی کروں گا۔''

دونوں میاں بیوی کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وکیل احمد کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہے، پھر بولے۔

''یہ پوری کہانی بھی بہت سے دلچسپ حقائق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''

''حیرت ہے ظاہر صدیقی نے ان نکات پر غور نہیں کیا۔''

''نہیں، ہم کسی کے طریق کار پر اعتراض نہیں کرسکتے، اب ہمیں شارب سے ملاقات کرنی ہے۔''

شارب سے ملاقات میں کوئی دقت نہیں ہوئی، وکیل احمد کی اکلوتی آنکھ نے اسے ایک لمحے میں اندر تک دیکھ لیا، پھر انہوں نے اسے وکالت نامہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بہن اور بہنوئی نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے میں تم سے چند ضروری باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں اب جبکہ تمہارے مخالفین نے تمہیں موت کی دہلیز تک پہنچادیا ہے تو کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے سب کچھ صاف صاف بتادو۔''

پوری تفصیل سننے کے بعد ناصر علی نے شارب سے وکالت نامے پر دستخط کرائے اور مطمئن انداز میں باہر نکل آئے باہر نکل کر وکیل احمد نے کہا۔ ''اس شخص کو سزائے موت نہیں ہوگی ان شاء اللہ، اصل قاتل بے نقاب ہوچکا ہے، لیکن اس کے گرد مضبوط حصار ہے اس حصار کو توڑنے کے لیے اندھیروں سے کام لینا ضروری ہے۔''

''کہاں چلیں؟'' ناصر علی نے انیس سو چوہتر کی فوکس ویگن اسٹارٹ کرکے پوچھا۔

''آفس۔'' وکیل احمد نے کہا اور فوکس ویگن سڑک پر تیرنے لگی آفس پہنچ کر وکیل احمد اور ناصر علی سر جوڑ کر بیٹھ گئے، وکیل احمد نے کہا، قاتل نظروں کے سامنے موجود ہے لیکن ہمیں ایک مشکل کام کرنا ہوگا، ذرا ایس پی سجاد حسین کو فون لگایئے، ایس پی سجاد حسین سے رابطہ ہوا تو وکیل احمد نے کہا۔ ''ایک ملاقات کی خواہش ہے۔''

''خوش نصیبی ہے میری فرمایئے کہاں حاضری دوں۔؟''

''ارے کیوں شرمندہ کررہے ہیں میں آجاتا ہوں۔''

''میں عمدہ سی چائے کے لیے کہہ دیتا ہوں، ایس پی صاحب نے خوش دلی سے کہا، وکیل احمد صاحب کا وقار ہر دل میں تھا، ایس پی سجاد احمد نے ان سے پوری تفصیل سننے کے بعد کہا۔

''زبردست کیس ہے، میری خدمت بتایئے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ستارہ، نور العین اور گوہر پر بھرپور نظر رکھی جائے یہ شہر سے باہر نہ بھاگنے پائیں، ممکن ہے یہ کوشش کی جائے، وہ ذاتی طور پر بھی خوف زدہ ہوکر ایسا کرسکتی ہیں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں، آپ کے خیال میں وہ گوہر سے اپنا حصہ وصول کرکے فرار ہونے کی کوشش کرسکتی ہیں۔'' ایس پی صاحب نے کہا۔

☆☆☆

وکیل احمد کے ''اندھیرے'' مصروف عمل ہوگئے۔

اس روز جب نور معمول کے مطابق فلیٹ سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چلی تو اچانک ایک

بوڑھے فقیر نے اس کا راستہ روک لیا۔ خاصی خوف ناک شکل کا فقیر تھا۔ سر پر بالوں کا طوفان آیا ہوا تھا داڑھی پیٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ''خیرات دے دے جی۔ جان کا صدقہ۔ نکال جلدی سے۔''

''معاف کرو بابا۔ راستے سے ہٹو۔'' نور نے بگڑ کر کہا۔

''حرام کے مال کو اکیلے نہ ہضم کر۔ فقیر کا حصہ نکال دے۔ ورنہ حرام ہی کی موت ماری جائے گی۔ نکال پانچ سو روپے۔'' فقیر کے ان الفاظ نے نور کے چہرے کا رنگ بدل دیا۔ ''نکال جلدی دیر مت کر۔ خون ناحق کی کمائی رنگ نہ لے آئے۔ کوئی ضمانت دینے والا بھی نہیں ہوگا۔ نکال پانچ سو روپے۔''

نور کی حالت خراب ہوگئی۔ سارے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ اس نے مشینی انداز میں پرس کھولا سو روپے کا نوٹ نکال کر فقیر کی طرف بڑھایا اور تیزی سے راستہ کاٹ کر آگے بڑھ گئی۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بمشکل تمام بس اسٹاپ پہنچی۔ بس اسٹاپ پر ایک اور شخص اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

''خون ناحق سو روپے میں معاف نہیں ہوتا۔ جان کی قیمت جان۔ مال کی قیمت مال۔''

''کون ہو۔ کون ہو تم۔ کیا بک رہے ہو۔'' نور کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''ہمارا حصہ بھی نکال کر رکھنا۔ وصول کرلیں گے تجھ سے۔'' اس نے کہا اور تیزی سے سڑک پر چل پڑا۔ سڑک پار کر کے وہ ایک گلی میں داخل ہو کر گم ہو گیا۔

نور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جب آئی تو وہ اس میں چڑھتے ہوئے گرتے گرتے بچی۔ کون تھے یہ دونوں۔ کون تھے۔ دفتر میں اس کی بری حالت تھی۔ ان دونوں پراسرار لوگوں کی شکل اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی اور کانوں میں ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ خون ناحق، حرام کی کمائی جان کی قیمت جان مال کی قیمت مال۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام کرنے لگی مگر اس طرح کہ ہاتھ کانپ رہے تھے دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چور بے شک اپنے اندر ہوتا ہے لیکن یہاں تو صورت حال ہی دوسری تھی۔ اس نے معمول کے مطابق دفتر کے کام شروع کرنے چاہے لیکن ہاتھ اتنے بے جان ہو رہے تھے کہ فائل بھی نہیں اٹھائی جا رہی تھی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ جان کے بدلے جان، مال کے بدلے مال جان کے......

موبائل پر کال آئی تو وہ چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے نمبر دیکھا۔ ان نون نمبر تھا کچھ لمحے دیکھتی رہی پھر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''مس نور۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ ایک قتل میں ملوث ہیں۔ آپ نے قاتل کی بھرپور معاونت کی ہے ان کے خلاف جھوٹی گواہی دے کر اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچایا ہے جس رقم کے عوض آپ نے ایک زندگی کے خاتمے کے لیے عمل کیا ہے۔ آپ کو خوش خبری دی جاتی ہے کہ اسے آپ استعمال نہیں کرسکیں گی۔ کیونکہ ہماری عدالت آپ کے لیے موت کی سزا تجویز کر چکی ہے۔ اپنی گردن پر پھانسی کے پھندے کی گرفت محسوس کریں۔''

''کک۔ کون ہو تم۔ کون ہو۔'' بمشکل نور کے حلق سے آواز نکلی۔

''موت کا نام صرف موت ہوتا ہے۔ ہم سب تمہیں پھانسی کے پھندے تک لانے میں مصروف ہیں۔'' آواز بند ہوگئی اور نور کا دل بند ہونے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ فقیر پھر وہ پراسرار سا آدمی اور اب یہ فون۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہزاروں آنکھیں اسے نفرت سے گھور رہی ہیں۔ بے شمار لوگ اس پر تھوکنے کے لیے تیار ہیں۔ ساری دنیا کو اس کا جرم معلوم ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

بمشکل تمام اس نے لنچ تک کا وقت گزارا۔ پھر اپنا پرس سنبھال کر اٹھ گئی۔ اپنے افسر سے اس نے

طبیعت کی خرابی کا کہہ کر چھٹی لی اور باہر آ گئی۔ پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ کر سو جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بس سے گھر جانے کے بجائے آٹو کر لے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ آٹو سے اتر کر فلیٹ کی طرف جانے کے لیے اس نے قدم ہی اٹھایا تھا کہ ایک پولیس والا دو لیڈی کانسٹیبل اس کی طرف بڑھے اور اس کا دل اچھل پڑا۔

''آپ کا نام نور العین ہے۔'' اے ایس آئی نے پوچھا۔

''جی۔ جی۔'' نور کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہے۔'' اے ایس آئی نے کہا۔ نور کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''کیوں......؟'' اس نے پوچھا۔

''قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں۔''

''مم۔ میرا اس سے کیا واسطہ؟''

''یہ آپ کو تھانے چل کر معلوم ہوگا۔'' افسر نے کہا۔ لیڈی کانسٹیبلوں نے نور کا بازو پکڑ لیا۔ نور تھر تھر کانپنے لگی۔ آج کا دن ہی منحوس تھا۔ صبح سے نحوست کا آغاز ہو گیا تھا۔ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر نور نے خود کو سنبھالا اور لرزتی آواز میں بولی۔

''آخر آپ نے مجھے کیوں پکڑا ہے۔ قتل کی کسی واردات سے میرا کیا تعلق ہے۔''

''آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کو پوچھ گچھ کر کے چھوڑ دیا جائے گا لیکن اگر آپ قتل کی اس واردات میں قاتل کے ساتھ شامل رہی ہیں تو پھر آپ کا اللہ مالک ہے۔ آپ لوگ بھول جاتے ہیں کہ قانون نام کی کوئی چیز بھی ہے۔ پولیس تو مجرم کو قبر سے بھی نکال لاتی ہے۔''

نور نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆

وکیل احمد کو آج کورٹ میں کوئی کام نہیں تھا۔ وہ آفس میں بیٹھے ناصر علی سے گپیں مار رہے تھے کہ فون پر اشارہ موصول ہوا اور انہوں نے اسے آن کر کے کان سے لگا لیا۔

چٹکلے

بیٹا درسی کتب ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا مصیبت ہے۔ یہ ورڈز ورتھ تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔''

والد صاحب نے عینک کے اوپر سے بیٹے کو جھانکا' کچھ دیر ڈکشنری کا مطالعہ کیا اور پھر بولے۔ ''بیٹے۔ مجھ سے ورڈز ورتھ کے معنی پوچھو۔ اس کے معنی ہیں بات کے قابل۔ مثلاً تمہاری امی مجھے اکثر کہتی ہیں کہ۔ ''تم کسی بات کے قابل نہیں۔'' انگریزی میں اس جملے کو یوں لکھیں گے۔ ''یو آر ناٹ اے ورڈز ورتھ۔''

☆

شیخ چلی کا حافظہ بہت کمزور تھا۔ رمضان المبارک میں انہوں نے روزوں کی تعداد یاد رکھنے کے لیے ایک ترکیب ایجاد کی۔ وہ افطار کے بعد کھجور کی ایک گٹھلی ایک گھڑے میں ڈال دیتے یوں ایک روزہ ہو جاتا۔ شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی نے جب اپنے والد کو گھڑے میں گٹھلیاں ڈالتے دیکھا تو وہ بھی اپنی گٹھلیاں اسی گھڑے میں ڈالنے لگی۔

عید کے بعد لوگوں نے شیخ چلی سے پوچھا۔ ''آپ نے کتنے روزے رکھے۔''

شیخ صاحب نے کہا۔ ''الحمدللہ ساٹھ پورے ہوگئے۔''

لوگوں نے کہا۔ ''مہینہ تو انتیس دن کا تھا۔ آپ نے ساٹھ روزے کیسے رکھ لیے۔''

کہنے لگے۔ ''میں نے تو ابھی آدھے بتائے ہیں۔ گھڑے کے حساب سے تو میں نے ایک سو بیس روزے رکھے ہیں۔''

”اندھیرا بول رہا ہے سر۔“

”ہوں۔“

”پورا دن کامیاب گزرا ہے سر۔ وہ آفس سے گھر آئی تو پولیس نے اسے پکڑ لیا اور اب وہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہے۔“

”اور کوئی خاص بات۔“

”نہیں سر۔“

”اوکے۔“ وکیل احمد نے فون بند کیا تو اس پر دوبارہ اشارہ موصول ہوا۔ دوسری طرف ایس پی سجاد حسین تھے۔

”آپ کا شکار نمبر ایک ہیڈ آفس آچکا ہے وکیل صاحب۔ آپ کے اسٹاف نے اسے کامیابی سے بری طرح نروس کر دیا ہے اور وہ سخت بدحواس ہے۔ جرم اس کے چہرے سے جھلک رہا ہے وہ سخت ذہنی اور نفسیاتی دباؤ میں ہے۔ مجھے یقین ہے وہ سب کچھ اگل دے گی۔ آپ آجایئے تاکہ ہم اس سے پوچھ گچھ شروع کریں۔“

”میں آرہا ہوں۔“ وکیل احمد نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد تمام متعلقہ افراد پولیس ہیڈ کوارٹر کے کمرہ خاص میں جمع ہوگئے۔ نور کو جب اس کمرے میں لایا گیا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔

”تمہارا نام نورالعین ہے؟“ پولیس کی وردی میں ملبوس ایک اعلیٰ افسر نے پر رعب لہجے میں پوچھا۔

”جی۔ جی۔“ نور کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”نائلہ کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کے لیے گوہر نے تمہیں کتنی رقم دی تھی؟“ پولیس افسر نے پوچھا اور نور ڈرنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی گر پڑے گی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

”جواب دو۔“ افسر گرجا۔ ”کتنی رقم ملی تھی تمہیں؟“

”نہیں۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا، میرا گوہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ہمیں سب معلوم ہو چکا ہے کس کا کس سے کیا تعلق ہے۔ تم، ستارہ اور گوہر اب پھانسی کے پھندے سے نہیں بچ سکتے۔ تم تینوں قاتل ہو اور تم نے ایک بے گناہ کو موت کے پھندے تک پہنچانے کی سازش کی ہے۔ تم نے قانون کو مذاق سمجھا تھا۔ اب قانون نے تمہاری گردن پکڑ لی ہے۔“

نور زارو قطار رو پڑی۔ ”میں بے قصور ہوں جناب۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”مس نورالعین! آپ کے ساتھ یہ شریفانہ رویہ تھوڑی دیر تک برتا جا رہا ہے اس کے بعد آپ کو الٹا لٹکا دیا جائے گا آپ کی پیٹھ پر اتنے ہنٹر لگائے جائیں گے کہ آپ کی کھال اتر جائے گی اور آپ سب کچھ اگل دیں گی۔ وہ کنڈے دیکھ رہی ہیں وہ اس کام کے لیے ہیں۔“

”میں...... میں......“ نور روتے ہوئے بولی۔

”یہ آپ کا بینک اسٹیٹ منٹ ہے۔ پہلے آپ کے پاس اس تاریخ میں کل ستائیس ہزار دو سو روپے تھے اور صرف ایک ہفتے کے بعد تین لاکھ ستائیس ہزار دو سو روپے جمع ہوگئے۔ یہ تین لاکھ اچانک کہاں سے آگئے جبکہ یہ ستائیس ہزار روپے آپ نے سوا سال میں جمع کیے تھے۔“

نور کی آنکھوں میں اندھیرے چھا رہے تھے۔ پھانسی کے پھندے اس نے فلموں میں دیکھے تھے لیکن اب اسے وہ اپنی گردن میں چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”سب کچھ معلوم ہو چکا ہے مس نور۔ نائلہ کو اس کے شوہر شارب نے نہیں اس کی بہن گوہر نے قتل کیا ہے اور تم نے اور ستارہ نے اس سے بڑی رقم لے کر اس کی معاونت کی ہے۔ قاتل کی مددگار کی سزا بھی موت ہوتی ہے تمہیں یہ دنیا چھوڑنے کے لیے تیاری کرنی ہے۔“

”نہیں۔ نہیں خدا کی قسم نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتیں۔ میری ماں ہے دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ ابو مر چکے ہیں۔ کوئی بھائی نہیں ہے، میں انہیں پال رہی ہوں۔“

”اس کے باوجود تم نے ایک جوان لڑکی کے قتل میں مدد کی۔ ایک قاتل کے حق میں گواہی دی۔ جھوٹی گواہی۔ اس وقت تمہیں اپنی بیوہ ماں اور چھوٹی بہنیں یاد نہیں آئیں؟“

”میں بے قصور ہوں جناب۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ میں نے کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“

”پھر وہی فضول بکواس کر رہی ہو۔ اسے الٹا لٹکانے کی تیاری کی جائے۔“ افسر نے گرج کر کہا اور کچھ ہی منٹ کے بعد دو لیڈی کانسٹیبل اندر آگئیں ان کے ساتھ دو مرد کانسٹیبل بھی آئے جنہوں نے ہاتھوں میں رسا پکڑا ہوا تھا۔ ایک اسٹول رکھ کر کنڈے میں رسا ڈال کر جھولا سا بنا لیا گیا۔

”اس وقت یہ رسا تمہارے دونوں پیروں میں ڈال کر تمہیں الٹا لٹکایا جائے گا اور تمہارے بدن پر یہ دونوں کوڑے ماریں گی لیکن بعد میں ویسا ہی دوسرا رسا تمہارے گردن میں ہوگا اور جب تمہارے پیروں کے نیچے سے تختہ ہٹے گا تو پھانسی کا پھندہ تمہاری گردن میں تنگ ہو جائے گا اور تمہارا دم گھٹ جائے گا۔ تم تھوڑی دیر تک تڑپو گی پھر سرد ہو جاؤ گی۔“ ایک اور افسر نے کہا۔

”صرف تین لاکھ روپے کے لیے تم نے جان دے دی لڑکی۔“ دوسرے افسر نے کہا۔ نور کے پاؤں جواب دے گئے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ تب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے وکیل احمد نے جو یہ پوری گفتگو خاموشی سے سن رہے تھے پہلی بار مداخلت کی۔

”تمہارے زندہ بچ جانے کی ایک ترکیب ہے لڑکی۔ اس طرح تمہاری جان بچ سکتی ہے۔“ نور نے رحم طلب نگاہوں سے اس ہمدرد آواز والے کو دیکھا تو اس نے کہا۔ ”اس طرح کہ تم سچ بول دو۔ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ زندگی اور موت کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہو۔ زندگی صرف تین لاکھ کے لیے دینے کی چیز نہیں ہوتی۔“

نور نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے

مسکرائیے

ہالی ووڈ کے قریب ایک گلی کے کونے پر دو کتوں کی ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“

”میں اپنی دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔“ دوسرے کتے نے جواب دیا۔

”کیسی ہے وہ“ پہلے کتے نے تجسس سے پوچھا۔

”سفید رنگ کی ہے، دو فٹ لمبی ہے، دم چھوٹی ہے، لیڈی کہہ کے آواز دو تو متوجہ ہو جاتی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”اچھا...... اچھا، اس کی پیشانی پہ سیاہ دھبا ہے، اور ذرا لنگڑا کر چلتی ہے۔“ پہلے کتے نے مزید نشانیاں بتائیں۔

”ہاں...... ہاں وہی“ دوسرے نے تائید کی۔

”میں تو خود اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“ پہلا کتا بولا۔

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

”کیا زمانہ آگیا ہے...... ہماری مادائیں بھی ہالی ووڈ کی عورتیں ہوتی جا رہی ہیں۔“

☆

شادی کے چھ ماہ بعد میاں بیوی میں پہلا جھگڑا ہوا۔ غصے سے بے قابو ہو کر شوہر نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا پہلا گھونسا رسید کیا۔

اتفاق سے پادری صاحب وہاں سے گزر رہے تھے انہوں نے کھڑکی سے گھونسا پڑتے دیکھا تو فوراً دوڑے بیچ بچاؤ کے لیے۔

شوہر نے دیکھا کہ پادری صاحب گھر میں آگئے ہیں تو سنبھل کر اس نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا گھونسا نمبر دو رسید کیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

”اب بھی چرچ جانے سے انکار کرو گی۔“

☆☆

حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ تب وکیل احمد نے پھر کہا۔ ”اگر تم سچ سچ سب کچھ بتادو تو قانون تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے قانون کی مدد کرنے والے کو سلطانی گواہ بنا کر اس کی زندگی بچائی جاسکتی ہے۔ چاہو تو سچ بول کر زندگی بچاسکتی۔ سچ تو تم الٹی لٹک کر بھی بولو گی لیکن اچھا تھا کہ موت سے پہلے کا وقت اسپتال میں نہ گزارو۔ یہ لوگ تمہاری کھال اتار کر تمہیں شدید زخمی کردیں گے اور پھر پولیس اسپتال میں داخل کردیں گے جہاں تم سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ دوسری بہتر صورت یہ ہے کہ سلطانی گواہ بن جاؤ اور سب کچھ سچ بتا کر پولیس کی مدد کرو۔ وہ رقم تمہاری ہی رہے گی اسے تم سے نہیں لیا جائے گا اور اس سے تم اپنی ماں اور بہن کی بہت سی ضرورتیں پوری کرسکو گی فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔“

موت کے خوف نے نور کے تمام کس بل نکال دیے۔ وکیل احمد کے اندھیروں نے بہترین تحقیقات کرکے بہت سی معلومات حاصل کرلی تھیں خاص طور سے نور کا بینک اکاؤنٹ اور بیلنس وغیرہ۔ اس کے بعد اس پر شدید ترین نفسیاتی دباؤ ڈالا جارہا تھا۔ یہ وکیل احمد کا مخصوص طریقہ تھا۔ پولیس کے اعلا ترین افسران کو وکیل احمد کے اندھیرے کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ جرم کی اصلیت تلاش کرتے تھے وہ کون تھے کتنے تھے کہاں رہتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا۔

وکیل احمد نے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ نائلہ کو کس طرح زہر دیا گیا اور کس نے دیا نیز یہ کہ زہر کس قسم کا تھا۔ تم لوگ قانون کو عارضی طور پر دھوکا دینے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن عارضی طور پر قانون اتنا کمزور نہیں ہوتا البتہ ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو بہت معمولی سے معاوضے کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ بس مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ آپ لوگ اپنا کام کریں۔“ وکیل احمد نے دونوں لیڈی کانسٹیبلوں سے کہا اور وہ نور کے پاس پہنچ گئیں۔

”اٹھو بی بی۔“ پولیس والیوں نے جھک کر اس کے بازو پکڑے تو وہ دہشت سے چیخ اٹھی۔

”نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔ میں بتاتی ہوں۔ میں بتاتی ہوں۔“

”انہیں کرسی دو۔“ ایس پی سجاد حسین نے کہا۔ نور اپنے آپ اٹھ بھی نہیں سکی تھی۔ اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا گیا اور پھر اس کی زبان کھل گئی۔ وہ لوگ پے در پے اس سے سوالات کرتے رہے اور وہ جواب دیتی اب اس میں کوئی بات چھپانے یا جھوٹ بولنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ سب اس کے بیان سے مطمئن تھے۔ پھر ایس پی سجاد حسین نے کہا۔

”اب تم پولیس کی مددگار بن گئی ہو۔ بے فکر رہو تم محفوظ ہو۔ تمہیں تمہاری زندگی کی حفاظت کے لیے کچھ عرصہ پولیس کی تحویل میں رہنا ہوگا۔ تم بالکل پریشان مت ہونا۔“

”لل۔ لیکن۔ کیا میں جیل میں جاؤں گی۔“

”نہیں۔ تمہیں حفاظت سے رکھا جائے گا۔“

کمرے سے باہر آکر سب ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ ایس پی سجاد حسین نے کہا۔ ”آپ ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ بے گناہ انسانوں کے لیے سرمایہ ہیں وکیل احمد صاحب۔ کمال کی شخصیت ہے آپ کی۔“

”بس دعا کیا کریں کہ آپ کا یہ باقی سرمایہ محفوظ رہے اور کسی کرم فرما کو اس دوسرے پاؤں ہاتھ اور آنکھ کی ضرورت پیش نہ آجائے۔“ وکیل صاحب نے خوش مزاجی سے کہا۔ پھر بولے۔ ”اب شکار نمبر دو کی مزاج پرسی کرنی ہے۔“

☆☆☆

ستارہ معمول کے مطابق آفس سے گھر آئی اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ پھر اس نے چونک کر گھڑی دیکھی آج نور کو بہت دیر ہوگئی۔ اس نے سوچا وقت گزرتا رہا پھر اچانک زور زور سے ڈور بیل بجنے لگی اور وہ چونک پڑی یہ نور نہیں ہوسکتی اس کے پاس تو دروازے کی چابی ہے۔

اس نے دروازہ کھولا اور اچھل پڑی۔ باہر پولیس کھڑی تھی۔ پولیس والے اسے دھکیل کر اندر آگئے۔ ”تم ستارہ ہو؟“ ایک آفیسر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”جی۔ جی۔“ ستارہ سہم گئی۔

”ہم تمہیں نائلہ بیگم زوجہ شارب احمد کے قتل کے جرم میں گرفتار کرتے ہیں۔“ پولیس افسر نے کہا۔

ستارہ سکتے میں رہ گئی۔ بمشکل اس نے کہا ”لیکن اس کیس کا تو فیصلہ ہوچکا ہے۔ اسے اس کے شوہر نے قتل کیا ہے۔“

”اسے آپ نے قتل کیا ہے ستارہ جی۔ چلیے باقی باتیں پولیس ہیڈکوارٹر چل کر ہوں گی۔“

ستارہ کا خوف سے دم نکل گیا۔ یہ کیا ہوا؟ لیکن جو ہوا بھی ٹھیک تھا۔ پولیس اسے لے کر چل پڑی نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے دل میں آرہے تھے۔ آخر کار پولیس ہیڈ کوارٹر میں اسے تفتیشی ٹیم کے سامنے پیش کردیا گیا۔ اس پر شدید وحشت طاری تھی۔

”جی خوب صورت قاتلہ۔ اس سے پہلے اور کتنے قتل کیے ہیں۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔ وکیل احمد بھی موجود تھے اور ناصر علی بھی، لیکن یہ ان کا طریقہ کار تھا کہ سوال پولیس آفیسر کرتے تھے اور وہ صرف ملزم کے چہرے کے تاثرات دیکھتے تھے۔ ستارہ کے چہرے پر خاصی حیرت نہیں بلکہ جرم کا خوف بھی جھلک رہا تھا۔ اس کے اوسان خطا ہورہے تھے۔

”جی ستارہ بیگم۔ تم تینوں نے مل کر بے چاری نائلہ کو قتل کیا اور الزام بے گناہ شارب کے سر تھوپ دیا۔ تمہارے جرم کی قلعی کھل گئی ہے اب صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں گوہر صاحبہ سے اس تعاون کی کیا قیمت ملی۔“

”آپ لوگ مجھے جھوٹے الزام میں پھنسانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں پولیس کے ہتھکنڈے خوب سمجھتی ہوں لیکن میں آپ کے جال میں نہیں پھنسوں گی۔“

”آپ جال میں پوری طرح پھنس چکی ہیں میڈم۔ ذرا اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے پھانسی کا پھندا آپ کی گردن تک پہنچ چکا ہے۔“ سجاد حسین نے کہا اور ستارہ کا ہاتھ بے اختیار گردن ٹٹولنے لگا۔ پھر اسے احساس ہوا تو اس نے جلدی سے گردن سے ہاتھ ہٹالیا۔

”میں نے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔“ پولیس آفیسر وکیل احمد کے تیار کیے ہوئے سوالات اس سے کرتے رہے۔ ستارہ نور کے مقابلے میں کافی مطمئن ثابت ہورہی تھی۔ وہ مسلسل انکار کیے جارہی تھی لیکن مقابلے پر وکیل احمد تھے۔ انہوں نے ایسے چبھتے ہوئے سوالات تیار کیے تھے کہ تفتیشی ٹیم بھی عش عش کراٹھی۔ سب سے آخر میں ستارہ کو نورالعین کے اعترافات کے ٹیپ سنائے گئے تو وہ چکرا کر بے سدھ ہوگئی۔ اسے یوں لگا جیسے جو کچھ اس نے کیا ہے اس کی فلم اس کے سامنے چل رہی ہے تب اس نے ہتھیار ڈال دیے اور اس کے بیان نے گوہر کی موت کا پروانہ جاری کردیا۔

☆☆☆

وکیل احمد کے ہاتھوں کی پہنچ آخر کار ارب پتی باپ کی بیٹی گوہر کی گردن تک ہوگئی۔ وہ اس کیس پر بھرپور طریقے سے کام کررہے تھے لیکن مزے کی بات تھی کہ ابھی تک انہوں نے شمشاد کے لاکھ پوچھنے کے باوجود اپنا کوئی معاوضہ نہیں بتایا تھا۔ بلکہ کہا تھا کہ جب شارب بری ہوکر آجائے تو وہ لوگ جو مناسب سمجھیں دے دیں۔

ادھر گوہر بھی خاموش نہیں بیٹھی تھی۔ اسے اس دن کا انتظار تھا جس دن شارب کی پھانسی کی خبر اخباروں میں چھپے گی۔ شارب نے اس کے پندار کو شکست دی تھی اور اس آگ میں اس نے اپنی اکلوتی بہن کو خاکستر کردیا تھا۔ پھر شارب ابھی تک کیوں زندہ ہے۔ اسے علم تھا کہ کوئی اور وکیل شارب کی اپیل کی تیاری کررہا ہے۔ یہ بات اسے اس کے وکیل نے بتائی تھی۔ لیکن انہوں نے گوہر اس خطرناک وکیل کے بارے میں نہیں بتایا تھا جو ماحول کو ہی بدل دیا کرتا تھا۔

آج گوہر کا دل صبح ہی سے گھبرا رہا تھا۔ رات کو اس نے برا انوکھا خواب دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا

کہ اس کی چھوٹی بہن نائلہ ایک پنگورے سے لیٹی ہوئی ہے اور حسن علی غوری اس پنگورے کو ہلکورے دے رہے وہ خود سامنے پہنچی تو غوری صاحب نے نفرت سے اسے دیکھا اور کھڑے ہو کر ایک پردہ کھینچ دیا۔ جو اس کے اور ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ صبح جاگی تو طبیعت بری طرح نڈھال تھی۔

وقت اس طرح گزرتا رہا۔ سارا دن بخار جیسی کیفیت طاری رہی۔ شام ہوئی پھر اندھیرا چھانے لگا۔ اچانک اسے ستارہ اور نور کا خیال آیا کم بختیں عیش کر رہی ہیں یہ بھی نہیں کہ خبر لے لیں۔ اس نے انہیں فون کیے لیکن دونوں کے نمبر بند تھے۔ نہ جانے کیوں اس بات پر بھی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اسے ان پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

آخری بار اس نے ستارہ کو فون کیا۔ اسی وقت اس کے چوکیدار نے آ کر کہا۔ ”بیگم جی۔ پولیس آئی ہے۔“

”پولیس؟“ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”بٹھاؤ انہیں۔ میں آ رہی ہوں۔“ اس نے کہا پھر اپنا حلیہ ٹھیک کرنے لگی۔ شاید اپیل کے سلسلے میں اس سے کوئی بات کرنی ہو۔ اس نے سوچا کچھ دیر کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ چار پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے ان کے ساتھ دو لیڈی کانسٹیبل بھی تھیں۔

”فرمایئے؟“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

”محترمہ گوہر حسن علی۔ آپ کو اپنی چھوٹی بہن نائلہ شارب احمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“ ایس پی سجاد حسین نے خشک لہجے میں کہا اور گوہر کو شدید جھٹکا لگا تاہم سخت عورت تھی۔ کرخت لہجے میں بولے۔

”آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں۔“

”گڈ۔ ہاں مجھے اندازہ ہے۔ آپ نے اسے اپنے ہاتھوں سے زہر دے کر ہلاک کیا اور قتل کا الزام اس کے معصوم شوہر پر لگا دیا۔“

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ وہ میری سگی بہن تھی۔“

”یہ آپ کی سنگ دلی ہے۔ آپ نے جوش رقابت میں اپنی بہن کو بھی نہ چھوڑا۔ چلو ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔“ ایس پی صاحب نے لیڈی کانسٹیبل سے کہا اور جب گوہر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ گئیں تو اسے پہلی بار سنگین صورت حال کا احساس ہوا پھر اس پر دوسرے انکشافات ہوئے جن میں ستارہ اور نور کے اعترافات بھی تھے اور اس کی آنکھوں میں تاریکی پھیل گئی۔ اب پہلی بار اس کے دل میں موت کے خوف نے سر ابھارا تھا۔

☆☆☆

وکیل احمد نے سارا کیس مکمل کر لیا۔ ایس پی سجاد حسین بے حد خوش تھے وہ ایک مظلوم، سزائے موت کے قیدی کی زندگی بچانے جا رہے تھے۔ ان واقعات سے متعلق تمام کرداروں کو کمرہ عدالت میں پہنچانے کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔

چنانچہ کمرہ عدالت میں عالیہ، شمشاد علی، گوہر، ستارہ اور نور بھی موجود تھے۔ وکیل استغاثہ نے بیساکھی کی کھٹ کھٹ پر چونک کر دیکھا تھا پھر رخ بدل لیا تھا۔ وکیل احمد ہر اس وکیل کے رقیب تھے جس کا ان سے واسطہ پڑتا ہوتا تھا۔ اسے وکیل احمد کا سامنا کرتے ہوئے دانتوں پسینہ آ جاتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جج صاحب کمرہ عدالت میں داخل ہوئے اور حاضرین کھڑے ہو گئے۔ جج صاحب نے بیٹھ کر ایک سرسری نگاہ کمرے میں موجود لوگوں پر ڈالی اور وکیل احمد کو دیکھ کر مسکرا کر گردن خم کی۔ یہ حقیقت تھی کہ وکیل احمد جس کیس کو ہاتھ میں لیتے تھے وہ بڑی دلچسپ حیثیت کا حامل ہوتا تھا اور جج بھی بہت محتاط ہو جاتے تھے۔ یہ سادی سی فطرت کا وکیل وہی کیس ہاتھ میں لیتا تھا جس کا کچھ ہی وقت میں تیا پانچہ ہونے والا ہوتا تھا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ بعض اوقات وکیل احمد کی صورت دیکھ کر جج صاحبان نئے انداز میں سوچنے لگتے تھے۔

پھر جج صاحب نے عدالت کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اجازت ملنے پر وکیل احمد نے

کھڑے ہو کر کہا۔ ”جناب والا۔ مجھے خوشی ہے کہ مولائے دو جہاں نے مجھے ایک بار پھر ایک ایسے شخص کے مقدمے کی پیروی کرنے کی سعادت بخشی جس پر قتل کا جھوٹا الزام لگا کر ایک مکروہ سازش کا نشانہ بنایا گیا۔ نفس انسانی اپنی مختصر ترین زندگی کے لیے کیسی کیسی شرانگیزاں کرتا ہے۔ میں ایسی ہی ایک داستان پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

وکیل احمد نے وہ پوری کہانی ضروری نکات کے ساتھ جج صاحب کے سامنے پیش کر دی جو انہیں عالیہ اور شمشاد سے معلوم ہوئی تھی اور جس پر انہوں نے ورک کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

”ان تمام حقائق سے روشناس ہو کر میں نے اپنے طریقہ سے کام شروع کیا اور باری باری ان تین خواتین سے بھی ملاقات کی جو اس پورے ڈرامے کی مرکزی کردار ہیں۔ میں نے مظلوم شارب سے بھی ملاقات کی اور مجھ پر حقیقتیں منکشف ہوتی گئیں۔ محترم جج صاحب! حسن علی غوری مرحوم بے حد شریف النفس انسان تھے لیکن ان کی دونوں بیٹیاں الگ الگ مزاج کی حامل۔ شارب ایک غریب نوجوان ہے لیکن باصلاحیت اور پرعزم اسے حسن علی کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دولت اس کے قدموں میں آ پڑی لیکن اس نے اس کی طرف رخ بھی نہیں کیا اور خود اپنی کمائی پر انحصار کیا۔

اب میں ان حقائق کی طرف آتا ہوں جو اس قتل کی بنیاد بنے۔ گوہر غوری اور نائلہ دونوں شارب کو چاہنے لگی تھیں لیکن شارب نائلہ کو پسند کرتا تھا۔ شارب کی جانب سے مسترد کیے جانے کے بعد گوہر کے دل میں شارب کے لیے سخت نفرت پیدا ہو گئی اور وہ دونوں کی جان کی دشمن بن گئی۔

شارب اور نائلہ کی شادی ہو گئی۔ ان دونوں کو خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھ کر گوہر کانٹوں کے بستر پر لوٹتی تھی ان کی خوشیاں اسے اپنی آرزوؤں کے خون میں ڈوبی نظر آتی تھیں۔ نفرت کی یہ آگ گوہر کو جھلسائے دے رہی تھی اور وہ ہر قیمت پر ان دونوں کو

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

برباد کردینا چاہتی تھی۔ اس کی یہ آگ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس کی بھی شادی ہوئی جو اس کی تند مزاجی کی وجہ سے تھوڑے دن سے زیادہ نہیں چل سکی اور وہ طلاق لے کر گھر واپس آ گئی۔ جب بھی نائلہ اور شارب اس سے ملنے جاتے وہ انہیں دیکھ کر خونی ہوجاتی تھی۔ وہ دن رات ان دونوں کے لیے سوچتی رہتی تھی کہ ایسا کیا عمل کرے کہ ان دونوں کو شدید نقصان پہنچے۔

پھر اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آیا۔ ایک ایسا شیطانی منصوبہ جو ان دونوں کو فنا کر دینے کے لیے تھا۔ وہ ان دونوں کی ٹوہ میں رہتی تھی۔ اس کی تھوڑی سی شناسائی نور سے تھی ایک بار کسی سلسلے میں گوہر نور کے فلیٹ پر گئی وہاں اس کی ملاقات ستارہ سے ہوئی جس کے بارے میں اسے پتا چلا کہ وہ شارب کے آفس میں ہی کام کرتی ہے گوہر کو اندازہ ہوگیا کہ ستارہ نوجوان اور پرکشش ہے۔ ستارہ طلاق یافتہ تھی۔ گوہر کو وہ اپنے کام کی محسوس ہوئی اور اس نے ستارہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی اور پھر اس کو تحائف دینے شروع کر دیے جب ستارہ اس کی گہری دوست بن گئی تو اس نے پورا منصوبہ ستارہ کو پیش کر دیا اور اسے پانچ لاکھ روپے نقد پیش کیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نور کو بھی اس کھیل میں شریک کر کے اسے بھی تین لاکھ دیے اس طرح ان تینوں نے مل کر ان معصوم میاں بیوی کے گرد جال بچھا دیا اور لحہ لحہ کامیابی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس نے ستارہ کو اپنا سارا منصوبہ بتا دیا اور کہہ دیا کہ وہ ان دونوں کو اپنی توہین کی بدترین سزا دینا چاہتی ہے۔ اس نے نائلہ کے قتل کے بارے میں بھی بتا دیا۔ ستارہ خوف زدہ ہوگئی لیکن اسے ایک امیر عورت کی دوستی بھی عزیز تھی جو اس کی ہر طرح مالی مدد کے لیے تیار تھی۔ وہ اس کے جرم میں پوری طرح شریک ہوگئی جبکہ نور کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ قتل کے کسی منصوبے پر کام کر رہی ہیں۔ گوہر کو ایک ایسے زہر کی فراہمی بھی ستارہ ہی کے ذریعہ ہوئی تھی جو سسٹم پر فوری اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اسے اثر کرنے میں چند گھنٹے لگتے ہیں۔ پھر وہ ہمدردی اور محبت کی کہانی لے کر نائلہ کے پاس پہنچ گئی۔ نائلہ نے معصومیت سے زہریلی ناگن کو گلے لگا لیا۔ اس نے گوہر کے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور گوہر نے اس سے کچھ کھانے کی فرمائش کر دی اور جب نائلہ یہ چیزیں لینے گئی تو اس نے نائلہ کی چائے میں زہر ڈال دیا اور مظلوم نائلہ بہن کی نفرت کا شکار ہوگئی۔

اپنی بہن کو ختم کرنے پر ہی گوہر کا دل نہیں بھرا۔ اس کے بعد شارب کی باری تھی چنانچہ اس نے ستارہ کی مدد سے شارب کو اپنی بہن کا قاتل قرار دیا اور قبر کشائی سے زہر خورانی سے موت کی تصدیق ہوگئی۔

نور کو البتہ یہ بات معلوم نہیں تھی کہ نائلہ کو قتل کر دیا جائے گا۔ وہ بے حد پریشان تھی۔

جناب عالی! اپیل کا یہ کیس میرے پاس آیا اور میں نے جان لیا کہ اصل قاتل شارب نہیں ہے۔ تھوڑے سے نفسیاتی طریقوں سے اصل صورت حال سامنے آ گئی۔ ستارہ اور نور نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے اور گوہر غوری کے جرم کی گھناؤنی تفصیل سامنے آ گئی ہے۔ نور کو سلطانی گواہ بنانے کی سفارش کرتا ہوں۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔"

تین ہی پیشیاں ہوئیں اور عدالت نے شارب کو نائلہ کے قتل کے الزام سے بری کر دیا۔ نائلہ کے قتل کے مقدمے کی ازسرنو سماعت شروع ہوئی اور آخر کار عدالت نے گوہر کو نائلہ کے قتل کی مجرم اور ستارہ کو اس کا شریک جرم قرار دے کر گوہر کو عمر قید کی سزا اور ستارہ کو دس سال قید با مشقت سنا دی۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن شارب کی دنیا تاریک ہوگئی۔ اس نے نائلہ کا گھر چھوڑ دیا اور واپس ماں باپ کے پاس آ گیا جن بے چاروں کو کوئی علم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا قبر سے نکل کر واپس آ گیا ہے۔ البتہ انہیں ایک حادثے میں نائلہ کی موت کی کہانی سنا دی گئی تھی۔

☆☆